

# خدا اور محبت



ہاشم ندیم

# خُدا اور محبت

ہاشم ندیم



## دُعا پبلی کیشنز

اتحاد اسلام آباد بازار وچ فون 042-37233585  
E-mail: duaublications@yahoo.com

**نوٹ:**

اس ناول کے جملہ حقوق بحق مصنف (ہاشم ندیم) اور پبلشرز (دُعا پبلی کیشنز) محفوظ ہیں۔ ادارہ دُعا پبلی کیشنز نے اُردو زبان اور ادب کی ترویج کیلئے اس کتاب کو [kitaabghar.com](http://kitaabghar.com) پر شائع کرنے کی خصوصی اجازت دی ہے، جس کے لئے ہم انکے بے حد ممنون ہیں۔

## جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

خدا اور محبت	نام کتاب
ہاشم ندیم	مصنف
زاہد شیخ	ناشر
ڈی جی پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور	مطبع
اشتیاق اے مشاق پرنٹرز، لاہور	سن اشاعت
نومبر 2010ء	قیمت
500/- روپے	

... ملے کے چ...

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور

فون 7352332-7232336

اشرف بک انجینی	کتاب گھر
اقبال روڈ، کینٹی چوک، راولپنڈی	اقبال روڈ، کینٹی چوک، راولپنڈی
ویکم بک پورٹ	خرید علم و ادب
اردو بازار، کراچی	الکریما مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

## انتساب!

دُنیا کے ہر محبت کرنے والے .... اور  
دُنیا کی ہر محبت کے نام

## کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

- ۱۔ <http://kitaabghar.com> کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔
- ۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کپیاں (ان بچے قابل) موجود ہیں تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔
- ۳۔ کتاب گھر پر لگنے والے اشتہارات کے ذریعے ہمارے پائرسز کو نوٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

## فہرست

9	☆	نثر لفظ..... ہاشم ندیم
10	☆	عکسے بکھوینے والی کہانی .... عطاء الحق قاسمی
11	☆	WELDONE HASHIM NADEEM.... بریکیڈ میزڈ والفقار علی
12	☆	”خدا اور محبت“۔۔۔ ایک لازوال فنی تخلیق... ایس ایم طاہر
13	☆	باب 1: پہلی بارش
17	☆	باب 2: پھر وہی شام
20	☆	باب 3: محبت.... نیلا موسم
24	☆	باب 4: پھر وہی محبت
30	☆	باب 5: لندن آؤ اس ہے
38	☆	باب 6: ایمان
46	☆	باب 7: یہودی
52	☆	باب 8: گھائل
63	☆	باب 9: پہلی کلاس
68	☆	باب 10: زیرِ طعن
61	☆	باب 11: زرد لندن
87	☆	باب 12: محبت کی دو پہر
93	☆	باب 13: یادیں
97	☆	باب 14: محبت ناقص
107	☆	باب 15: نیند
112	☆	باب 16: خدا اور محبت

## فہرست

122	☆ باب 17: محبت کے تین پیر
127	☆ باب 18: محبت اور خدا
136	☆ باب 19: ہالوکاسٹ
140	☆ باب 20: سنگ دل
146	☆ باب 21: ٹرم پیچہ
150	☆ باب 22: پکڑی نظر
159	☆ باب 23: جیوری کا فیصلہ
164	☆ باب 24: بے خودی
178	☆ باب 25: چادگر
182	☆ باب 26: دشمن خدا کی
192	☆ باب 27: یہودی بستی
196	☆ باب 28: وہ ایک ملاقات
231	☆ باب 29: یادوں کی بارات
235	☆ باب 30: خوف
239	☆ باب 31: گر پڑ محبت
253	☆ باب 32: پہلی بازی
267	☆ باب 33: نوجوان انقلاب
273	☆ باب 34: چلتے چلتے
287	☆ باب 35: الوداع
293	☆ باب 36: تجھ پر ایمان
300	☆ باب 37: کبھی الوداع نہ کہتا

## پیش لفظ

کچھ میں نہیں آتا کہ لوگ محبت کو آپ جتنی کیوں کہتے ہیں۔ محبت تو جگ جتنی ہے۔ دنیا کا وہ کون سا فرد ہے جو اس تجربے سے نہیں گزرا ہوگا؟ شرط صرف تسلیم کرنے کے سچ یا انکار کرنے کی منافقت کی ہے۔ میں نے محبت اور مذہب کو جس طرح خود پر دار دھوتا محسوس کیا، اسے ان صفحات پر لفظوں کی صورت میں بکھیر دیا۔ محبت اور مذہب کی جنگ تو میرے دل نے لڑی اور میری روح نے جیتی ہے، لیکن جیت مذہب کی ہوئی یا محبت کی۔۔۔۔ اس کا فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔ مقصد محبت یا مذہب میں سے کسی بھی ایک کی برتری ثابت کرنا کبھی نہیں رہا۔ بس کچھ سوال جواب چاہتے تھے۔ لیکن مذہب اور محبت کی اس بکھراؤ میں کچھ نئے سوال جنم لینے نظر آ رہے ہیں۔ سو میری گزارش ہے کہ اس کتاب کو صرف وہی لوگ پڑھیں جو زندگی میں نئے سوالوں کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ جواب الودہ فرض نہیں ہے۔

ہاشم عظیم

☆=====☆=====☆

## من و سلویٰ

دور ماضی کے مقبول ترین مصنف **عمیرہ احمد** کا بہت خوبصورت اور طویل ناول "من و سلویٰ" جس کا بنیادی موضوع رزق حلال ہے۔ من و سلویٰ جو بنی اسرائیل کے لیے آسمان سے اتارا گیا اور رزق حلال جو اُمت محمدیؐ کے لیے عطا کیا گیا، لیکن نہ بنی اسرائیل من و سلویٰ سے مطمئن تھی اور نہ ہم رزق حلال پر قانع۔ انہیں انواع و اقسام کے زمینی کھانوں کی طلب تھی اور ہمیں کم وقت میں زیادہ کمی۔۔۔ رزق حلال کے موضوع پر لکھا گیا یہ ناول کتاب گھر کے معاشرتی ناول نگار شبنم دستیاپ ہے۔

## تکے بھگودینے والی کہانی

کوئٹہ میں میرے پاس خرافات کے کافی لحاظ تھے سو میں نے اگرچہ بے دلی سے گرنا دل پڑھنا شروع کیا اور پھر میں ایک عجیب طرح کی اُداسی کا شکار ہوتا چلا گیا۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ ناول کے مطالعے کے دوران میں دوسرے دور پڑا۔ ناول کی کہانی بظاہر افسانوی سی ہے لیکن یہ ناول کلاسیکی انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس میں زبان و بیان کے کوئی کرتب بھی نہیں دکھائے گئے مگر کہانی پر مصنف کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ ناول میں اس کے متوازی جو ایک کہانی لندن کے پس منظر میں چل رہی ہے، میں نے تجسس کی وجہ سے وہ ابواب چھوڑ دیئے۔ یہی سلوک میں نے ”رہبر گدھ“ کے ساتھ بھی کیا تھا۔ ناول میں ہیرو کی محبت کی تجسس اس کے قاری کو بھی پکھلا کر رکھ دیتی ہے اور یہی فن کی معراج ہے کہ مصنف قاری کو اپنے ساتھ بہا کر لے جائے۔ ہاشم عیدم نے ناول میں کردار نگاری بھی بہت کمال کی کی ہے چنانچہ مولوی صاحب، ایمان، عبداللہ اور بعض دوسرے کردار، جیتے جاگتے ہمارے سامنے آن کھڑے ہوتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے اتنی شدید محبت کی کہانی میں نے شاید اس سے پہلے کبھی نہیں پڑھی۔ یہ تکے بھگودینے والی کہانی ہے۔ بلوچستان کا یہ نوجوان بہت سے لکھاریوں پر بازی لے گیا ہے۔

عطاء الحق قاسمی

## شہرِ تمنا

خواتین کی پسندیدہ مصنفہ **سائرہ عارف** کا بہت خوبصورت اور اچھوتا اندازِ قریہ زندگی کے تمام رنگوں سے سجا۔ دیکھوں گے کہ نکراں اور خوشیوں کے گھلاسنوں سے آباد۔ ایک دلچسپ اور طویل ناول **شہرِ تمنا**۔ کتاب گھر کے رومانی معاشرتی ناول یکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔



## WELDONE HASHIM NADEEM

مجھے ناول جیسی تصانیف اور وہ بھی اردو میں پڑھنا بھی پسند نہیں رہا مگر جب بادل نغمہ اسٹیم میں نے اس کو پڑھنا شروع کیا تو دو دن میں ختم کر کے ہی دم لیا۔ میں نے اسے اپنے ارد گرد بکھری ہوئی کہانیوں کے چیتے چاہتے چاہتے کرداروں کی منہ بولتی تصویر پایا۔ اس میں بیک وقت چلتی دو کہانیاں جو اپنے اندر خود ایک بالوکاسٹ ہیں اور کہانی کے ساتھ ساتھ بہت ساری انمول باتیں قاری کو اپنے غلسم سے آزاد نہیں ہونے دیتی۔ میں چونکہ کونستہ اور یہودیت کی گرفت میں مضبوطی سے جکڑے ہوئے مغربی معاشرے سے خوب واقفیت رکھتا ہوں اس لئے مجھے یہ ناول سے زیادہ حقیقت لگا۔ مذہب اور محبت میں تضاد ہم نے بنا رکھا ہے حالانکہ مذہب خود محبت کا دوسرا نام ہے اور مذہب سے محبت نکال دیں تو یہ صرف چنگیزیت رہ جائے۔ ”معاشرہ کیا کہے گا“ نے معاشرے کا ستیا اس کر کے رکھا ہوا ہے اور یہ مشرق و مغرب میں یکساں نافذ العمل ہے۔ حالانکہ کبھی معاشرہ سب کچھ اندر سوائے ہوئے ہے۔ مگر ہمارے اندر کا ڈرا اور بزدلی بہت سارے انسانوں کی زندگیوں تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ محبت سے عاری معاشرے ہمیشہ بالوکاسٹ اور Extremism کو ختم دیتے ہیں جو کہ ایک جاہل عمل ہے۔ اور محبت زندگی ان ان تضادات کو صرف وہی انسان اس خوبصورتی سے لکھ سکتا ہے جو خود اس میں سے گزرا ہو ہاشم ندیم نے یہ عمل بہت ہی خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے اور مجھے یقین ہو گیا کہ اس میں آپ جتنی کا کافی واضح عمل دخل نظر آ رہا ہے۔ بہر حال یہ ہاشم ندیم کی ایک بہترین کاوش ہے جو انتہائی قابل تحسین ہے۔

ہاشم ندیم  
رئیس دفتر نذر اللغات علی

جوائنٹ سیکرٹری

نیشنل سول ایوارڈز کمیٹی۔ جی (ملٹری ونگ)

کابینہ ڈویژن، اسلام آباد

## ”خدا اور محبت“۔۔۔ ایک لازوال فنی تخلیق

ہاشم ندیم کے مشہور ناول ”خدا اور محبت“ کو چند سال پہلے پڑھا تو اس کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ نہ لگا سکا۔ بس ایک عجیب طرح کی پاشنی تھی جو دلوں محفوظ کرتی رہی۔ دوسری بار جب اس اردو سے سے مطالعہ کیا کہ اس شاہکار کے بارے میں اپنی رائے تحریر کروں تو ناول کی وسعت اور گہرائی کا صحیح اندازہ ہو سکا۔ سمجھ جاتے کہ دلوں کا جہر مٹ اور دلکش واقعات جاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ ایک طرف خدا کی محبت کا ٹھاٹھیں بارتا ہوا سمندر اور دوسری طرف محبت کے وہ عظیم ہڈ بات جو کالم سلج کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن کر صرف خدا کی رحمت کے طلبگار نظر آتے ہیں۔ ناول نگار نے نہایت کامیابی سے یہ ثابت کیا ہے کہ خدا محبت ہے اور محبت ہی فرض محبت ہے خدا تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے۔ ناول کے مطالعہ کے دوران کئی بار ایسی کیفیت سے واسطہ پڑا جب انسان کلمہ الٰہی دُنیا سے رشتہ اور تعلق منقطع ہو جاتا ہے اور وہ ایسی حسین دُنیا میں گردش کرنے لگتا ہے۔ جہاں محبت کو انسانیت کی معراج کہا جاسکتا ہے۔

”خدا اور محبت“ شروع سے آخر تک ایک سفر ہے۔۔۔ باہر سے اندر کا سفر اور ظاہر سے باطن تک کا سفر۔ ناول پڑھتے ہوئے قاری خود کو بھی اس سفر میں شریک محسوس کرتا ہے۔ مصنف نے عشق مجازی اور عشق حقیقی کے بارے میں فلسفیانہ خیالات کا اظہار اس خوبصورتی اور مہارت سے کیا ہے کہ ناول کا مرکزی خیال اور مقصد جھجھ نہیں ہوتے۔ قاری خود کو ایک ایسے دور سے پر موجود پاتا ہے جہاں انسان اور خدا کے درمیان فاصلہ مٹ کر ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتا ہے۔ وہ خود کو ایک ایسے ماحول میں محسوس کرتا ہے جہاں وہ دونوں ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ ایک اور خوبی جو اس ناول کو دوسرے تخلیقی پاروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ہے محبت اور مذہب کی جنگ۔۔۔ اور بلاخرہ محبت اس عظیم مقام پر فائز نظر آتی ہے جو اس کا حق ہے۔

اسلوب بیان پر بات کرتے ہوئے میں یہ کھوں گا کہ مصنف نے ستر میں شاعری کی ہے۔ جگہ جگہ ایسے جملے ملتے ہیں جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ جہاں پلاٹ کی پختگی ہے وہیں زندہ کردار ناول کی کہانی میں طرح طرح کے رنگ بھرتے ہیں۔ حماد ایمان، مولوی صاحب شاکر عبد اللہ جیسے کردار تخلیق کرتا ہاشم ندیم صاحب کا ہی کمال ہے۔ یہ وہ کردار ہیں جو معمولی واقعات سے متاثر ہو کر بحر پور تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔

اس ناول کی ایک آفاق حیثیت بھی ہے بہت سے بین الاقوامی مسائل، جن میں بین المذاہب المذاہب بھی شامل ہیں۔ ان پر نہایت دلگلی بحث کی گئی ہے یہ کام دینی ادیب کر سکتا ہے جو حق کا حلاشی ہو اور دوسروں کو بھی چٹائی کا راستہ دکھائے۔ ایسے موضوعات پر لکھنے کے لئے نہ صرف جرات قلندرانی ضرورت ہے بلکہ فنکارانہ چابکدستی بھی درکار ہے تاکہ ناول کا اپنا حسن برقرار رہے۔

ہاشم ندیم کا ناول ”خدا اور محبت“ ایک لازوال فنی تخلیق ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گا بالکل اسی طرح جیسے دلائل محبت اور خدا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کے نقوش مزید گہرے ہوتے رہیں گے۔ بے شک یہ ناول اردو ادب میں ایک بیٹھن بہا اضافہ ہے۔

ایس ایم طاہر

اسلام آباد مورخہ ۲ جولائی ۲۰۱۰

## پہلی بارش

وہ شاید ہوائی جہاز کے چہروں کی دن دسے سے رگڑ کھانے کی آواز تھی جس سے میری ہلکی نیند ٹوٹ گئی تھی۔ جہاز لندن کے مختصر و اکرپورٹ پر لینڈ کر چکا تھا اور اب دھیرے دھیرے دن دسے پر چلا ہوا پارکنگ ایریا کی جانب بڑھ رہا تھا ایئر ہوسٹس کے اعلان کے مطابق لندن کا مقامی وقت صبح چھ بجے کا تھا۔

لندن شہر ایک مسلگ جھیسے سے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا رات بھر بارش ہوتی رہی ہے، ہلکی ہلکی سی ٹھنڈا راب بھی میری سیٹ کی دیوار سکریں پر ارتعاش بکھیر رہی تھی، یہ بارشیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں، کبھی تو ساری عمر بھی موسلا دھار برسی رہیں جب بھی انسان کا اندر بھگو نہیں پاتیں۔۔۔ اور کبھی کسی کے سن کو ہر لمحہ جل قفل کیسے رکھتی ہیں، لیکن ہا ہر والوں کو اس کی خبر بھی نہیں ہو پاتی۔۔۔۔۔ لندن کی یہ پہلی بارش بھی کچھ ایسی ہی تھی جس نے میرے وجود کو تھکا ہوا سے بھگودیا لیکن میرے اندر کی جیاس اب بھی میرے حلق میں کانٹے چھو رہی تھی۔

جہاز اپنے مختصر و پارکنگ اسٹینڈ پر لگی ٹوب سے جڑ چکا تھا اور مسافر جمائیاں لیتے ہوئے ایک ایک کر کے ٹوب کے ذریعے ٹرمینل پر اتر رہے تھے۔ جب تک ٹیس لاؤنچ میں پہنچتا تب تک آفت سے صبح کی ہلکی سی سفیدی جھانکنے لگی تھی، لیکن کالے گیسے بادلوں اور مسلسل ہوند ہانڈی کی وجہ سے لاؤنچ کی شیشے کی دیوار کے باہر اب بھی کسی اور اس شام کا سا زردی مائل دھواں اندھیرا باقی تھا۔

میں احمد امجد، پاکستان کے معروف تاجر خاندان کا تھم و چراغ کہ جس کے آباؤ اجداد پاکستان بننے سے پہلے اور پاکستان بننے کے بعد بھی، انتہائی اہم حکومتی عہدوں پر فائز رہ چکے تھے۔ تجارت جس کے گھر کی باندی ہے اور ملک کے اہم سرکاری حوال جس کے گھر شام کی چائے پر طلب کیا جانا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ وہ احمد امجد آج لندن کی اس پھلکی میج میں تھا اور اس مختصر و اکرپورٹ کے آؤ لاؤنچ میں کھڑا تھا، کہنے کو تو میری لندن آمد کا مقصد یہاں کی مشہور سنگٹن (Kingstone) یونیورسٹی کے شعبہٴ مساحیات سے اعلیٰ تعلیم کی دوسرا ڈگری لینا تھا، لیکن میں خود جاتا تھا کہ یہ صرف ایک بہانہ تھا، خود اپنی ذات سے فرار و صوط نے کا ایک بہانہ۔ میں خود کو اس شہر کی گہما گہمی میں اس قدر مٹوٹ کر دینا چاہتا تھا کہ مجھے ہلے بھر بھی خود اپنے آپ کے ساتھ تنہا گزارنے کا موقع مل پائے۔ میری ذاتی حالت ایسی تھی کہ میں دوسروں کے ناگوار وجود کو کبھی جھیلنے کے لیے تیار تھا لیکن خود اپنا سامنا لے بھر کبھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ انسان بھی کتنا مجبور اور لاچار ہے۔ ہا ہر اس پاس گلے کبھی آ کھینے پھوڑ بھی ڈالے جب بھی اپنے اندر گئے آئینے کا سامنا ہر دم لازمی ہوتا ہے۔

جب تک میں کسٹم اور دیگر معمول کی کارروائی سے فارغ ہو کر ٹرمینل سے باہر پہنچا تب تک باہر کی ٹھنک ہوا میں برف کے اکاؤ کا ستارہ سما کالے شامل ہو چکے تھے۔ کھلی فضا میں پہلا قدم رکھتے ہی سردی کی ایک شدید لہر نے میرے سارے وجود کو جھجھکا دیا۔ بے اختیار میرے ہاتھ میرے اور کوٹ کے کالری طرف بڑھ گئے اور میں نے خود کو اچھی طرح سے ڈھانپ لیا۔ سردی چاہے جتنی بھی شدید کیوں نہ ہو، اس کی پہلی لہر آپ

کے اندر تازگی کا ایک احساس ضرور بیدار کر دیتی ہے۔ اس شہرے نوآ کے پہلے جھونکے نے میرے اندر بھی تمام احساسات کو جگا سا دیا تھا۔ منیس نے اپنے بچپن کے لنگوچے دوست کامران کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن میری توقع کے مطابق اس کا دور دور تک کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ پہلے تو قہقہے میں آیا مگر سامنے پارکنگ اسٹینڈ میں کمزری ٹیکسی نے کر خود ہی اس کے ٹھکانے پر پہنچی جاؤں۔ میں لندن پہلے بھی کئی مرتبہ آ چکا تھا اور اس شہر کے درود پوچھو میرے لیے کبھی انجینی نہیں رہے تھے۔ لیکن بھر جانے کیا سوچ کر میں انٹر پورٹ ٹرمینل سے اپنا اکلوتا سوٹ کیس گھسیٹا، دور خشک گھاس کے ایک بوے سے ویران قلعے کی طرف بڑھ گیا، جہاں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر لگائے گئے کمزری کے خوبصورت چھتوں کی ایک قطاری موجود تھی۔ میں نے یہیں بڑھ کر کامران کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ہوا میں برف کے کالوں کی آمیزش بڑھ رہی تھی اور جب تک میں اپنے منتخب کردہ بیچ تک پہنچا تب تک باقاعدہ برف ہاری شروع ہو چکی تھی۔ مجھے یاد ہے بچپن میں، منیس اور کامران شام کو آسمان پر برف کے مخصوص دو دھیا سفید بادل دیکھ کر رات بھر اپنے اپنے گھر میں بہزوں میں دیکے، برف گرنے کی دھماکیں کیا کرتے تھے اور صبح جب آسمان سے برف کے ستارے گرتے دیکھتے اور شہر کو برف کی سفید چادر میں لپٹا دیکھتے تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہتا۔ گھر والے ہمیں ڈھونڈتے ہی رو جاتے اور ہم کہیں دور آتے جاتے راہ گیروں پر چھپ کر برف کے گولے برسانے میں مصروف رہتے۔ سوچتا ہوں بچپن کا وہ دسہراتی جلدی کیاں بیت جاتا ہے اور جوانی کی یہ کمزری دھوپ ہے کہ جیسے صدیوں سے سر پر تھی ہوئی ہے اک ذرا بھی سر کی نہیں۔

منیس جس جگہ بیٹھا ہوا تھا زمین کا وہ بھڑکا عام سطح سے کچھ بلند تھا اس لیے دور سے لندن شہر کی اونچی لیکن قدیم عمارتوں کی جھلک یہاں سے واضح نظر آ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں برف نے تمام شہر کو پوری طرح سے ڈھک لیا۔ خود مجھے بھی دور سے کوئی دیکھتا تو شاید برف سے بھاگ بھڑکنا سمجھتا۔ کامران کا ابھی تک کچھ اتار پھینک تھا، وہ بچپن سے ہی ایسا تھا۔ ہمیشہ کا لا پرواہ، اور صبح جلدی اٹھنے سے تو ہم دونوں کی جیسے جان ہی باقی تھی۔ مجھے یاد ہے، ہم دونوں سالانہ استقامت میں بھی مشکل پر پے پٹے بننے کے بعد ہی کلاس روم میں پہنچتے تھے۔ بچپن یونہی بننے کیلئے گزر گیا لیکن بھرپور چاک کامران کے گھر کیو حالات نے پلٹا کھایا، ماں باپ ایک ٹریفک حادثے میں انڈھکویا رہے ہو گئے، گھر میں کامران اکیلا رہ گیا کیونکہ اس کی اکلوتی بڑی بہن پہلے ہی بڑھ کر اپنے گھر سعد عمارت کی تھی۔ باپ کی موت کے بعد کامران کو پتہ چلا کہ اس کے باپ نے قرضوں کا بے تحاشا بوجھ اس کے لیے ورثے میں چھوڑ رکھا ہے۔ قرض خواہوں کے مطالبات بڑھتے گئے اور آخر کار اسے مجبوراً اپنا آبائی گھر اور بچی بچی جائیداد وچ کر لندن شفٹ ہونا پڑا۔ قرض چکانے کے بعد جو کچھ بچا اس سے کامران نے یہاں ایک چھوٹا سا رہنلوڈ منتھ لیا تھا وہ اب اس کی گزر بسر مناسب اعزاز سے ہو جاتی تھی۔ اور اب تو وہ مکمل اسی شہر کا ہو کر رہ گیا تھا۔ وراصل اسے لندن بیٹھ سے ہی بہت پند تھا۔ شاید ہم دونوں کے اندر ایک بے حد قدیم روح بہتی تھی۔ کیونکہ قدامت پسندی اور اداوی لندن شہر کا ہی خاصہ ہے۔ ہر شہر کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ مجھے بھی کبھی پیچھے، چنگھاڑتے شہر اچھے نہیں لگے۔ گرم، ہمیں زدہ اور بے چین۔۔۔ جیسے ہر لمحہ کچھ کچھ گویا جانے کا احساس دل کو بھڑکے رکھے، مجھے سرد اور مضطرب مزاج کے لوگ اور شہر ہمیشہ سے حسرت کرتے تھے، ناموش اور نہ سکون، انسان کا ہر غم، ہر دکھ اپنے اندر سمیٹ لینے والے شہر، لندن بھی انہی شہروں میں سے ایک تھا۔

میرے سامنے سے ایک نوجوان جوڑا اپنے ہوئے گزرا لڑکی نے غور سے میری جانب دیکھا، اس کے رخسار مروی سے سرخ انکارہ سے

ہورہے تھے اور آنکھوں میں اک انہی سرگراہت تھی۔ لڑکی مجھے دیکھ کر سرگراہی اور دونوں مجھے وٹ (Wish) کرتے ہوئے کچھ قائل پر رکے دوسرے بیٹھے پر جا کر بیٹھ گئے اور راز و نیاز میں مصروف ہو گئے۔ دونوں کے لباس سے ظاہر تھا کہ وہ صبح سویرے یا گنگ (Joging) وغیرہ کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ یہ موسم اور ان فینڈوں کی یہ یاد، میں یہ سوچ کر سرگراہی۔ موسم بھی ہر انسان پر کچھ الگ سی طور اترتے ہیں۔ مجھے یاد ہے میرے آبائی شہر کوئٹہ میں جب رات بھر برف گرتی تھی تو صبح سویرے غریب مزدور طبقہ اپنے بال بچوں سمیت چھوٹے بڑے بیٹھے اور کڑی کے بڑے بڑے دھبے لے کر دروازے کے سامنے سے اور چھت کے اوپر سے برف ہٹانے میں بھٹ جاتا۔۔۔۔۔ کیونکہ یہ برف ان کے کپے گھر کی چھت پر زیادہ دیر لگتی تو چھت کو چھلنی بنا دیتی تھی۔ ان غریبوں کی ساری سردیاں ایسے بریفے موسم سے چٹا مانتے میں ہی گزر جاتی تھیں۔ اور یہاں لندن میں اس بریفی صبح میں یہ دو سوائے موسم کا لطف لینے گھر سے نکلے تھے۔ ایک ہی موسم کسی بھی دو افراد پر مختلف صورتوں میں کیسے وارو ہو سکتا ہے۔ موسم تو بس موسم ہی ہوتا ہے۔ اچانک میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا، میرے کاندھے کو کوئی دھڑکے سے ہلکا ہوا تھا۔

”اٹھ جائیے صاحب، نار وائل کا منتکش آ گیا ہے۔“

میں نے چونک کر اوپر دیکھا۔ کامران گرم کپڑوں میں لپٹا، صرف چہرہ باہر نکالے اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ کھڑا سرگراہ تھا۔ ہم دونوں بغل گیر ہو گئے ”معاف کرنا میڈی یار، کچھ دیر ہوگئی۔ لیکن تم باہر اس برف باری میں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ میں نے وہاں سارا فریشل چھاننا مارا تمہاری تلاش میں۔“

میری کامران سے پورے دو سال بعد یہ پہلی ملاقات تھی۔ دو سال پہلے وہ بین لندن کے اسی فقیرانہ ایر پورٹ پر مجھے آخری مرتبہ اوداع کہتے اٹھا تھا۔ جب زندگی اتنی حسین تھی۔ جب میں لندن صرف آوارہ گردی کرنے اور کامران کی بے مکان کھواس سننے کے لیے آتا تھا۔ بچپن کے بچے دوست بھی کسی گھنے، ساپہ دار شجر کی طرح ہوتے ہیں، ان کی چھاؤں میں کتنا سکون، کتنا آرام ہوتا ہے، ہل بھر کو نہیں بھی کامران کے گھنے لگ کر اپنے جلتے زخموں کو بھول سا گیا تھا۔

دھنسا اس نے مجھے اپنے آپ سے جدا کیا اور غور سے دیکھ کر کہنے لگا ”یار میڈی تم کتنے کمزور لگ رہے ہو۔“ میں نے اپنے سوٹ کیس کا ہینڈل اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”کاش میں بھی تمہارے لیے کوئی ایسی قسم کی رائے دے سکتا۔“ کامران ہنس کر اڑھائی سے ہوا۔ ارے یار تم تو جانتے ہو نا، بچپن سے ہی مجھ پر کھانا ڈرا جلدی لگتا ہے۔ اچھا اب میںیں کھڑے رہ کر فریڈ ہونے کا ارادہ ہے کیا؟ گھر چلو۔ کامران نے قدم آگے بڑھا دیے۔ ساتھ والے بیٹھے پر وہ جوڑا اب بھی برقی برف میں ڈوبا دانیبا سے لاپرواہ ایک دوپٹے میں گم تھا۔ کامران نے لڑکے کو دیکھ کر ایک لمبی سی آہ بھری اور بڑبڑاتے ہوئے اپنے آپ سے کہنے لگا ”نہ جانے یہ آج کل لندن کی گوریوں کے معیار کو کیا ہو گیا ہے۔“

کامران لمبے لمبے ڈاگ بھرتا زمین پر بھیجی برف کی سفید بے داغ پوشاک پر قدموں کے نشان چھوڑتا آگے بڑھ رہا تھا اور میں کسی مہول کی مانند اس کے نقش قدم طے کرتا پیچھے چلا آ رہا تھا۔ کامران کی وہی پُرانی موٹر کار قریب ہی کہیں پارک تھی۔ اس نے میرا سامان ڈکی میں رکھا اور ہم کامران کے قلیق کی جانب روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

## پھر وہی شام

ہم گھنٹے بھر میں کامران کے ساتھ لندن والے حصے میں موجود قیث پہنچ گئے تھے۔ جب تک ٹینس شاور نے کہ فارغ ہو جب تک کامران ناشہ بنا کر تھا مجھے کچھ خاص بھوک نہیں تھی لیکن کامران حسب معمول اپنی بڑ جوش روائتی مہمان نوازی کا مظاہرہ کرنے میں کچھ زیادہ ہی محو تھا۔ ناشہ کرنے کے بعد ٹینس لمبی ٹان کر سونگیا۔ کامران بھی اپنے رہنمورٹ کے لیے نکل پڑا۔

شاید شام کے چار بجے ہوں گے جب میری آنکھ کی شور سے مکمل گئی کامران کا یہ قیث ساتھ لندن کے پوش ایبیا میں واقع تھا۔ یہ دراصل سُرغ ایٹوں سے بنے دو منزلہ پارٹمنٹس کی ایک لمبی سی قطار تھی، جس میں انتہائی چوڑی سڑکوں کے درمیان یہ اپارٹمنٹس شاید آٹھ یا دس قطاروں میں بنے ہوئے تھے۔ ہر قطار میں آٹھ دو منزلہ پارٹمنٹ اس طرح ساتھ ساتھ جڑے ہوئے تھے کہ سب مکانوں کے آگے کا پانچپہ ایک لمبی سی قطار میں سیدھا چلا گیا تھا۔ البتہ درمیان میں سب مکانوں کو علیحدہ کرنے کے لیے خوبصورت توازن سے کئی ہوئی ہری بازو موجود تھی۔ ہر مکان کے باہر ایک خوبصورت سا پوسٹ بکس لگا ہوا تھا جس پر مالک مکان کا نام کندہ تھا۔ مجھے یاد تھا جب ہم چھوٹے تھے تو ڈرائنگ کی کاپی پر لکڑی کے اسی پوسٹ بکس جیسا ایک چھوٹا سا مکان ہر بچہ بناتا تھا۔ میرے کمرے کی کھڑی اپنی بالکونی سمیت کچھلی سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ یہ ہلکا سا شور بھی اسی کچھلی سڑک پر بنے قطار نمبر 2 کے اپارٹمنٹس کی طرف سے آرہا تھا۔ ٹینس بالکونی میں کھتا شیشے کا دروازہ کھول کر ٹینس میں نکل آیا۔ برف باری ختم ہو چکی تھی لیکن آس پاس ڈورنگ ہر چیز کو برف نے ڈھانپ دیا تھا، سڑک کے پارنگلی کے چند بچے برف کا پتلا بنانے میں مشغول تھے، یہ شورا بھی کے مصصوم قہقہوں اور آپس میں ہنسنے کا تھا۔ ان میں سے ایک گروپ پتلے کی ناک کی جگہ کا جڑکا ناچا رہا تھا جبکہ دوسرا گروپ ناک کو کھڑکی کی ایک موٹی کیل سے سنوارنا چاہتا تھا۔ پالا خردوں گروپوں میں گاجر پر اتفاق رہا تو ہو گیا اور پتلے کو ہیٹ و مظر اور کوٹ وغیرہ بھی پہنا دیا گیا۔ آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگ بچوں کی اس کاوش کو دیکھتے اور مسکراتے بڑھ جاتے۔ اب اندر بچہ اچھانے لگا تھا وہ ایسے بھی سروپوں کی شام جلد ہی آنے لگی ہے۔ رفتہ رفتہ بچوں کی ماؤں نے کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانکنے لگے انہیں پکارنا شروع کر دیا اور بچے ایک ایک کر کے پتلے سے زخمت لیتے ہوئے وہاں سے چل دیے۔ شاید ساری دنیا کی ماؤں اندر سے ایک ہی جیسی ہوتی ہیں۔ اندر سے ہر بچوں کو کھیلنے سے منع کرنے والیاں۔۔۔۔۔ شام ڈھلنے سے پہلے گھر واپس لوٹ آنے کی تاکید کرنے والیاں۔۔۔۔۔ اور بچوں کے دیر تک نہ آنے پر دروازوں، کھڑکیوں اور صحن میں کھڑے ہو کر آواز لگانے والیاں۔۔۔۔۔

جیسے جیسے شام ہو رہی تھی، سردی کی شدت بھی بڑھتی جا رہی تھی، سڑک کے کنارے کھڑا کافی والا لیسپر نیو (Espresso) کافی کے گرما گرم آتے جاتے راہ گیروں کو پیش کر رہا تھا۔ سردی سے ٹھہرتے جوڑے چلتے چلتے کچھ دیر کو رکتے اور گرم کافی حلق میں اتر کر آگے بڑھ

جاتے۔ اس وقت بھی ایک خوبصورت نوجوان جو ۱۱ سال کے سامنے کافی پیسنے کے لیے رکھا ہوا تھا۔ لڑکی اپنی بڑی بڑی آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے کافی کے بڑے سے گم سے نکلتی ہوئی بھاپ کے عقب سے شرارت سے لڑکے کو دیکھ رہی تھی اور باتیں کرتے ہوئے مسکرائے جا رہی تھی۔ ہم انسان بھی کس قدر ظاہر پرست۔ اور ظاہر پسند ہوتے ہیں۔ کافی کے گم سے افتخار و احساس سب کو دکھائی دے جاتا ہے۔ لیکن اپنے آس پاس بستے انسانوں کے سینے سے افتخار و احساس سب کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ اب مکمل اندھیرا چھا چکا تھا۔ سڑک کے کناروں پر لگے لمپ پوسٹ جمل چمکے تھے۔ پھر وہی شام قحی، پھر وہی میں تھا اور پھر وہی جیتی یادوں کے صوبہ سائے تھے۔ کہتے ہیں شام زوال کا وقت ہوتا ہے اور زوال صرف سورج کا ہی تو نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ مجھ پر تو ویسے بھی یہ وقت زوال بہت بھاری ثابت ہوتا تھا۔ چشتی عیالی نہیں نے اپنی زندگی میں شام کے وقت محسوس کی ہے۔۔۔۔۔ اتنی کسی اور پہر میں کبھی نہیں جھیلی۔

دفتر قلبیت کے لانچ میں رکھاؤں کا اٹھا۔ دوسری طرف سے کامران کی چپکلی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”اے میرے اودھیوں کے پرستان کے شیراؤے۔۔۔۔۔ رات کے کھانے کا کیا پروگرام ہے۔ اگر باہر چلنا ہے تو تیار ہو جاؤ نہیں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔ اگر گھر پر ہی کھانا ہے تو نہیں ڈرائیور سے کہتا ہوں کہ رات سے کچھ لینے ہوئے گھر چلے۔“ مجھے کچھ حیرت سی ہوئی ”تم نے ڈرائیور کو کہا ہے؟ اودھیوں۔“ کامران کی مختصر فہمی کی آواز فون پر گونجی۔ ”دراصل جب نہیں اپنے کینے کو بند کر کے کھتا ہوں تو وہاں سے گھر تک کے راستے میں نہیں خود اپنے آپ ہی اپنا ڈرائیور ہوتا ہوں۔ دوسروں کو ڈرائیور کہانے میں شخصیت ڈرازمب دار رہتی ہے۔“ میرے منہ سے اس کی شان میں کچھ الفاظ نکلے اور نہیں نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ”تم کبھی نہیں سدھر سکتے میرا کمرے لٹکنے کا مواظف نہیں ہے۔ کھانا گھر پر ہی کھائیں گے۔“

کچھ ہی دیر میں کامران رات کے کھانے کے تمام لوازمات سمیت آن موجود ہوا۔ وہ آتے ہوئے تیار کھانا ہی بازار سے لیتا آیا تھا جسے اس نے کچھ ای وی میں کسی تنگ صورت کی طرح گرم کر کے کھانے کی میز پر لگا دیا۔ کھانے کے بعد کافی کا ایک دور چلا اور پھر آخر کار کامران کی زبان پر وہ بات آئی گئی جسے میں انہما نے نہیں سنا تھا۔

کامران نے کافی کا ایک لمبا ساپ لینے ہوئے غور سے میری جانب دیکھا ”تم اتنی آسانی سے تھکنا ڈال دو گے۔۔۔ ایسی امید مجھے تم سے ہرگز نہیں تھی میڈی۔“ میں نے دانستہ اس کی جانب دیکھنے سے گریز کیا۔۔۔۔۔ ”جب وٹن خود بخود مقابل کے خیام میں آ کر فوٹا دکرے کہ یہی ایک جیت اس کی زندگی کا حاصل ہے تو مجھ جیسوں کی تھکنا ڈالنے ہی پڑتے ہیں۔“

کامران کی بے چینی میرے جواب سے کم ہونے کے بجائے کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ جھجھکا کر بولا۔ ”مجھے تمہاری منطق آج تک سمجھ نہیں آئی۔ تم نے اس ایک لڑکی کے لیے زمانے بھر سے بغاوت مول لی تھی۔ سارے گھرانے کی مخالفت کے باوجود تم اپنی ہکڈٹ گئے تھے۔ کیا کچھ نہیں سہا تم نے۔ باپ نے جیسیں عاقی کر ڈالا۔ ماں نے نالہ تو لیا۔ گھر باریجھوٹ گیا۔ پھر کیا کیا تم نے دست برداری کا اعلان کیسے کر دیا۔“

میرے لبوں پر کزوری اک مسکراہٹ اُبھر آئی۔ ”شاید زمانے کی تغیروں نے مجھے احساس دلادیا کہ محبت صرف ایک بے وقوفی ہے۔ اپنے گھر کا میٹھ و آرام چھوڑ کر صحرائوں اور جنگلوں کی خاک چھانٹنے والے صرف احمق ہوتے ہیں۔ اور کبھی نہیں۔“

کامراں مرنے سے اٹھ کر میری جانب آیا اور میرے کانہوں پر ہاتھ رکھ کر تھک کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ "منہیں تھیں چھ سال کی عمر سے جانتا ہوں مسٹر صادق امیر رضا۔ پچھلے بیس سالوں سے ہم دونوں ایک ساتھ ہیں۔ ہمارا بچپن، ہماری جوانی ایک دوسرے کے سامنے کسی آنکھ کی طرح عیاں ہے۔ تمہارا شمار انہی انسانوں میں ہوتا ہے جو گھر کا نرم ستر چھوڑ کر در بدر کی جتنی ریت چھانٹتے پھرتے ہیں۔ اس وقت تم تھکے ہوئے ہو، جا کر سو جاؤ۔ ہم اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے۔"

کامراں مجھے گھسی دینا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میں وہیں آرام کر رہی پر کھڑکی کے سامنے بیٹھا ہر سناٹے میں درختوں کی ٹہنیوں سے، جو برف کے بوجھ سے بھاری ہو کر جھکی ہوئی تھیں برف گرنے کی مخصوص دھپ دھپ سنتا رہا۔ باہر آسمان سرخ انگارہ سا ہو گیا تھا۔ اور یہاں اندر کمرے میں آتش دان میں جلتی کٹڑیوں کے جھنڈے کی آواز اور دیوار پر لپکتے شعلوں کے سائے تھے۔ رات ڈھل رہی تھی اور میرا ذہن ماضی کے درجوں کو پھلا تھکاؤ اور سال پہلے کی اس شام کی یادوں تک جا پہنچا تھا جب میری ایمان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

☆☆☆

## ﴿اردو ٹائپنگ سروس﴾

اگر آپ اپنی کہانی، مضمون، مقالہ یا کالم وغیرہ کسی رسالے یا ویب سائٹ پر شائع کرانا چاہتے ہیں لیکن اردو ٹائپنگ میں دشواری آپ کی راہ میں حائل ہے تو ہماری خدمات حاصل کیجئے۔

☆ ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر سیکھ کیجئے اور ہمیں بھیج دیجئے یا

☆ اپنی تحریر مردہ متن اور دو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیج دیجئے یا

☆ اپنا مواد اپنی آواز میں ریکارڈ کر کے ہمیں ارسال کر دیجئے یا

☆ مواد زیادہ ہونے کی صورت میں بذریعہ ڈاک بھی بھیجا جاسکتا ہے

اردو میں ٹائپ شدہ مواد آپ کو ای میل کر دیا جائے گا۔ آپ دنیا میں کہیں بھی ہوں، ہماری اس سروس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ادائیگی کے طریقہ کار اور مزید تفصیلات کے لئے رابطہ کریں۔

فون نمبر 0092-331-4262015, 0300-4054540

ای میل: harfcomposers@yahoo.com

ویب سائٹ: http://pktypist.com



## محبت..... نیلا موسم

ہمارا گھرانہ شہر کے انتہائی حتمول اور بااثر گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ بابا بطور کشمیر ریٹائر ہونے کے بعد باپ دادا کی دستخ دہریش زمیوں کے انتظامات سنبھالتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کبھی کبچے زمین وارنہ بن سکے اور ان کے اندر چھپا ایک سخت بیرو کرینٹ ان کی شخصیت پر ہمیشہ سے نمایاں اور حاوی رہا تھا۔ امی غودایک بہت بڑے زمین دار کی بیٹی تھیں اور ان کے اندر ہر چھ لکھی جاگیر داروں کی تمام خصوصیات موجود تھیں۔ انگلش ادب میں ماسٹر ز بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ پایا تھا۔ ہم تین بھائی اور ایک بہن سمیت یہ خوش حال گھرانہ زندگی کی مخصوص ڈگر پر رواں دواں تھا۔ بابا کے رابطے ملک کے انتہائی اہم سیاست دانوں سے ہمہ وقت رہتے تھے اور ہمارے ڈرائنگ روم میں ہر شام بابا کی بیٹھک ملک کے موجود و حکمران طبقے کے دزدیروں سے رہتی تھی۔ مجھے بچپن سے ہمیشہ اس بات پر حیرت رہی تھی کہ ملک میں کھوٹیں تو بدلتی رہتی تھیں لیکن بابا کی بیٹھک میں دہی چند مخصوص چیرے روپ بدل بدل کر موجود رہتے تھے۔ شاید بابا کی دوستی ہی ایسے سیاست دانوں سے تھی جو ہر حال میں اقتدار کے پائے میں جھولتے رہتے تھے۔ شاید اسی لیے انہوں نے اپنے سب سے بڑے بیٹے سجاد اور بیٹی مدیحہ کی شادی بھی انہی حکمران خاندانوں میں کروادی تھی۔ میری بہن مدیحہ سندھ کے ایک بہت بااثر خاندان میں بیاہی گئی تھی جو کہلاتے تو سندھ کے تھے، لیکن ان کی نئی نسل نے پاکستان کو صرف دارالحکومت سے زیادہ کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ مدیحہ بھی اسلام آباد میں ہی رہائش پذیر تھی۔ سجاد بھائی کی شادی بھی پنجاب کے امرا خاندان کی بیٹی سے ہو چکی تھی اور میری بھابھی عبرتہ کو ہر وقت اس بات کی فکر کھائے جاتی تھی کہ کہیں کسی بھی موقع پر ان کا اُنوچا خاندان ہمارے خاندان سے نچا کر بہت نہ ہو جائے۔ ویسے ان کی اور سجاد بھائی کی خوب جتنی تھی، کیونکہ سجاد بھائی کو اپنے بڑے اور بیرون ملک دوروں سے ہی فرصت نہیں تھی لہذا بھابھی اور امی خود ہی گھر کی پارٹیز اور تقریبات وغیرہ کے انتہام میں جتنی دہتی تھیں۔ آپ رائے میں یعنی حماد امجد صاحب اور مجھ سے چھوٹا اور گھر بھر کا لاڈلا عبا تو ہم دونوں ہی کو گھر کے ان ہنگاموں اور شور شرابوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے حال ہی میں ماسٹر کیا تھا اور اب عبا بھی گریجویٹن کے بعد فارغ ہو چکا تھا۔ مجھے شروع سے ہی زندگی کو باقاعدہ کسی منصوبہ بندی کے تحت گزارنے کی عادت نہ تھی۔ اس لیے بابا کے لاکھ کہنے کے باوجود میں ان کے کاروبار میں اب تک ان کا ہاتھ نہانے میں پانچوہیاں نہیں لگا پایا تھا۔ اور اس بات پر بابا آج کل مجھ سے کچھ ناراض بھی رہتے تھے۔ دوسری جانب عبا تھا جو پاکستان میں کچھ کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اُسے ہمیشہ سے ہی باہر جا کر رہنے کا جنون تھا۔ لیکن بابا سے کوئی جتنی بات کرنے سے اس کی بھی جان جاتی تھی۔ ہمارے گھر میں آئے روز کسی نہ کسی بات کو بہانہ بنا کر پارٹی دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ ہم امیروں کے پاس خوش منانے کے بہانے اس قدر کم کیوں ہیں۔۔۔؟ شاید کہیں چڑھی ہوئی یہ بات سچی تھی کہ امیروں کا یہ خیال کہ غریب زیادہ خوش رہتے ہیں، اتنا ہی غلط ہے جتنا کہ غریبوں کا یہ گمان کہ امیران سے زیادہ خوش ہیں۔

آج بھی ہمارے گھر میں ایک پارٹی تھی۔ یہاں یہ تھا کہ سجاد بھائی کے اکلوتے بیٹے نے آج پہلا پارہ شتم کر لیا تھا۔ ہم امیر گھرانوں میں دوسروں کے دیکھا دیکھی آج کل بچوں کو باقاعدہ کسی مولوی سے شام کو پارہ پڑھوانے کا فیشن بھی زوروں پر تھا۔ یا پھر شاید اس کے پیچھے بابا کے بچپن کی سخت تربیت اور ادا کی مخصوص پرورش کا بھی ہاتھ تھا۔ انہوں نے سجاد بھائی کو باقاعدہ شتم دے کر ان کے بیٹے سنی کے لیے کسی مولوی کا انتظام کرنے کا کہا تھا جو بچے کو شام کو آ کر قرآن کا سبق دے دے ہا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میرے بچے کے بیشتر دن بے چارے مولوی صاحب کو بچنے کے گیت سے ہی عاقل دیا دیا ہنس پلٹنا پڑتا تھا کیونکہ زیادہ تر گھر میں کسی نہ کسی پارٹی یا تقریب کا بنگاہ میں لگا رہتا تھا۔ اب ایسی ماؤں یا دینار میں بھلا ایک سید سے سادے مولا نا ٹاپ مولوی اور اس کی پڑائی سی سائیکل کا بھلا کیا جوڑ۔۔۔؟ خود میرا بھی کوئی مولوی صاحب کا یہ بھلا کیا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا لیکن بابا کے رعب کے آگے بھلا کسی کی کب ملتی۔۔۔؟ لہذا بادل خواست اس رسم کو بھالیا جا رہا تھا۔ جانے ہم امیر ایسی چیزوں سے اتنی دور اور غریب ان رسومات سے اتنے قریب کیوں ہوتے ہیں۔۔۔؟ ہم مذہب کو بھی ایک رسم کی طرح بھاتے ہیں اور غریب رسم کو بھی کسی مذہبی طریقے کی طرح چناتے ہیں۔

خود میری بھی سنی کے مولوی صاحب سے آتے جاتے ایک آدھ بار کی سی علیک سلیک ہنس دانتے میں، یا پھر گھر کے مخصوص لاؤنج کے حصے میں جہاں وہ سنی کو سبق دے رہے ہوتے تھے، ہو چکی تھی۔ مولوی عظیم الدین صاحب ڈبل پینے سے ایک سید سے سادے مولا سے فہم تھے، جنہیں میں نے ہمیشہ سفید کپڑوں کرتا، پاجامہ میں لباس ہی دیکھا تھا۔ چہرہ قور، آنکھوں پر نظر کا چشمہ پپ چاپ اور خاموشی سے ذبح داری ان کی چال و حال سے نمایاں تھی۔ ہمیشہ سراو آدھیں چمکا کر بات کرتے والے۔ اچانک انہی ریٹے سائیکل پر شام چار بجے بھات پابندی سے آن سو جو ہوتے اور ذکر جہاں انہیں بٹھا دیتا وہیں پپ چاپ خاموش بیٹھے رچے بھر سوتلی کے نیچے آنے کا انتظار کرتے۔ مجھے اس بات پر بھی ہمیشہ حیرت رہی کہ سنی جیسا شرارتی بچہ ان کے قابو میں کیسے آگیا تھا۔ کیونکہ باقی ٹیوٹرز کی جو درگت وہ بناتا تھا، اس کا مظاہرہ میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ لیکن خلاف توقع مولوی صاحب کے سامنے وہ بڑا موڈ بٹا بیٹھا رہتا تھا۔ میں نے ایک آدھ بار آتے جاتے سنی کو مولوی صاحب کی نظر پچا کر اس کی کوشش بھی کی تھی لیکن اس پر کوئی اثر ہی نہیں پڑتا تھا۔

اور شاید یہ سنی کی ہی فرمائش تھی کہ آج کی پارٹی جو خوشی ہی کے پہلا پارہ شتم کرنے کے اعزاز میں منشد کی جا رہی ہے۔ اس میں اس کے استاد یعنی مولوی صاحب کی شرکت لازمی تھی ورنہ اس نے گھر بھر کو دھکی دھکی کر دو خود بھی پارٹی میں نہیں آئے گا اور نہ ہی اپنی ماکے پسند کے کپڑے پہنے گا۔ امی اور بھائی سنی کی اس فرمائش پر کافی جذبہ ہوتی تھیں۔ بھلا اس ماؤں پارٹی میں جہاں شہر بھر کی بچکات اپنے پائلوٹو شادو ہروں کے ساتھ رزق برق لباسوں، نئے ڈیزائن کی جیولری سے لدی پھندی، لمبی لمبی کاروں اور عالی شان گاڑیوں میں تشریف لائیں گی، ایک لمبی سی سفید داڑھی والے اس غریب سے بزرگ کی جگہ کہاں بنتی تھی۔ محل میں ٹاٹ کا بیوند۔۔۔ ہونہ۔۔۔

لیکن سنی کی ضد کے آگے آج تک کسی کی جلی ہے جو اس دن چل پاتی۔۔۔؟ آخر گھر کی خواتین کو ہی پار مانا جڑی۔ لیکن اب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ گھر کے خاص نوکروں نے نکل ہی مولوی صاحب کو اس تقریب کی وجہ سے آج کو بھی آنے سے منع کر دیا تھا لہذا ان کے آنے کا کوئی امکان

بھی نہ تھا۔ سنی کے آنسو پھر سے ٹپکنے لگ گئے تھے۔ آخر بابا کے خاص ڈراما رچر شاکر سے پتا چلا کہ اسے مولوی صاحب کے گھر کا پتہ معلوم ہے۔ کیونکہ پہلے وہ بھی شہر کے اسی بڑے محلے میں رہتا تھا جہاں مولوی عظیم الدین اب تک رہائش پذیر تھے۔ ملے یہ بابا کہ شاکر جا کر مولوی صاحب اور ان کی فیملی کو بھی باقاعدہ تعریف میں آنے کی دعوت دے آئے۔ سنی کو شاید شاکر پر زیادہ اعتماد نہیں تھا لہذا وہ خود بھی شاکر کی گاڑی میں سوار ہو کر مولوی صاحب کو لینے چلا گیا کیونکہ اب تعریف کا وقت تو سمجھو ہوئی چکا تھا مولوی صاحب کے انتظار میں دیر بھی ہو چکی تھی۔ میں اس وقت اپنے کمرے میں بیڈ پر پڑا سستی سے سانس دے کر کئی دی کے ٹیبل بدل رہا تھا جب چھوٹے (عباد) نے میرے کمرے کا دروازہ کھولا۔ ”بے گب بی، کیا نیچے آنے کا ارادہ نہیں ہے۔ پارٹی شروع ہو چکی ہے۔“ عباد ہمیشہ کی طرح آج بھی شام کی پارٹی کے لیے باقاعدہ سوٹ اور پیجنگ بو (Bow) میں ملیں تھا۔ اسے دیکھ کر میری بے ساختہ جی اکل پڑی۔

”تم تو اس طرح تیار ہو کر نیچے جا رہے ہو جیسے آج ہی تمہارے دشمنے کا بھی فائنل اعلان کر دیا جائے گا۔“

”عباد نے میری بات سن کر کڑا سا مسرہ بتایا۔ ”کم آن گب بی، آپ بھی نہ۔۔۔ یونو آئی آل دیزرینین ویل ڈرینڈ (You know I always remain well dressed) میں نے ریموٹ سے ٹی وی آف کیا اور نیکے عباد کی طرف پھینکا۔

”غوب جانتا ہوں میں تمہاری اس خوش لباسی کو۔۔۔ ضرور کسی نئی صہیت کا استقبال کے لیے ہیں بن ٹھن کر ہال میں جا رہے ہو۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آتا کہ یہ سارے شہر کی لڑکیاں کیا آ شوب چشم کی تیاری سے دوچار ہیں۔!۔۔ ورنہ بھلا کوئی تمہاری جانت بکھیتی ہی کیوں۔۔۔“

عباد ہنسا۔۔۔ ”گھری حرفی وال برابر۔۔۔ آپ سب گھروالے بھلا میری قدر کیا جا میں۔۔۔ بہر حال۔۔۔ اب آپ بھی دربر نہ کریں۔۔۔ گھنر صاحب کا حکم ہے کہ سب لوگ نیچے موجود ہونے چاہئیں۔“

میں اور عباد تنہائی میں بابا کو گھنر صاحب کے نام سے پکارتے تھے۔ میں جھنجھٹا سا گیا۔۔۔ ”آف۔۔۔ کیا مصیبت ہے پار۔۔۔ ایک بچے کی معصوم سی رسم کشائی کو اس قدر دکھا د اور بڑا عداوت دینے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔ دنیا میں ہزاروں لاکھوں بچے روزانہ پورا قرآن ختم کرتے ہیں، حفظ کر لیتے ہیں۔ لیکن گھنیں بھی یوں اس کاؤ حنڈ ورائٹیں بیٹا جاتا اور پھر ایسے موقع پر اس طرح کی پارٹی۔۔۔ نیس تو فیڈ اپ Fed UP ہو گیا ہوں۔“

عباد سمجھانے کا انداز میں بولا ”کم آن گب بی۔۔۔ بی اے سپورٹ۔۔۔ میں جانتا ہوں یہ صرف دکھا د ہے۔ لیکن کسی اور کی نہیں تو صرف سنی کی خوشی کے لیے آجائیں۔ آپ جانتے ہیں وہ آپ سے کس قدر انجے ہے۔“ عباد دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ میں سنی کی خوشی کے لیے پارٹی میں ضرور شرکت کروں گا چاہے اوپر ہی دل سے ہی سہی۔

شاہد ہماری زندگی کے نوے فیصد فیصلوں میں ایسے ہی کسی اپنے کسی لاڈلے کا بھرم رکھنا بنیادی شرط ہوتی ہے۔ ہم بہت تھوڑی زندگی خود اپنے آپ کے لیے ہی جانتے ہیں، زیادہ تر تو دوسروں کا بھرم رکھنے میں ہی بسر ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

## پھر وہی محبت

شہر کی کنٹونمنٹ میں جہاں علاقے کے بڑے امراء کی کونھیاں کئی کئی ایکڑوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اسی علاقے میں دو روپہ درختوں سے ڈھکی ایک سڑک کے اہتمام پر میٹرزڈ کشر صاحبدرضا کی عظیم الشان حویلی آج پھر برقی قہقروں سے جھلک رہی ہے۔ دھوپ ڈھل چکی تھی لیکن شام کے نہ ابھی پوری طرح پھیلے نہیں تھے۔ دُور سے کشر صاحب کی پُرائی مرشد یز گاڑی، جواب زیادہ تر گھر کے کام کاج کے لیے استعمال ہوتی تھی، فرمائے بھرتی ہوئی نمودار ہوئی۔ گاڑی کو گھر کا سب سے پُرانا ڈرائیور شاکر چلار ہاتھ اور سستی میاں چہرے پر ان جانی خوشی کے تاثرات لیے یوں بیٹھے تھے جیسے کوئی بہت بڑا کارنامہ سر انجام دے کر لوٹے ہوں۔ گاڑی کی کچھلی سیٹ پر سفید چادروں میں ڈھکی، دو چھوٹی موٹی لڑکیاں مٹلی ہوئی بیٹھی تھیں البتہ مولوی طلیم کا کچھ اچھا بچہ نہ تھا۔ گاڑی نے حویلی کے بڑے بڑے جنگلوں والے گیٹ کے سامنے پہنچنے سے پہلے ہی مخصوص انداز میں دو مرتبہ ہارن بجا دیا تھا لہذا آہنی جنگلوں والے گیٹ کے ساتھ ہی بنے ہوئے کنکری کے کینکرن سے دو ملازم تیزی سے نکلے اور انہوں نے گاڑی کے گیٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی گیٹ کھول دیا۔ کشر صاحب کی ٹیلی مرشد یز تیزی سے گھر میں داخل ہو گئی۔

☆☆

جب تک نہیں تیار ہو کر چلے حال میں پہنچا تب تک آخر بچا کبھی مہمان آپکے تھے۔ سنی نے مجھے دیکھتے ہی دور سے یوں ہاتھ ہلایا جیسے وہ مجھے کوئی خاص بات بتانا چاہتا ہو۔ لیکن اس وقت وہ خرد و سفید کرنا چاہا۔ پہنچا پہنچے دوستوں اور کزنز وغیرہ میں اس قدر گھرا ہوا تھا کہ اس کا فوری طور پر بھونک پہنچا اچھٹن تھا۔ عباد صاحب حسب معمول یکمات کے ساتھ آئی ہوئی ان کی بیٹیوں اور دوسری لڑکیوں کو متاثر کرنے کی سعی و توسع کوششوں میں مصروف تھے۔ ایک طرف بابا اور سجاد بھائی بیٹھ کی طرح اس پارٹی میں آئے ہوئے چند بڑے ناموں کے ساتھ بزنس ڈیلز کے چکر میں لگے ہوئے تھے۔ بابا ایسے موقع کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ ہال میں کافی چہل پہل تھی، ہر طرف جیسے رنگ و روکری برسات ہو۔ ایک طرف امی اور عریہ بھابی یکمات کو متاثر کرنے کا ہر حربہ استعمال کر رہی تھیں۔ جیڈری کی باتیں تھیں۔ نئے آنے والے فیشن کی باتیں تھیں۔ گرمیوں کی چھنیاں فرانس یا سوئٹزرلینڈ میں گزارنے کی باتیں تھیں۔ رنگین آئینل ہر طرف لہرا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے سنی کے پہلے پارے کی رسم نہ ہو بلکہ اس کے نکاح کی تقریب ہو۔ میرے سیزمیں سے اترتے اترتے بہت سی خواب ٹاک ڈاک ہوں کے سلام مجھ تک پہنچ چکے تھے۔ لیکن بقول کامران میں اس معاملے میں احتیاطی ناشر مواقع ہوا تھا۔ پتہ نہیں کیوں۔۔۔ مجھے محبت و مہرہ قسم کی چیزوں کا سوچ کر ہی فنی آجاتی تھی۔ مجھے عورت کبھی رہنے کی حد تک بھی اس طرح پسند نہیں آتی تھی جیسا کہ عام رومانوی داستانوں میں بیان کیا جاتا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ نہیں نے بچپن سے ہی غلو اور دل میں تعلیم (Co-education) حاصل کی تھی۔ بچپن سے ہی بہری بہترین دوست صرف لڑکیاں ہی رہی تھیں۔ نہیں انہی کے ساتھ بچپن



بچپن کا رومان اس قدر گہرا اثر لے لیا کہ وہ بڑا ہوتا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے بچپن میں لڑکیاں وہ مصوم دوتی ہی اس لیے کرتی ہیں کہ بڑے ہو کر جوانی میں اسی دوست کو اپنے خوابوں کا شہزادہ بنالیں۔۔۔۔۔؟

بحر حال۔۔۔۔۔ اس وقت میں اس رومان سے بالکل بے خبر تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کسی کا محبوب ہونا کس قدر اعزاز کی بات ہوتی ہے۔ نہیں نہیں جانتا تھا کہ لوگوں کا محبوب بننے میں عمریں بیت جاتی ہیں لیکن اب بھی یہ مسد کی کسی ایک آدھ خوش نصیب کا ہی مقدر ٹھہرتی ہے۔ ہماری ساری عمر دوسروں کو اپنا محبوب بنانے میں ہی صرف ہو جاتی ہے۔ کیونکہ خود کسی کا محبوب بننا ہمارے اختیار میں ہوتا ہی کب ہے؟ یہ اعزاز تو صرف آسمان سے ہی وار د ہوتا ہے۔ لیکن قسم ہے کہ اس اعزاز کو پانے والے خود اس اعزاز اس رچے کی نعمت سے بے خبر ہوتے ہیں۔

منیں سبھی سے ملتا ملتا، ان نازنیوں کو چھیڑتا اور ان سے اٹھکیاں کرنا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ اس بات سے بے خبر کہ محبت کا بیٹا موسم بھرے بہت قریب یوں بکھر رہا ہے جیسے وہ صدیوں سے بس میری ہی تاک میں ہو۔ اور تھکی دھنکا میرے قدم جسے ہال کے گھڑی سے بنے فرش پر جمے گئے۔ میرے آس پاس کا سبھی شور، وہ فزنی قہقہوں کا ہلترنگ ختم سا گیا۔ فضا ساکت سی ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے کسی خود کار ریوٹ کے ذریعے اس ساری محفل کو چند ساتوں کے لیے ہالہ (Pause) کر دیا ہو۔ دو میرے سامنے بیٹھی تھی۔ ڈری سی، سبکی سی۔۔۔۔۔ بڑے سے منفیہ دو بچے کی آدھ لے کر۔۔۔۔۔ آس پاس سے گزرتے مردوں کی نظر سے بچنے کی کوشش میں اس کا سونے جیہا رنگ گلابی آمیر شل سے اور بھی تنہے لگا تھا۔ ایک ساعت کے لیے اس کی گھٹی کالی ٹیکسٹائٹ اور میں ہمیشہ کے لیے ان آنکھوں میں غرق ہو گیا۔ چند لمحوں میں کیا سے کیا ہو گیا۔۔۔۔۔؟ اگر لوگ اسی کو کیو پڈ کا دار کہتے ہیں تو اس سے زیادہ بے رحم اور سفاک دار آج تک میں نے اپنی تمام زندگی میں نہیں جھلیا تھا۔۔۔۔۔ جانے وہ لڑکی کون تھی۔ سفید کرتے اور تنک پاجامے میں ملیں۔۔۔۔۔ اس کے نازک سے سراپے نے جیسے آس پوری محفل کو ناٹ کا پٹا دیا تھا۔۔۔۔۔ اور وہ خود اس ناٹ میں منسل کے ایک پیوند کی طرح لگی چھٹی تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ اس لڑکی کے علاوہ اس محفل میں دوسری کوئی حسین موجود نہ تھی۔ وہاں تو نازنیوں کی بھرمار تھی ایک سے بڑھ کر ایک عشوہ طراز نازک اندام سہ جینوں کا جھرمٹ موجود تھا وہاں۔۔۔۔۔ لیکن اس لڑکی میں تو ایک کونے میں اپنے جیسے ہی سلیپ میں ملیں ایک نہ جاکم عمر کی لڑکی کے ساتھ پک پک چاپ خاموش سی بیٹھی تھی، جاتے ایسی کیا بات تھی۔ دوسرے بالوں سے لگی ایک لمبی سی شری لٹ سے لے کر پاؤں میں پہنے نازک سے کھنوں تک پورا ایک جہاں ہی تو تھی۔ آس پاس سے گزرتے مرد اور عورتیں حیرت سے ان دونوں کیوں کو دیکھتے جو کسی بھی طرح اس پارٹی سے اور اس کے احوال سے میل نہیں کھا رہی تھیں۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی غما سا ہاتھ میرے کوٹ کی آستین سنکھ رہا ہے۔ میں اپنے خیالات کی رو سے باہر نکل آیا۔ سنی جانے کب سے مجھے آواز دیں دے رہا تھا "چاچو۔۔۔۔۔ میری بات تو سنئے۔۔۔۔۔ میڈی چاچو۔۔۔۔۔"

منیں اس کی طرف متوجہ ہوا لیکن میرا دھیان اب بھی اسی لڑکی میں اٹکا ہوا تھا۔ سنی مجھ سے کچھ ناراض تھا۔ "چاچے چاچو۔۔۔۔۔ میں آپ سے بات نہیں کروں گا۔ آج سب نے مجھے گفٹ دیے ہیں لیکن آپ نے ابھی تک۔۔۔۔۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر اسے دلوں ہاتھوں سے اٹھا کر پاس پڑی میز پر بٹھا دیا۔ "ارے یاد۔۔۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہارا میڈی چاچو تمہیں آج کوئی گفٹ دے۔۔۔۔۔ بولو کیا چاہیے۔ سنی کے

چہرے پر معصوم سی خوشی لہرائی اور وہ اگلا دھڑک دھڑک میں پڑ گیا۔ "ہوں۔۔۔ نیا پلٹا سکیں۔۔۔ دو جا کیے Jokies کے ساتھ۔۔۔"

میں نے ہائی بھری۔ "چلو منظور ہے۔۔۔ کل تک تمہارے روم میں موجود ہو گا۔ اب خوش۔۔۔" سنی نے خوشی سے نعرہ لگا دیا، "اوہ چاچو۔۔۔ یو آر گرینٹ۔" اب میں اپنے مطلب کی بات پر آیا۔ "لیکن یار۔۔۔ آج تمہاری پارٹی میں کچھ نئے لوگ بھی نظر آ رہے ہیں۔ تم نے تعارف بھی نہیں کروایا ان سے" میں نے دور بیٹھی دونوں لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"اوہ وہ دونوں۔۔۔ وہ تو ایمان آہلی اور حیا باہمی ہیں۔ وہ جو ہیں تا میرے مولوی صاحب۔۔۔ انہی کی بیٹیاں ہیں۔ صرف میرے لیے آج یہاں آئی ہیں۔" سنی میاں بڑے فخر سے بتا رہے تھے اور میری نظریں اسی قیامت کے سراپے کا طواف کر رہی تھیں۔ پتہ یہ چاکر جب ڈرائیور شا کرستی کے ساتھ مولوی صاحب کے گھر پہنچا تو وہاں جا کر معلوم ہوا کہ مولوی صاحب تو گذشتہ رات سے بخار میں چپ رہے تھے۔ ان کا تقریب میں شرکت کرنا ناممکن تھا۔ لیکن سنی میاں جھل گئے کہ اگر مولوی صاحب کی طرف سے اس کی رسم کشائی کی تقریب میں کوئی شریک نہ ہو تو سنی وہ تقریب ہی ملتوی کر دے گا۔ وراصل سنی پہلے بھی ڈرائیور کے ساتھ کئی مرتبہ مولوی صاحب کو ان کے گھر ڈراپ کروانے جا چکا تھا۔ کبھی خراب موسم کی وجہ سے اور کبھی مولوی صاحب کی اگلیوں کی سائیکل کی کسی خرابی کی وجہ سے اور جب کبھی بھی مولوی صاحب سنی کے ساتھ کشتی صاحب کی کسی گاڑی میں گھر آتے تو سنی کا گھر کا بیٹا وہاں خاص ٹھکانے پہلے آئے، ہانے نہ دیتے۔ جو خود سنی کا بھی خاص پسندیدہ مشروب تھا۔ اور یہ مشروب بنانے والی وہ تھیں سنی میاں کی ایمان آہلی، یوں سنی مولوی صاحب کے تمام گھروالوں سے خوب مکمل مل چکا تھا۔ مولوی صاحب کی بیوی اور بیٹیاں بھی سنی سے بہت مانوس ہو چکی تھیں۔ شاید اسی لیے اس دن سنی کی خدمت کے سامنے مولوی صاحب کو ہار ماننا ہی پڑی۔ ان کی بیوی تو فوری تقریب میں جانے کے نام سے ہی ہول کماتی تھی۔ سوانہوں نے وہ الفاظ میں چھوٹی بیٹی حیا کو سنی کے ساتھ بھیجے کی تجویز دی۔ عام طور پر مولوی صاحب ایسی باتوں کو سخت نا پسند کرتے تھے لیکن جانے کیا سوچ کر انہوں نے کچھ دیر کے لیے حیا کو جانے کی اجازت دے دی۔ لیکن حیا نے اکیلے جانے سے صاف منع کر دیا۔ یہ کوٹھی کا پرانا ڈرائیور شا کر جو بہت دیر سے گھر کے دروازے پر گاڑی لیے سنی کے انتظار میں کھڑا تھا۔ دروازے پر آیا اور تمام معاملے کی سن گن ملنے کے بعد اس نے بخار سے لرزتے کاچھے مولوی صاحب کو قہقہے دی کہ حیا اور ایمان دونوں ہی اس کی اچھی بچیاں ہیں اور اسی کے ہاتھوں میں کھیل کر جوان ہوئیں۔ اس نے مولوی صاحب سے درخواست کی کہ وہ دونوں بچیوں کو سنی میاں کی خوشی کے لیے چاہے تھوڑی دیر کو ہی سنی تقریب میں جانے کی اجازت دے دیں۔ شا کر خود انہیں رسم کشائی کے فوراً بعد واپس گھر چھوڑ دے گا۔ حیا کی دھمک تو مولوی صاحب اپنے دل کو مٹا چکے تھے لیکن ایمان نے تو جوانی کے بعد گھر کی دہلیز سے تھکا تھم باہر نہیں دھرا تھا۔ جانے کس بھاری دل سے انہوں نے شا کر کی یہ تجویز مان لی۔ جانے شا کر سے پڑائی کھلے داری کا پاس تھا یا پھر وہ سنی کا دل نہیں توڑنا چاہتے تھے۔ لیکن جب تک دونوں لڑکیاں گھر سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ نہیں گئیں وہ بے چینی سے گھر کے گھنٹوں اور باہر گئی میں کس گاڑی تک کے پتھر کاٹے رہے۔ اور گاڑی کے چلتے چلتے بھی انہوں نے شا کر کو کئی مرتبہ دھرا دی ہوئی ہدایات پھر سے دوبارہ یاد دہانی کے طور پر زہر اویں۔

ہماری زندگی میں کب، کس موڑ پر کون سا حادثہ ہماری تاک میں ہے۔ یہ ہمارے دھم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ میری اپنی دانست میں

محبت سے بڑا کوئی اور عاوض ایسا نہیں جو ہماری زندگیوں میں وارد ہوتا ہو۔ اور ہم انسان اچھے سمجھو اور لاچار ہوتے ہیں کہ ایسے ہر عارضے کا انصرام فقط "کاش" کو ہی دے دیتے جاتے ہیں۔ کاش نہیں اس دن گھر پر ہی نہ ہوتا، کاش مولوی صاحب اس دن بیمار نہ ہوتے، کاش سنی انہیں لینے خود ان کے گھر نہ جاتا اور اگر چلا بھی گیا تھا تو ایمان اس کے ساتھ نہ آتی۔۔۔ کاش۔۔۔ کاش۔۔۔

اس کے بعد اس تقریب میں کیا ہوا۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ شاید میں اپنے ہوش و حواس ہی کھو بیٹھا تھا۔ دوسری بار جب میں نے اس طرف نظر میں دوڑا نہیں جہاں ایمان اور حیا کھنی بیٹھی تھیں تو وہ جگہ خالی تھی۔ میں نے بے چینی سے تمام محفل چھان ماری لیکن ایمان جا چکی تھی۔ پتہ یہ چاکر شاہرچنگہ مولوی صاحب سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ مغرب کی اذان سے قبل ان دونوں کو گھر واپس پہنچا دے گا۔ اس لیے ان دونوں نے تقریب کے خاتمے سے قبل ہی شاہرچنگہ کو واپسی کا بیڑا بگھوایا تھا۔ اور جانے کس لمحے وہ وہاں سے چلی گئی تھیں اور میں اپنی قسمت کو کوستای رہ گیا۔

لیکن جاتے جاتے وہ لڑکی جیسے میرا بہت کچھ اپنے ساتھ ہی لے گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے تک وہ پارٹی، وہ محفل جس میں چاروں طرف رنگوں کی برسات تھی، نور کا بے راقا، قہقہے تھے۔ مسکراہٹیں تھیں۔۔۔ یکا یک ہوں ویران ہو گئی تھی جیسے ایک کسمی نے اس محفل سے سب رنگ چھڑ لیے ہوں۔ یہ من سے من کا کیسا ٹانڈ ہوتا ہے کہ سینکڑوں کی بھیڑ کسی ایک کی وجہ سے اپنی ہی گنتی لگتی ہے۔ اور پھر یہاں تو قصہ ہی یک طرفہ تھا، جو کئی طوفان اٹھ رہے تھے وہ صرف میرے من میں تھے۔ ایمان تو اس سب سے بالکل بے خبر تھی، اگر لوگ جسے محبت کہتے ہیں، وہ اسی جذبے کا نام تھا جو اس وقت میرے خون کے ساتھ گردش کر رہا تھا تو کیا یہ محبت اس قدر زور آور ہو سکتی تھی کہ وہ صرف یک طرفہ ہو کر بھی کسی انسان کی زندگی کے سبھی انداز۔۔۔ سبھی اطوار بدل کر رکھ دے۔۔۔؟

☆☆☆

## 1947ء کے مظالم کی کہانی خود مظلوموں کی زبانی

ایسے خون آشام قلب و جگر کوڑا پونے والے چشم دید واقعات، جنہیں پڑھ کر ہر آنکھ پر دم ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کی خون سے لکھی تحریریں، جنہوں نے پاکستان کے لیے سب کچھ لٹا دیا اور اس مملکت سے ٹوٹ کر پھار کیا۔  
تو کھربھی صدا بلند ہوتی ہے کہ۔۔۔ کیا آزادی کے چراغ خون سے روشن ہوتے ہیں؟ ایم آزادی پاکستان کے مواقع پر کتاب گھر کی خصوصی پیش کش نوجوان نسل کی آگہی کے لیے کہ یہ وطن عزیز پاکستان ہمارے بزرگوں نے کیا قیمت دے کر حاصل کیا تھا۔  
اس کتاب کو کتاب گھر کے تاریخ پاکستان سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔



## لندن اُداس ہے

کہتے ہیں نیند سب سے بڑی چور ہوتی ہے، وہ انسان کی آدمی عمر چا لیتی ہے۔ لیکن مجھے ایسا لگتا تھا جیسے مجھ سے میری یہ چور بھی روٹی ہوئی تھی۔

جانے رات کے کس پہر کامران نے لاؤنج میں جھانکا اور مجھے وہیں آ لندن کے پاس آرام کرسی پر آنکھیں موند سے لینے دیکھ کر مجھ پر کھل ڈال گیا۔ رات پونہ بجی باغی کے درپچوں میں جھانکتے ہوئے جانے کب بیت گئی اور اس کی جگہ صبح کے اُٹھانے نے لے لی۔ رات پھر برف باری کے بعد آسمان صاف ہو چکا تھا۔ کامران نے ناشتے کے دوران مجھے آفر کی کہ وہ مجھے ریسٹورنٹ جاتے ہوئے "کننگٹن" (Kingstone) لائبریری چھوڑتا جائے گا۔ لیکن میں نے اسے بتایا کہ میں تنہا ہی گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک گھر سے نکل جاؤں گا، وہ ریسٹورنٹ چلا جائے۔ ویسے بھی اسے صبح جلدی پہنچ کر اپنے کاروبار کا آغاز کرنا ہوتا تھا۔ اور میرا اتنی صبح گھر سے نکلنے کا قلعی کوئی مول نہ تھا۔ اور پھر لندن میرے لیے کبھی بھی اچھی نہیں رہا تھا۔ ایک عجیب سی انسیت اور اپنا پن تھا میرے لیے اس شہر میں، شاید اس کی ایک وجہ اس کے موسم کی میرے آبائی شہر کوئٹہ کے موسم سے مماثلت بھی ہو سکتی تھی۔ ذمہ صرف موسم بلکہ نہ لے لندن میں جہاں اب تک تقسیم ہند سے پہلے دقتوں کی عمارتیں اور تعمیرات موجود تھیں ان میں سے بعض کی بناؤ تو ہو بہو 1935ء کے ڈھلے سے پہلے والے کوئٹہ کی عمارت کی طرح ہے۔ بنیادی وجہ یہی تھی کہ جی تو کوئٹہ تقسیم ہند سے قبل خود برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی بہت بڑی چھاؤنی رہ چکا تھا اور اسے آباد کرتے وقت انگلش ہندوؤں نے فن تعمیرات میں اینٹ کا رخ، عمارت کی جہ دہنی آٹھان اور طویل اور چوڑی سڑکوں کی کشادگی دیتے وقت شاید لندن ہی کو ڈھن میں دکھا ہوگا۔ اور پھر صرف میرے شہر پر ہی کیا مختصر ہے۔۔۔ تقسیم سے قبل اگر بڑے جن علاقوں میں بھی رہا (خاص کر سرحد علاقے) وہاں کی طرز تعمیر ایک مخصوص روایت کو ہی قائم دیتی محسوس ہوتی ہے۔ وہی لیکن کے سرخ چھت، وہی مخصوص بانگوئیاں اور آگلیٹھیاں، وہی ایک جیسے آتش دان اور ان پر بنے کارنس، ایک جیسے گڑنی کے بڑے بڑے دروازے جن پر انگلش کے نمبر سات کی شکل کے بڑے بڑے تختے کندہ ہوتے تھے۔ وہی اونچے اونچے چھت اور ان میں بنے بڑے بڑے روشن دان جنہیں کونے کونے پر بند کرنے کے لیے سی پاؤوری لگی ہوتی تھی۔ اس لیے آج بھی اگر آپ نہ انے لندن کی گلیوں سے گزریں تو آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے آپ برصغیر کے دور کی کسی بڑی چھاؤنی میں آ گئے ہیں۔

میں جب تک گھر سے نکلا تو اچھی خاصی دھوپ نکل چکی تھی۔ برف صاف کرنے والی مشین نے سڑکوں سے برف ہٹا کر کناروں پر کر دی تھی۔ برف باری کے بعد نکلنے والی دھوپ بے حد چمک دار ہوتی ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے قدرت کے ان دیکھے ہاتھ نے آس پاس کی سب چیزوں پر قلعی سی پھیر دی ہے۔ مخصوص رنگ کی پکی اینٹوں سے بنی سڑک جتنی سی رہی تھی۔ لوگوں کے چہروں پر بھی ایک خاصی چمک تھی۔ یہ موسم بھی ہم

انسانوں کی طبیعت پر کس کس طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اچھے بھلے انسان کو ہل میں خوش یا اُداس کر دیتے ہیں۔ بلا کسی بھی وجہ کے، لیکن میرے لیے تو جیسے ہر موسم میں اُداسی ہی اثر آتی تھی۔ سو لندن بھی مجھے اُداس لگ رہا تھا، چمکتی دھوپ کے باوجود، آس پاس کھلے ہوئے سے چروں کی موجودگی میں بھی ایک گہری اُداسی تھی۔

گھر سے نکل کر میں پیدل ہی تیسری گلی کے سب وے کی جانب چل پڑا۔ دھوپ کی چمک نے مجھے آنکھوں پر گہرا کالا دھوپ کا چشمہ پہننے پر مجبور کر دیا۔ کاش انسان ایسے گہرے رنگوں کے چشمے بھی بنا پا تا جو کھوں کی آنکھوں کو خیرہ کرتی دھوپ کو بھی روک سکتے۔۔۔۔۔

گلی کے اختتام پر ایک اسپینش (Spanish) لڑکی کنار پر کوئی دھن بجا رہی تھی۔ اس کے سامنے اسی کنار پر ادا سا کالا کیس Case رکھا ہوا تھا جس میں آتے جاتے لوگ چند لمحے کنار کی دل کو چھو لینے والی دھن سننے کے بعد چند سیکنڈے ڈال کر آگے بڑھ جاتے، مانگنے کا کس قدر آبرو مندانہ طریقہ تھا یہ۔ کچھ لوگ مانگتے بھی یوں ہیں کہ دینے والے کو ان کا حق لگتا ہے، اور کچھ لوگ اپنا حق بھی کچھ ایسے انداز میں وصول کرتے ہیں کہ دینے والا ہیک کی طرح دیتا ہے۔

لڑکی مجھے دیکھ کر مسکرائی اور سر کے اشارے سے مجھے سلام کیا۔ وہ اس وقت کنار پر ایک مشہور ہسپانوی گیت کی دھن بجا رہی تھی جس کے بول کچھ یوں تھے کہ ”میرے محبوب۔۔۔۔۔ اک تمہارے جانے کے بعد۔۔۔۔۔ ہر منظر اُداس ہے۔۔۔۔۔ شہر دیران ہے۔“ میں نے حیرت سے اس کنار بجانے والی لڑکی کو دیکھا۔۔۔۔۔ اُسے میرے دل کے حال کا کیسے پتہ چل گیا۔؟۔۔۔۔۔ شاید محبت کو کھودینے کے تجربے سے گزرنے والے ایسی چہروں کی تحریر ایک سی ہی ہوتی ہے۔ میرا ہاتھ جب میں گیا اور واپس پر جتنے بھی سکاس ہاتھ میں آئے، وہ بھی میں نے لڑکی کے کنار میں ڈال دیا اور خود آگے بڑھ گیا۔

سب وے میں زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ زمین و وزریوے انکسٹین مختلف روشنیوں سے رنگدار ہا تھا۔ اور آگاہ لوگ ٹرین کے انتظار میں کھڑے تھے، بھیڑ نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت دن کے ساڑھے گیارہ بجے تھے اور یہ وقت دفتری اوقات کا رکاش تھا۔ ٹرین اپنے مقررہ وقت پر ایک مخصوص سی گرج کے ساتھ سب وے میں داخل ہوئی۔ خود کار دروازے کھل گئے اور ہم سب مسافروں میں داخل ہو گئے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ انسان نے انسان کی آسانی کے لیے کیسی کیسی ایجادات کی ہیں۔ ہماری زندگی کا شاید ننانوے فیصد کچھ دوسروں کی تیار کردہ ایسی چیزوں کا مرکب ہونہ ہوتا ہے، ہوتی ہے۔ لے کر ہوائی جہاز تک سبھی کچھ جو ہمارے روزمرہ کے استعمال میں آتا ہے۔ وہ سبھی کوئی اور ہمارے لیے بنا کر گیا ہے۔ ہم صرف چند سیکنڈ خرچ کر کے ان ایجادات کے کام و سکون کے حق دار بن سکتے تھے۔ شاید اسی بات نے ان سکون کے حصول کو اس قدر مشکل بنا دیا ہے۔

لیکن سکون کا حصول صرف ان سکون سے ہی تو مشروط نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ دل کا سکون کا نکات کی ایک ان مول کیفیت ہے۔ اور اس بات کا صحیح اندازہ صرف وہی لگا سکتا ہے جس کے اپنے دل کا سکون اُسٹ چکا ہو۔ ہم انسان بھی کتنے نادان ہوتے ہیں، جب تک دل کا قرار پانے کا قابو میں ہوتا ہے۔ ہم اسے ہزاروں میں اُسٹ جانے کے لیے پھرتے ہیں، ہر طرف افشقی نگاہ کا ہنس ایک ہی حاصل ایک ہی منزل ہوتی ہے۔۔۔۔۔ کوئی دلبر۔۔۔۔۔ کوئی محبوب۔۔۔۔۔ اور جب وہی دلبر ہم سے ہمارا چین و سکون لے اُڑتا ہے تو پھر ہم اس کی ہی دُحائی دیتے پھرتے ہیں۔

انہی اُلٹے سیدھے خیالات کی پورش میں مجھے پتہ نہ چلا کہ کب شوب ٹرین میرے مطلوبہ سب دے اٹھیں میں داخل ہوئی۔ اور کب رکی۔ یہ تو اچھا تھا کہ آفری چند لمحوں میں سامنے جبرگاتے ہوئے نیون سائن پر میری نظر پڑ گئی جس پر 17 ڈانک سٹریٹ کا ہندسہ جگمگا رہا تھا۔ مجھے جیسے ہوش سا آ گیا اور میں ٹرین کے دروازے بند ہونے سے قبل ہی نیچے اترا آیا۔ بیڑیاں چڑھ کر اوپر کی سڑک تک پہنچا۔ اب یہاں سے 9 نمبری لندن کی مشہور مخصوص سرخ ڈبل ڈیکر بسوں میں سے ایک بس مجھے سیاحوں یورپی کے گیٹ تک پہنچا سکتی تھی۔

لندن بالکل ویسا ہی تھا جیسے میں اسے دو سال پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ اس بس اسٹاپ کے بالکل سامنے بوڑھا مرد کا درخت اب بھی ویسا ہی کھڑا سسکا رہا تھا جیسے مجھے پھر سے خوش آمدید کہہ رہا ہو۔ اگرچہ ایسی باتوں کا بہت دھیان رکھتے ہیں۔ صرف اس درخت کو بچانے کے لیے انہوں نے چند سال پہلے اپنے ماسٹر پلان کے نقشے میں یہاں سے گزرتی سڑک کا رخ موڑ دیا تھا کیونکہ اگر سڑک لندن ماسٹر پلان کے تحت بنی تو اس درخت کا کٹنا لازمی تھا لیکن انگلش ایک روایت پرست اور ماضی پرست قوم ہے۔ وہ اپنی یادوں کو اپنی تاریخ کو اتنی آسانی سے سخ نہیں ہوتے دیتے بلکہ اسے بچانے کے لیے جان بڑا دیتے ہیں۔ شاید اسی لیے اس قوم نے برسوں اس دنیا پر راج کیا ہے۔ سچ ہے۔۔۔ تو میں پوچھی نہیں بن جاتیں۔ اس کے پیچھے صدیوں کی تربیت اور حوادث کا عمل دخل ہوتا ہے۔

کچھ ہی لمحوں میں میری مطلوبہ سرخ ڈبل ڈیکر بس دھیمی دھیمی رفتار سے چلتی ہوئی بس اسٹاپ پر آ کھڑی ہوئی اور میں بس میں سوار ہو گیا۔ یونیورسٹی کے راستے میں میرا نہانا دوست، میرا دم راز اور میرا مہربان دریا، دریا نے ٹیوٹمز (River Thames) پر تھکا تھا۔ میرے لڑکپن کی کئی شاہیں اور چراغی کی کئی راتیں اس دریا کے کنارے لگے ہوئے خوبصورت ٹکڑی کے تنچوں پر گزری تھیں۔ وہ ہلکی دھنسیں اب میں یاد کر رہا تھا تو جیسے سب اک خواب سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دوستوں کے ساتھ کپکپکس دوڑنے سے فطرت وہ دھنکی دھنکیں، ٹیوٹمز کا پانی مجھے دیکھ دیکھ کر مستی میں جگمگے لے رہا تھا جیسے وہ میری لندن آمد سے بہت خوش ہو، بس دریا کے ساتھ بنی ہوئی چوڑی سی سڑک پر بڑھ رہی تھی اور دریا ہمارے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی بڑے آنے محلے میں جب کوئی چچھاتی کار یا بڑی گاڑی داخل ہوتی ہے تو محلے کے بچے اس گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہیں۔ ہمارے آس پاس کے موسم، درخت عمارتیں اور اس جیسے دریا۔ یہ میں کس کس روپ میں دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ چپتے ہوئے۔۔۔ کبھی روتے ہوئے۔۔۔ خوشی، غم۔۔۔ غرض ہماری زندگی کا کون سا پہلو ہے جو ہمارے ارد گرد دیکھتے اس ماحول سے پوشیدہ ہوتا ہے، شاید اسی لیے ہمیں ایسا لگتا ہے کہ یہ بھی ہمارے ساتھ ہی خوش ہوتے ہیں اور ہمارے ساتھ ہی روتے ہیں، شاید ہر موسم ہمارے اندر کے موسم سے جڑا ہوتا ہے۔

بس یونیورسٹی کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ میرا اسٹاپ آ گیا تھا۔ میں یونیورسٹی کے عظیم الشان آہنی ڈنگے کے گیٹ سے اندر بنی اینٹوں کی سڑک پر آ گیا۔ یہ بہت بڑے گھاس کے دھانوں پر مشتمل ایک ایسی عمارت تھی جس کے اندر سے دریا نے ٹیوٹمز ایک چھوٹی سی شاخ گھاس کے عظیم میدانوں کو سیراب کرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ دور دور تک بہت بڑے بڑے اور اونچے درخت ایسا تھوڑے تھے، جو اس وقت رات کی برف باری کی وجہ سے دور سے سفید لباسوں میں جلوں بوڑھے بزرگوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ دریا کے پانی کے اوپر شفاف برف کی ایک سل نمائندہ بھی ہوئی تھی جس

کے نیچے دریا کا پانی بہتا صاف دکھائی دے رہا تھا۔

یونیورسٹی کی سرکاری عمارت سفید رنگ مرمر سے بنی ہوئی تھی اور برف کے اس ماحول میں اس کے اونچے لمبے ستون اور باقی عمارت بھی برف ہی سے بنی دکھائی دے رہی تھی۔ ایڈمن ڈیپارٹمنٹ سے فارم لے کر میں نے گرو پے تھے اور میری کلاسز دونوں کے بعد سے شروع ہونا تھیں۔ پتہ چلا کہ ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ایک یہودی نژاد مسٹر آئزاک ہیں جو خود یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہیں۔ میں ان سے بھی ملنا چاہتا تھا لیکن پتہ چلا کہ وہ صبح گیا رہ بجے کی کلاس کے بعد شہر میں ہونے والی کسی تعلیمی تقریب میں چلے گئے ہیں جس میں وہ بلور مہمان خصوصی مدعو تھے۔ میرا اب یونیورسٹی میں مزید نکلنے کا کوئی جواز نہیں تھا لہذا میں اسی راستے سے واپس کی جس نے کر سب وے تک پہنچ گیا۔ دوپہر کے ڈھائی بج چکے تھے اور یہ دفتری اوقات کے مطابق دن کے کھانے کا وقت تھا۔ لہذا سب وے میں بھی صبح کی نسبت زیادہ چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے فی الوقت بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی، لیکن پھر بھی میں کافی اور ایک سینڈویچ کا ٹکچ کرنے قریبی رستوران میں داخل ہو گیا۔ قدرت نے ہم انسانوں کو ان کی کم مانگی اور بے بسی کا احساس دلانے کے لیے اس دنیا میں جن اور بہت سی چیزوں کا اہتمام کر رکھا، وہیں بھوک بھی ان مجبوریوں میں سے ایک ہے، بڑے سے بڑا قدر آور اور شہر زور اور مجبوری کے آگے بے بس ہے۔

اور عزیز سے عزیز ترین رشتہ بھی بھوک کے اس احساس کو مان نہیں سکتا۔ ہم اپنے آس پاس روز کیسے کیسے والدہ اور بچوں کو جان سے زیادہ عزیز رشتوں کو خود سے جدا ہوتا اور مرتا ہوا دیکھتے ہیں۔ ان سے جڑ سے بے بس انسان جو اس لیے خود کو بھی مٹا محسوس کر رہے ہوتے ہیں۔ جن کی بھوک عیاس سب ختم ہو چکی ہوتی ہے، جنہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس بے جان جسم کے ساتھ ان کا لاشہ بھی قبر میں اُتار دیا گیا ہے اور اب وہ کبھی اس مٹی جانتی دنیا کے ساتھ چل نہیں پائیں گے۔ جن کا ہر احساس اس لیے مٹی ہو چکا ہوتا ہے۔ لیکن 24 یا 48 گھنٹوں کی مختصر مدت کے بعد یہ معدہ انسان کو اس کی کم ظرفی، بے بسی اور مجبوری کا احساس دلانے کے لیے جاگ اُٹھتا ہے، بھوک اسے ستانے لگتی ہے۔

انسان اپنے اندر اپنے آپ سے ہی نفرت اور شرمندگی محسوس کرنے لگتا ہے کہ ابھی چند گھنٹوں پہلے ہی تو وہ اپنے اندر کتنے بڑے بڑے دعوے کر رہا تھا۔ مٹی کے ساتھ مٹی میں مل جانے کے دعوے، سب تباہ کرنے کے دعوے، لیکن سچ یہ ہے کہ انسان سے زیادہ بے بس مخلوق بھی دوسری اور کوئی نہیں۔ ہاں البتہ ایسے موقعوں پر اسی کے پیسے دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے خود ساختہ اصول اس کے کام آ جاتے ہیں اور شرم کا کچھ پروہرہ جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے ”میت کے گھر تین دن تک کھانا نہیں کچے گا۔ بھلا اس لوگ میں ان بے چاروں کو کھانے پینے کا ہوش ہی کہاں ہوگا؟ دوسرا کہتا ہے۔ ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ پہلے دن کا کھانا تو ہمارے گھر سے ہی آئے گا۔ دوسرا دوسرے دن کا اور کوئی تیسرا تیسرے دن کا وعدہ کر کے وہاں سے اُٹھ آتے ہیں۔ وہ سب جانتے ہیں کہ کبھی جب ان کے گھر میں یہ ماتم ہوگا تو تب بھی نیکیا سب اس کی دلجوئی کو وہاں موجود ہوں گے۔ اس کی شرم کا پروہرہ کتنے میں اس کی مدد کریں گے۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے۔ انسان بہترین ماحشراتی جانور ہے۔

☆☆

گھر واپس پہنچتے تک شام ہو چکی تھی۔ سورج اُٹھ رہا تھا، لگی کے بچہ کو اڑے، وہی کل والے شرارتی بچے پھر سے جج تھے اور اپنے کل کے بنائے ہوئے برف کے پتلے کی باقیات سنہٹانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ سردیوں کی شام کی دھوپ پلک جھپکتے ہی کسی قسم کے محبوب کی طرح آنکھیں پھیر لیتی ہے۔ یہ تو ایسا فنکی کی مقدور برہمنی جاری تھی، لوگوں نے اپنے اور کوٹس کے کاررو پر چڑھالیے تھے اور سانس لپٹے اور بات کرتے وقت ان کے ہونٹوں سے بھاپ نکلتی دکھائی دیتی تھی۔ گٹار بجانے والی لڑکی نے اپنا گٹار اپنے کس میں رکھ دیا تھا اور اب وہ بھی درواگی کے لیے تیار تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں مانوسیت کی ایک چمک لہرائی۔ وہ جگہ سے مسکرائی اور میں سر کے اشارے سے اسے سلام کرتا آگے بڑھ گیا۔ رات کا مران بھی جلد ہی واپس آ گیا تھا اور ہم نے سڑک کے کنارے دوسرے بلاک کے ایک چھوٹے مگر نہ سکون سے رہنے والے گھر میں کھانا کھانے پر وگرام بنالیا تھا۔ اور اب ہم اسی رہنمائی کے ایک گوشے میں اپنی بیل کے گرو پیٹھے سوپ کی چسکیاں لے رہے تھے۔ کامران نے آس پاس ٹھنسی لڑکیوں اور خواتین کا بغور جائزہ لینے کے بعد اپنی حتمی رائے صادر کر دی تھی۔ اپنے ڈریس خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ بولا "سردیوں توں سے اس امید پر شادی کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ ویسے ہی رہیں گی جیسے وہ شادی کے وقت ہوتی ہیں۔ اور عورتیں مردوں سے اس امید میں شادی کرتی ہیں کہ شاید وہ شادی کے بعد بدل جائیں گے۔ لیکن انھوں نے بعد میں دونوں کو ہی مایوسی ہوتی ہے۔

میں نے غور سے اسے دیکھا "شاید ہی لیے تم نے اب تک شادی نہیں کی۔" کامران مسکرایا، "خیر میری بات چھوڑو۔ تم یہ بتاؤ آج یونیورسٹی میں دن کیسے گزرا۔" میں نے نیکیں میرے اٹھا کر اپنے ہونٹ خشک کیے۔ "کچھ خاص نہیں۔ بس قارم ہی بھر سا، ہیڈ آف دی لیبارٹسٹ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ موجود نہیں تھے۔"

کامران بولا "تم مسز آؤٹ راک کی بات کر رہے ہو۔ آج کل اخبارات میں اس کا بڑا تذکرہ رہتا ہے۔ مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ اس جیسے کمزور بیوی نے ایک پاکستانی مسلمان کو اپنی یونیورسٹی میں داخلہ کیسے دے دیا اس سے ذرا عجیب لگتا ہے۔ مجھے کامران کی بات سن کر نفی آگئی۔ "کیوں۔۔۔ کیا وہ آدمی غور ہے جو مجھے کھا جائے گا؟"

کامران ہنسی دیا "تم ان بیویوں کی طبیعت سے واقف نہیں ہو شاید۔ یہ کبھی بھی دل سے مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں ہوئے۔ اور اس کا اندازہ ہم جیسے دیار غیر میں رہنے والے مسلمان ہی ٹھیک لگا سکتے ہیں۔ جنہیں ہر برائے کے معاملے میں ان بیویوں کی نفرت اور مقابلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور کب تو یہ ہے کہ ان بیویوں نے ہمیں برائے کے معاملے میں مکمل مات دے رکھی ہے۔"

میں نے سوال کیا "لیکن تم لوگوں نے اور یہاں کی دوسری برائے کیوں نے کبھی ان وجوہات پر غور کیا ہے جو ان بیویوں کی تھارتی کامیابیوں کا راز ہیں۔"

کامران نے گہری سی سانس لی "بات بالکل صاف ہے۔ یہودی کبھی تلخ کلامی سے کام نہیں لیتا، اور برائے کا پہلا اصول ہی خوش اخلاقی ہے۔ سخت سے سخت حالات میں بھی اس کے ہونٹوں سے چٹکی مخصوص مسکراہٹ کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ دوسری اہم وجہ ہے ایک یہودی کا دوسرے یہودی کا جھگڑا خیال رکھنا چاہیے وہ یہودی تاجراؤں میں بدترین اور جانی دشمن بھی کیوں نہ ہوں، لیکن اگر ان کا کائنات کوئی ایسی چیز طلب کرتا

ہے جو پہلے یہودی کی دوکان پر بیسرنہ ہو، جب بھی وہ خود پیدل چل کر اس خریدار کو اس جانی دشمن یہودی کے پاس لے کر جاتا ہے جہاں اسے وہ ضرورت کی چیز مل سکتی ہو۔ یہودی کبھی کبھی غیر یہودی کو متعارف نہیں کرواتا۔ یہی اس یہودی تجارت کے پسینے کا راز بھی ہے۔"

میں کامران کے خیالات سے کسی حد تک شفق بھی تھا لیکن میرے خیال میں اس نے یہودی تاجروں کی سب سے بڑی خصوصیت کا تذکرہ اب تک نہیں کیا تھا۔

"تم سب سے اہم خصوصیت کا تذکرہ کرتا بھول گئے ہو۔ وہ ہے ایمان داری۔۔۔۔۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے تاجرانے خوش اخلاق اور خطہ سے مزاج کے نہیں ہوتے۔۔۔۔۔ یہ بھی درست ہے کہ ہم ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے سے بھی کبھی باز نہیں آتے۔ ہمارا اصول ہے کہ اپنا فائدہ ہونہ ہو۔۔۔۔۔ لیکن دوسرے کا نقصان ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن ان سب سے زیادہ بڑی وجہ ہے بے ایمانی۔ اور یہودی تجارت میں بے ایمان نہیں ہوتے۔۔۔۔۔ میرے خیال میں ان کی کامیابی کا اصل راز یہی ہے۔"

ہم دونوں کھانا کھا چکے تھے اور آپ پیدل ہی واپس اپارٹمنٹ کی طرف روانہ تھے۔ کمرس کا تہوار قریب آ رہا تھا لہذا آس پاس خریداروں کی چہل پھل بڑی بڑی جارہی تھی۔ جاہلیا کمرس کے ٹرانسپورٹ میں درخت مخصوص چلنے بچھنے قہقروں سے بچے بھللا رہے تھے۔ لوگ سردی سے بے نیاز ہو کر خود کو گرم کپڑوں سے ڈھکے ہوئے۔ آس پاس کی جنگل گرتی دوکانوں سے خریداری کر رہے تھے۔ شاید دنیا کا ہر تہوار ایک سماں ہوتا ہے۔ کبھی تہواروں کا تعلق دل کی خوشی سے ہوتا ہے۔ اور کبھی تہواروں کے اصل شوقین بچے ہوتے ہیں۔ شاید اسی لیے اس وقت بھی لندن کے اس بارونق بازار میں زیادہ تر تعداد بچوں کی ہی تھی۔ مجھے یاد ہے جب ہم چھوٹے تھے تو عید کی رات یا چاند رات سے کئی راتیں قبل ہی ہماری نیند جیسے اڑتی تو جاتی تھی۔ اور عید کی رات تو آنکھوں ہی آنکھوں میں صبح ہو جاتی تھی۔ عید کی لٹنے کی خوشی اور پھر اس سے بھی زیادہ اس عید کی کوخرج کرنے کی خوشی۔ لیکن عید کا پورا دن قحط سے یوں نکل جایا کرتا تھا جیسے بندھلی سے ریت۔ شاید چیزوں یا تہواروں کی خوشی کا تعلق ان کی کیا بیانی اور قہقروں سے ہونے سے بھی وابستہ ہوتا ہے۔ آس پاس پھرتے لوگوں کے چہروں سے خوشی ٹپک رہی تھی۔ یہ چہرے بھی کیسا آئینہ ہوتے ہیں۔

گھر پہنچتے ہی کامران بستر میں گھس گیا کیونکہ اسے اگلی صبح جلد کھانا تھا، آج اس نے ایمان کے موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ ہم دونوں بچپن سے ایک دوسرے کی عادتوں سے خوب واقف تھے۔۔۔۔۔ وہ جانتا تھا کہ میں جب سنبھل جاؤں گا تو خود ہی اسے سب بتا دوں گا، اس سے پہلے مجھ سے کچھ پوچھنا فصول ہے۔ میں نے لامت بند کرنے سے پہلے بستر کی سائڈ ٹیبل پر رکھے رسالوں کی ورق گردانی کی تاکہ کام کو کشش کی لیکن پھر آخر کار جی بجا دی، لیکن کمرہ اندھیرا ہوتے ہی دماغ کے درمچے روشن ہو گئے۔ یادیں نئی ہوں یا بھلی، دونوں صورتوں میں یاد ماضی عذاب ہی تو ہے۔

☆☆☆

## ایمان

سنتی کے پہلے پارے کی ڈھائیے تقریب تو گزرتی لیکن اس کے بعد جیسے سہرے شب دروڑ ہی بدل گئے۔ میں خود جان نہیں پار ہوا تھا کہ یہ بے پائی کیسی ہے؟۔۔۔ سب کچھ بصر ہونے کے باوجود میں اس قدر تہمتی دست اور بے بس سائیوں ہوتا جا رہا ہوں۔ دل کہیں بھی تو نہیں تنگ پاتا تھا۔ بھیڑ میں ہوتا تو لوگوں سے دور بھاگتا، تنہا ہوتا تو گھبرا کر چپے لاؤنگ میں جا بیٹھتا۔ مولوی صاحب کی پیاری نے بھی طول چلا لیا تھا۔ پتہ چلا کہ اس دن کی بے آرا می کی وجہ سے بخار زور چلا گیا تھا۔ لہذا انکا پورا بھٹہ وہ سنتی کو درس دینے نہ آ سکے۔ اور جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا جیسے ان کے نہ آنے سے میری کوئی بہت اہم اور بہت قیمتی چیز مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہے۔

سیاحی ہٹنے کی ایک گرم سہ پہر کی بات ہے۔ میں گھر کے دالان میں بیڑوں کے نیچے ڈلی ہوئی آرام کر سیوں میں سے ایک پر آ گھسیں موندھے پڑا ہوا تھا۔ گرمیوں کی دو پہر میں بھی کتنی لمبی ہوتی ہیں۔ میں لگتا ہے جیسے سورج ایک ہی جگہ تنک کر رہ گیا ہے یا شاید مجھے جیسے شوریدہ سروں کوئی ان کی بے جا طوالت سے اختلاف تھا، جن کے دلدار کہیں لہتے ہوں گے شاید وہ ان سے لمبی ملاقات کے لیے ایسی سہ پہروں کی ڈھانچیں مانگتے نہ جھکتے ہوں

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اندر سے سنتی میاں شاکر کڈرا بیورو کے ساتھ شور مچاتے اور اچھٹنے کو تے برآمد ہوئے۔ شاکر کے ہاتھ میں دو بڑے بڑے قرماں تھے اور سنتی کے ہاتھوں میں پھلوں سے بھری توکری۔ سنتی نے مجھے دالان میں دیکھا تو بھاگ کر میرے پاس آیا۔

”چاچو۔۔۔ دیکھیں میں نے کتنی بہت سی آگس کریم جمع کی ہے۔“ سنتی نے شاکر کے ہاتھوں میں پکڑے جہازی ساز کے قرماں کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے سنتی کے کان پکڑے: ”ہوں۔۔۔ تو یہ بات ہے۔ دو ہر کو کما سے بچھپ کر چنگ مٹائی جا رہی ہے۔“

سنتی جیسا ”نہیں چاچو۔ ماما تو دادی کے ساتھ کب کی شاپنگ کے لیے جا چکی ہیں۔ یہ سب کچھ تو ہم مولوی صاحب کے لیے لے جا رہے ہیں۔“ مولوی صاحب کا نام سنتی ہی میرے کان کھڑے ہو گئے۔ ”کیا مطلب؟ کیا مولوی صاحب کو ڈاکٹر نے بخار میں پینٹ بھر کر آگس کریم کھانے کا کہا ہے؟“

سنتی ہنس پڑا: ”افوہ۔۔۔ چاچو آپ بھی۔۔۔؟“ مولوی صاحب کے لیے تو ہم یہ پھل لے کر جا رہے ہیں۔ آگس کریم تو ایمان آبی اور حیا باجی کے لیے ہے۔۔۔ اب سمجھئے۔“ اسے میں شاکر گڑ گڑایا: ”ماما بابا۔۔۔ آپ ہی سمجھاؤ؟ سنتی میاں کو۔۔۔ اگر سچا مویاں کو پتہ چلا تو وہ بہت ناراض ہو جائیں گے لیکن یہ سنتی میاں تو مستقل ضد کیے جا رہے ہیں، گھر میں اس وقت کوئی دوسرا بڑا بھی نہیں جس سے ہم اجازت لے سکیں۔“

سنتی نے منہ ہموار ”مولوی صاحب نے ہمیں پڑھایا ہے کہ جب کوئی بیمار ہو تو اس کی عیادت کے لیے جانا چاہیے۔ اس سے ثواب ملتا ہے۔ پھر ثواب کے کام کے لیے کسی سے پوچھنے کی کیا ضرورت؟۔۔۔ ہے ہنسی چاچو۔“

پھر جیسے کسی خیال سے سنتی کی آنکھیں اچنے آپ ہی چمکنے لگیں۔ اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں تاہم بی چاچو۔“

ہم جلدی واپس آ جائیں گے۔" میرا دل اچھل کر طلق میں آ گیا۔ یوں لگا جیسے سنی نے میرے دل کی بات پڑھ لی ہے۔ شاکر نے بھی فوراً سنی کا ساتھ دیا۔ "ہاں تمنا دیا۔۔۔ آپ ساتھ چلیں گے تو میری بھی کچھ بچت ہو جائے گی۔ ورنہ آپ سہا دیاں کے غصے سے تو واقف ہیں۔"

اب تو سنی نے باقاعدہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا۔ نتیجتاً ہم تینوں گاڑی میں سوار ہو گئے اور چلتے ہوئے گیٹ پر وہاں کوٹھا کرنے بنا دیا کہ سنی اپنے میڈی چاچو کے ساتھ کہیں گھومنے جا رہا ہے۔ گھنٹہ بھر میں واپس آ جائیں گے شاکر نے جان بوجھ کر شاید مولوی صاحب کے گھر کا تذکرہ نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ میرے گھر والے ایسی باتوں کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ وہ امیروں اور غریبوں کے درمیان فاصلے کے قائل ہیں۔ لیکن سنی کا مقصود انہیں انہی تک زمانے کی ان منافقتا نذر کیوں سے کوسوں دور تھا۔ رہی میری بات، تو مجھے شاکر اس عمر سے جان تھا جس میں اب سنی تھا۔ خود میں بچپن میں اسکول سے واپس پر شاکر سے ایسی ہی باتیں کرتا تھا۔ کبھی اسکول کے سامنے کھڑے ہوئے ٹیپے سے برف کے خنڈے لگے لگائے کی فرمائش، کبھی ایک مخصوص ریزہ سنی کے بس میں تک اور برف میں بھی دودھ کی تلیاں کھانے کی ضد، تو کبھی سر پہ قالوں کی ڈوگری رکے، آواز لگاتے بوڑھے باپ سے قالے دانے کی فرمائش، شاکر گھر والوں سے ٹھپ کر میری ضدیں پوری کرتا جاتا اور جب کبھی میرا لگہ زراب ہوتا تو امی جبر سے بڑبڑاتیں۔ "موس نے تو کبھی باہری کوئی چیز چسکی بھی نہیں۔" اور جب میں اور شاکر امی اور گھر کے فیملی ڈاکٹر سے نظریں چرا کر مسکراتے۔ گھر میں دامد میں ہی تھا جس سے شاکر اپنے دل کی بات کھل کر کر سکتا تھا۔

جیسے جیسے گاڑی مولوی صاحب کے گھر سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ وہ پیسے دے میرا دل جیسے دھڑکنا بھولتا پارہا تھا۔ چالنے یہ کیسی کیفیت تھی۔ مجھے زندگی میں پہلی بار شاعروں کے وہ سارے شعر اور قصیدے جواہروں نے اپنے کسی محبوب کے گھر کے راستے کے پارے میں کبے تھے، دیکھا ایک یاد آنے لگے تھے، سچ تو یہ ہے کہ اگر اس وقت میں ذرا سی کوشش کرتا تو ایک آدھ شعر تو میں خود بھی کہہ ڈالتا۔ شاید ہم سب کے اندر کہیں نہ کہیں ایک شاعر چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ بس اسے ذرا اک تحریک ملے گی کہ بات ہے۔ لہذا خود بخود ذہن دل میں وارد ہونے لگتے ہیں۔ قالے جڑنے لگتے ہیں، روئیں خود بخود بولی جاتی ہیں اور شعر سرزد ہونے لگتے ہیں۔

گاڑی شہر کے پڑانے جیسے میں واقع ایک چھوٹے سے محلے کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔ حسب معمول محلے کے میدان میں چند بچے گھر والوں سے نظر ہجرا کر رہے، ہیرا کو اپنا گیند بالے آئے تھے اور کرکٹ کا فیلڈ جاری تھا۔ گاڑی کے داخلے پر سب بچوں کی توجہ گاڑی کے جانب مبذول ہو گئی۔ چند ایک بارہویں اور حیر ہویں کھلاڑی نما بچوں نے کچھ دیر تک گاڑی کے ساتھ دوڑ لگائی۔ گاڑی کچھ کم گانوں کی دوری پر تھکاڑوں کے سامنے سے گزرتی ہوئی ہمیں کومز گئی اور دوسری لگی میں کونے کے ایک مکان کے سامنے جا کر رک گئی۔ جانے کیوں میرا حال کچھ ایسا تھا کہ جیسے کالو تو بدن میں لہو نہ ہو۔ کیسا عجیب سا احساس تھا۔ صرف ایک دیواری کی دوری پر وہ ڈانچیں کھیں اٹھ بھر رہی تھی۔ اور یہ جو سامنے نکلنے لگا انا سارو دائرہ تھا۔ جانے کتنی بار اس کے کول ہاتھوں نے اس کے کولڑوں کو تھما ہوگا اور یہ لگی۔۔۔ یہ راستہ۔۔۔ جانے کتنے بار اس کے ٹانگ قدم ان راہوں پر پڑے ہوں گے۔۔۔ اس فضا میں اس کی باتیں۔۔۔ اس کی جلتے جیسے ہانسی جانے کتنی بار گونجی ہوگی۔۔۔ یہ چھوٹا سا محلہ۔۔۔ یہ بچی اینٹوں سے بنی لگی یک دم ہی مجھے دنیا کی سب سے حسین جگہ کیوں لگنے لگی تھی۔۔۔ کسی ایک انہی کی موجودگی اس پاس کے پچھلے نگاروں کو اس قدر رنگین کیسے ہا سکتی ہے؟

میں انہی خیالات میں گم تھا۔ سنی اور شاکر گاڑی سے اتر کر مولوی صاحب کے گھر کے اندر چا پکے تھے۔ شاکر نے مجھے بھی اترنے کی





کہاں کی روایت ہے بھلا۔" مولوی صاحب کا بس نہیں چلی رہا تھا کہ وہ ہمارے لیے کچھ چاہیں۔ چاہتے ہیں کہ اسے طرز کی روایتی خوش دہری ہم جیسے امیروں کی بڑی بڑی کھوپڑیوں اور حلیوں سے کہاں عائب ہوتی جا رہی تھی۔ ہمارے لاکھ مع کرنے کے باوجود بھی انہوں نے چاہتے اندر جا کر کیا کھسک پھسکی کہ چند لمحوں میں ہی باہر کی طرف بے غصت خانے سے مختلف شیشیاں گھیر خوشبوؤں اور مہک کے ساتھ ساتھ چوڑیوں کی جلی ہی کھٹک اور برتنوں کے کھڑکھڑانے کی آوازیں آنے لگیں۔ نہیں نے مولوی صاحب کو دکھا۔

"آپ کوئی کھلف نہ کریں، ہم بتاتے ہی گھر سے نکل آئے ہیں وہاں سنی کی مہاجر مٹان ہوتی ہوں گی۔"

مولوی صاحب پر کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ "میاں غریب کی مہمان نوازی کیا اور اس کا کھلف کیا؟"

معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کی وہی صاحب زوایاں ہیں۔ کوئی ترید اور ٹوٹاؤ نہیں تھی۔ اہل بیت ان کے مرحوم بڑے بھائی کا ایک بیٹا تھا جو بچپن سے مولوی صاحب کے یہاں ہی پلا بڑھا تھا، عبد اللہ صرف نام کا ہی عبد اللہ نہ تھا۔ بلکہ اپنے اعمال سے بھی اس نے اپنے آپ کو مولوی عظیم کا صحیح معنوں میں چاہیں ثابت کیا تھا۔ وہ انہی کی تربیت کا نقش ثانی تھا۔ مولوی صاحب جس مسجد میں نماز پڑھتے تھے۔ وہیں عبد اللہ ہی ہمیشہ ان کی تعمیر دیتا تھا۔ بلکہ اب تو زیادہ تر مولوی صاحب کی طبیعت خراب رہنے کے باعث عبد اللہ ہی مسجد میں اذان دیا کرتا تھا لیکن اس وقت وہ مجھے آس پاس نہیں دکھائی نہ دیا۔ کچھ دیر بعد اندر کے دروازے کی طرف سے بجلی ہی آہٹ ہوئی جیسے کوئی دروازے پر آ کر کرا جو۔ مولوی صاحب جلدی سے اٹھ کر دروازے سے اندر چلے گئے۔ کچھ چڑیاں کھٹکنے کی آواز اور وہی سی چند سرگوشیاں سنائی دیں اور مولوی صاحب ایک ایک کر کے تین چار خزانہ اندر اٹھائے۔ میں اور شا کر بس "ارے، ارے،" ہی کرتے رہ گئے۔ چند منٹوں میں ہی ان لوگوں نے کیا کچھ اہتمام کر ڈالا تھا۔ شام کی چائے کے ساتھ جو کچھ بھی لوازمات ہو سکتے تھے۔ وہ سب کے سب حاضر تھے۔ گھر کا بنا ہوا پیڑ کیک، سوسے، اٹلی کی مٹنی، زعفران سے لگی بالائی، کاجر کا حلوہ اخروٹ سے بنی ہوئی مٹائی اور چائے کیا کیا۔؟

میرے ساتھ بچپن سے ہی ایک عجیب سا مسئلہ تھا، میں کسی کے سامنے کچھ کھاتے ہوئے بے حد شرم محسوس کرتا تھا۔ اور خاص طور پر اگر کوئی اجنبی سامنے بیٹھا ہو تو مجھ سے کچھ لگانا محال ہو جاتا تھا۔ چاہتے میرے دل میں بچپن سے یہ بات کیوں جھنڈی گئی کہ کھاتے ہوئے انسان کچھ معزز دکھائی نہ دیتا ہوگا۔ وہی مسئلہ اس وقت بھی درپیش تھا لیکن مولوی صاحب کے پُر خلوص اصرار کے سامنے میرے اندر کی اس انزلی کو زوری کی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔ مجھے مجبوراً سب کچھ ٹھوڑا ٹھوڑا چھمکا پڑا۔ اور جی یہ ہے کہ یہ جس کے ہاتھ کا بھی نہ تھا۔ لا جواب تھا۔ میری زبان اس ڈالنے کو کبھی نہیں بھلا پائے گی۔ تباہ رہے کہ یہ سب گھر ہی کا بنا ہوا تھا کیونکہ اتنی جلدی باز رہے یہ سب کچھ مگھوا اور یہ سب اہتمام ممکن نہیں تھا۔ لیکن یہ کون ہو سکتا تھا۔؟۔۔۔ گھر میں تین عورتیں موجود تھیں۔ مولوی صاحب کی بیوی اور ان کی دو بیٹیاں۔۔۔۔۔ کچھ تو کچھ ضرور اس کے ہاتھ کا جادو بھی شامل ہوگا ان سب لوازمات میں۔۔۔۔۔ یہی سوچ کر نہیں ہر چیز اٹھا کر چھمکتا رہا۔۔۔۔۔ اور پھر شا کر نے جیسے میرے دل کی آواز کو زبان دے دی۔ وہ مولوی صاحب کی طرف متوجہ ہوا۔ "اب کسی طبیعت سے بھابھی کی مولوی صاحب۔۔۔ گھر کا درد کچھ کم ہوا یا نہیں۔"

مولوی صاحب پر بیٹائی سے بولے، "کہاں شا کر میاں۔۔۔ بڑھاپا خود ہی سب سے بڑی بیماری ہوتا ہے۔ آدم سے یہ نیت نئی بیماریاں۔۔۔ اب تو زیادہ تر آرام ہی کرتی ہیں۔ گھر کا سارا کام کاج بھی بچیوں نے ہی سنبھال رکھا ہے۔"

تو گویا میرا اندازہ درست تھا۔ یہ سب کچھ اسی مشہور طراز کے ہاتھوں اور نگرانی کا کمال فن تھا۔

چائے پینے کے بعد شا کر نے میری طرف سے اجازت چاہی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں حسب معمول اور حسب عادت ان کی مہمان نوازی سے اکتا چکا ہوں گا۔ شا کر کے لیے تو یہ بات بھی باعث حیرت ہوگی، کہ میں اتنی دیر سے بنا کچھ کہے یہاں کیسے بیٹھا رہ گیا۔ جب کہ مجھے اس وقت یوں لگا کہ جیسے ابھی چند لمحے پہلے ہی تو ہم یہاں آئے تھے۔ ابھی تو میں نے کھل کر اس گھر کی فضا میں سانس بھی نہیں لیا تھا۔ آخر شا کر کو کس بات کی جلدی تھی؟ کچھ دیر تو اور بیٹھا رہتا۔ بہر حال اب تو تیر کمان سے نکل ہی چکا تھا۔ شا کر جانے کے لیے کھڑا ہو چکا تھا۔ مجبوراً مجھے بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ مولوی صاحب ہماری آمد پر نہایت ممنون تھے۔ نہ شکر یہ ادا کرتے کرتے ان کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ میں نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں قلبی دی اور انہیں احساس دلایا کہ وہ ہم سب کے لیے کقدر قابل احترام ہیں۔

ہم سب کمرے سے نکل کر گھن میں آ گئے۔ میرا دل جیسے کسی نئے خطوں میں چکر کر رہا تھا۔ ہم واپس جا رہے تھے۔ جانے پھر کبھی وہ بارہ یہاں آئے گا ہو یا نہ ہو۔ کاش میں اس کی ایک جھلک دیکھ پاتا، کاش۔۔۔۔

اچانک پلٹے پلٹے شا کر گھن میں رک گیا اور اس نے سنی کو آواز دی جو ابھی تک زنان خانے میں ہی تھا۔ بے احتیاطی طور پر میری اور مولوی صاحب کی نگاہ بھی اسی طرف اٹھ گئی جہاں سے سنی کے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہم سب ہی گھن میں رک گئے تھے۔ اور پھر اچانک ہی سنی دوڑتا دوڑتا دروازے سے برآمد ہوا۔ چند لمحے کو کھڑکی کی چالیوں کے پرے دروازے پر ڈولی ایک چلن ڈراویر کھلتی اور مجھے یوں لگا کہ جیسے میری تمام زندگی کا مقصد ہی آج پورا ہو گیا ہو۔ ہاں۔۔۔ وہ وہی تھی۔ دروازے کی اوٹ سے منکراتے ہوئے سنی کو ہاتھ ملا کر خدا حافظ کہتی ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی چھوٹی بہن اس سے ہنسی کھڑکی کھڑکی تھی۔ دروازے پر ہاتھ پڑا رہی تھی۔ یہاں پر تھکے والی بہنوں کا رشتہ بھی کتنا عجیب ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ دونوں کے بس جسم ہی ٹھیکہ ہیں، ورنہ دونوں کا ذہن اور دل ایک ہی ہے۔ ایک سا سوچنا، ایک سا بولنا، ایک سا پہننا۔۔۔ میں نے تو ایسی نہیں بھی دیکھی ہیں جو بیک وقت ایک ہی سنی کی محبت میں جتا بھی رہی ہیں۔

اس نازنین کا یہ ہلو بھی بس چند ساتھوں کا ہی تھا۔ جیسے ہی اُسے احساس ہوا کہ ہم صحن میں کھڑے سنی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ دو فوراً گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ لیکن اسی سماعت قدرت مجھ پر شا کر اپنی ہر مہربانی لانے پر تل گئی تھی۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے بھی اس کی نگاہ میری پے قرار لگا ہوں سے نکلی رہی گئی۔ ایک لمحے میں چند چنگاریاں انہیں اور میرے پہلے سے تار تار ہوئے دامن کو جا کر خاکستر کر گئیں۔ کیا کیا تھا اس ایک نظر میں۔۔۔؟ بیکارگی، خوف، شرم و حیا، اپنی لاپرواہی کی گھنجاہٹ۔۔۔ اور نہ جانے کیا کیا۔۔۔

دنیا میں شاعر اور ادیب بہت سے رشتوں کو بیان کرتے سنے گئے ہیں۔ لیکن نظر سے نظر کے رشتے کو اس وقت جتنی شدت سے میں بیان کر سکتا تھا یہ میں ہی جانتا تھا۔ زمانے بھر کی بے چاریاں، لکھ اور بے لکھی میرے اس ایک بل کے نظر کے رشتے میں مقید تھی۔

ہم اس کے گھر سے تو باہر نکل آئے لیکن مجھے ایسا لگتا تھا کہ جیسے میں اپنی روح وچہ اس چلن کے پیچھے کہیں چھوڑا پا ہوں۔ سنی نہ جانے راستے بھر مجھے اور شا کر کو کون کون سے قصے سناتا رہا۔ لیکن میں سولے ہوں ہاں کے اور کچھ جواب نہ دے پایا۔ ہم نے گھر والوں کے سامنے مولوی صاحب کے یہاں جانے کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ زندگی بھر سے اپنی ڈگر پر روانہ ہو گئی لیکن شاید میری زندگی کا زواہیسا دن سے مکمل بدل گیا تھا جس

دن ہم مولوی صاحب کے گھر گئے تھے۔

میں جنھوں ایک ہی جگہ گم سم جیٹا رہتا تھا۔ لیکن مجھے پہروں کے ڈھلنے کا اک ذرا احساس بھی نہ ہوتا۔ دوستوں کی سنگت اور محفل چھوٹ گئی تھی اور مجھے سب کچھ ایک دم ہی بے معنی سا لگنے لگا تھا۔ میرے اندر کی اس تبدیلی کو سب گھروالوں نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ امی ایسے موقعوں پر فوراً ایلیجینسی، پھر ہومیو پیتھی اور پھر روحانی علاج کی طرف منوج ہو جاتی تھیں۔ باپا نے حسب معمول ایک لمبی سی ہنگامی بھری اور مجھے آپ دو اب دلنے کا مشورہ دے کر پھر سے اپنا ناپ چپے میں مشغول ہو گئے۔ میری بھابھی نے فوراً ہی کو مشورہ دیا کہ ان کی چھوٹی بہن کا رشتہ میرے لیے مانگ لیا جائے کیونکہ میری تہائی ڈور کرنے کا یہ واحد اور بہترین حل وہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ امی کو دے چکی تھیں۔

میرے ساتھ بچپن سے ایک اور مسئلہ بھی درپیش تھا۔ مسئلہ کیا تھا کہ جب محمدی تھا۔ بچپن میں ہمیں کی ہر پہلی جمعرات کو شہید بخار میں جلا ہوا جاتا تھا۔ دنیا کے علاج کروائے گئے مرنے بھر کے ڈاکٹرز مجھے دیکھ گئے پر یہ بیماری کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ پھر میری جینیٹک خالہ جو دوسرے شہر میں رہتی تھیں اور امی سے چھوٹی تھیں، انہوں نے امی کو کسی نظر آجائے والے عامل سے لٹے کا کہا۔ ہمارے ماڈرن گھر میں بھلا ایسی جینیٹک خالہ جو دوسری باتوں کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ گمشدہ صاحب کو فوراً جلال آ گیا اور امی کو فیک شاک لیکچر سننے کو مل گیا۔ لیکن پھر خالہ خود ہی ہمارے گھر آ دھنیں اور بابا سے چسپ کر دو مجھے اور امی کو کسی بزرگ کے پاس لے گئیں جنھوں نے بغور میرا معائنہ کیا اور امی کو بتایا کہ میں روحانی طور پر اندر سے بے حد کمزور ہوں لہذا مجھے ساری زندگی بھر بدکا خطرہ لاحق رہے گا۔ انہوں نے مجھ پر کہہ دیا کہ وہ کیا اور ایک کالا دھکا مجھے گلے میں پہننے کے لیے دیا۔ ساتھ ہی امی کو تاکید کی کہ ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو چاہے خود یا چاہے کسی اور کے ذریعے کچھ صدقہ اور نذر و نیاز وغیرہ دے دیا کریں۔ خود ان بزرگ نے کوئی نذرانہ قبول نہیں کیا۔ ایک آدمہ ماہ تک قوامی کو یہ سب یاد رہا، پھر انہوں نے اپنی مصروفیات کی وجہ سے شاکر کی یہ ڈیوٹی لگا دی کہ وہ کچھ پانٹ دیا کرے۔ شاکر اب تک یہ ڈیوٹی نبھا رہا تھا۔ حالانکہ امی شاید میرے بچپن کی وہ بیماری بھول بھال چکی تھیں۔ البتہ مولوی صاحب کے گھر سے واپسی کے بعد میری جو حالت رہنے لگی تھی اس نے انہیں میرے بچپن کی بیماری کی یاد دلادی تھی۔ فوراً خالہ سے رابطہ کیا گیا اور خالہ نے فوراً ہی قون پر ہی تین چار تیر بہدف نئے تجویز کرو دیے۔ لیکن میرے دل کی حالت کوئی نہیں جانتا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میری زندگی کی ہر خوشی، ہر حاصل کا محور صرف اور صرف ”ایمان“ بنی جا رہی تھی۔

چمک رہا ہے بدن پر لبہ سے پیرا بہن  
ہماری دیکھو تو اب حالت رو کیا ہے

(غالب)

☆☆☆

## یہودی

ایک پُرانی کہادت ہے ”جو یاری کرے گا، وہ شب بیداری بھی کرے گا۔“ سو لندن میں میری یہ دوسری رات بھی شب بیداری کی نظر ہو گئی صبح کا سران کسی بڑ تال کی وجہ سے فارغ تھا، لہذا اس نے مجھے یونیورسٹی کے گیٹ پر ڈراپ کروایا۔ نوٹس بورڈ سے پتہ چلا کہ آج سر آ نرک ہینڈ آف دی ایڈیٹورسٹ ملے آتے والے اسٹوڈنٹس سے ہال نمبر تین میں بذریعہ لکچر خطاب کریں گے۔ سو سبھی ملے آئے والوں کا رخ پال نمبر تین کی طرف ہی تھا۔

بچپن میں ایک ٹی وی سیریل ہم سب بچے بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ نام تھا ”آخری چٹان“ اس میں ایک یہودی کریکٹر کا نام ڈیوڈ تھا۔ بچپن سے میرے دل میں یہودی شخص کی یہی ایک شبیہ بچپن ہی گئی تھی۔ جب کبھی کوئی کہیں ہی یہودی کی بات کرتا تو وہی بچپن سے دل میں نقش ہوئی صورت لگا ہوں کے سامنے آ جاتی تھی۔ جس دن سے مجھے پتہ چلا تھا کہ ہمارا ہینڈ آف وی ڈیٹورسٹ بھی ایک یہودی تھا تب سے اس کی بات کرتے وقت ایک مخصوص ٹیلے کا یہودی میری تظروں کے سامنے آ جاتا۔ دہلا پکڑا سا، چہرے پر یہودیوں کی خاص مشابہت والی واڈھی، سر پر چھوٹی سی سفید ٹوپی، لمبا سا چو، تیز خیر آنکھیں کھمانے والا اور بہت قول کر بولنے والا شیخ نما شخص۔۔۔۔

کسی سر آ نرک کو دیکھنے کے بعد میرے خیالات کو بہت زیادہ جنس تو تھوڑی بہت نہیں ضرور لگی۔ یہ تو ایک ایڈورن صلیے کا شخص تھا۔ عمر پچاس سے اوپر، جن پر بہترین اور قیمتی سوٹ، آنکھوں پر نظر کا پارکسٹ، بے حد نرم و گھٹا سا شخص۔ اس دن میرے ذہن میں سے میرے بچپن والی یہودی کی شبیہ نکل گئی اور اس کی جگہ اس نئی تصویر نے لے لی۔ البتہ ایک مماثلت ضرور تھی کہ سر آ نرک کے ہاتھ میں بھی ایک چھوٹی سی شیخ موجود تھی جسے وہ شاندار اپنی عادت کے مطابق کبھی ہاتھ میں کھاتے اور کبھی جیب میں ڈال رہے تھے۔ محاشیات کی اس کلاس میں تقریباً چونتیس کے قریب طالب علم تھے جن میں لڑکوں سے لیا وہ تعداد لڑکیوں کی تھی۔ سر آ نرک کے ابتدائی لیکن پُر اثر سے لکچر کا آغاز ہوا۔ شروع میں انہوں نے اپنا تعارف کروایا اور پھر محاشیات سے متعلق چند بنیادی باتیں بتائیں۔ کچھ لکچر دہرائی کے ڈسٹن کے چارے میں بیان کیا اور آخر میں ہم سب سے تعارف کروانے کو کہا۔ مجھے رول نمبر 17 ملا تھا اور اسی دن مجھے یہ بھی پتہ چلا تھا کہ اس یہودی کلاس میں ایک نہیں ہی اکٹلا مسلمان طالب علم ہوں۔ میں نے اپنی باری پر اندھ کر جب اپنا نام پکارا اور مذہب اسلام بتایا تو مجھے محسوس ہوا کہ کچھ دیر کے لیے تمام کلاس پر شاننا سا چھا گیا ہے۔ شانندہ یہ میرا وہم ہی ہو لیکن پھر سر آ نرک نے مجھ سے میری کچھلی تعلیم اور ڈگریوں وغیرہ کا پوچھ کر سلسلہ آگے بڑھا دیا۔ آخر اسٹوڈنٹس کے تعارف کا سلسلہ ختم ہوا اور سر آ نرک نے ان اختتامی جملوں کے ساتھ اپنا پہلا لکچر ختم کیا۔

”مائی ڈیئر اسٹوڈنٹس۔۔۔ ازل سے لے کر اب تک۔۔۔ اور پھر شانندہ بد تک ہمیشہ دنیا کے اعلیٰ ترین نظریات کو اوسط درجے کے

ذہنوں کی طاقت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ یاد رکھیے۔۔۔ جس نے کبھی غلطی نہیں کی۔۔۔ اس نے کبھی کچھ نہ کرنے کی بھی کوشش نہیں کی ہوگی۔۔۔ اس لیے غلطی نہ بنانے اور دنیا نظریہ پیش کرنے میں کبھی غلطی سے کام نہ لیجئے گا، ہمیں غلطی اور اوسط درجے کے ان ذہنوں کی طاقت کے ڈر سے بہت آگے نکھنا ہوگا۔ میں ایک بار پھر آپ سب کو اس ادارے میں خوش آمدید کہتا ہوں۔۔۔ مکمل سے ہم باقاعدہ کلاسز کا آغاز کریں گے، گلدڑے۔۔۔

سرا نرنگ اسٹیج سے اتر کر چلے گئے۔ ساری کلاس نے ڈیسک بجا کر ان کی تقریر اور خیالات کا خیر مقدم کیا۔ کچھ یہ ہے کہ سرا نرنگ کی باتوں نے مجھے بھی خاصا متاثر کیا تھا۔ مجھے کامران کی ان سے کچھ کر رہنے کی بات یاد آگئی، اور میرے لبوں پر خود بخود ایک مکی سی مسکراہٹ ابھرا آئی۔ کامران نے وہ پہر کو داپھی پر مجھے پک کرنے کا کہا تھا اور ابھی اس کے آئے میں پورے دو گھنٹے باقی تھے۔ سوال سے باہر نکل کر میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ کس طرف کو نکلا جائے۔ پھر میری نظر دور پڑے ان تھوڑے پرگنی جو یونیورسٹی کے درمیان سے گزر رہی تھیں (جو کہ دریائے ٹیڑ کی ای ایک شاخ تھی) کے کنارے تھوڑے تھوڑے خالصوں پر لگائے گئے تھے۔ اس طرف آبی پرندوں کے غول بھی موجود تھے، جواڑ تے ہوئے آتے دریا کنارے بیٹھے اسٹاف اور دیگر طالب علموں کے ہاتھوں پھینگی گئی اپنی مخصوص خوراک کو بچھتے اور پھراڑ جاتے۔ مجھے بھی یہی گوشہ نشینی وقت گزارنے کے لیے بہتر لگا اور میں انہی لکڑی کے تھوڑے میں سے ایک پر جا کر بیٹھ گیا اور سامنے بہتے پانی اور ان پرندوں کی آہیں میں ہوتی آنکھیں دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک بوڑھا شخص سر پر سیٹ پہنے لیے سے اوڑھکوت اور منظر میں ملیں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس طرف آ پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں پرندوں کو ڈالنے والے ایک بڑا سا کاغذی لفافہ پکڑا ہوا تھا۔ اس نے کچھ ہی دیر میں مٹھیاں بھر بھر کے دانے پرندوں کی طرف اچھال کر وہ لفافہ خالی کر دیا اور اسے قریب بہنے والے کوڑے دان میں ڈال کر وہ جانے کے لیے پلٹا۔ پھر اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور وہ میری طرف چلا آیا۔ اور ہاتھ بڑھا کر بولا۔

”جوزف۔۔۔ کیا تم نے آنے والے طلباء میں سے ایک ہو۔“ میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ حام کیا۔ ”نہا۔۔۔ فرسٹ سمسٹر۔۔۔“

محاشیات۔۔۔ اُس نے گرجوٹی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اور مکرر کہ بولا۔۔۔

”اوہ آئی سی۔۔۔ لیکن یک مین۔ تم یہاں تھا کیوں بیٹھے ہو۔۔۔ کیا سینٹر اسٹوڈنٹس کی ریلنگ (Raging) سے ڈرتے ہو۔“ میں بھی مسکرایا۔ ”نہیں۔۔۔ مجھے ڈر صرف اپنے آپ سے لگتا ہے۔ لیکن اس وقت میں خود اپنے آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس طرف آ بیٹھا۔“ جوزف نے دلچسپی سے میری طرف دیکھا۔

”خوب۔۔۔ اپنے آپ سے باتیں۔۔۔ یعنی اس ملاقات کی طرف تو کبھی اپنا دھیان ہی نہیں کیا، خود سے خود کی ملاقات۔۔۔“ میں نے کھک کر اس کے لیے تختے پر ہلکے خالی کی، جوزف بیٹھ گیا۔ میں نے اُسے جواب دیا۔ ”اس ملاقات کے لیے کسی خاص توجہ کی کبھی ضرورت نہیں ہوتی۔ انسان عمر بھر میں اپنے آپ ہی سے سب سے زیادہ باتیں کرتا ہے اور اپنے آپ کو سب سے زیادہ جھیلتا ہے۔ شاید کسی اور میں اسے اس قدر جھیلنے کی حاجت بھی نہیں ہوتی۔ انسان خود ہی اپنا سب سے بڑا دوست اور سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے۔ باقی اس کی اپنی ذات سے باہر ہونے والی کبھی دوستان اور کبھی دشمنیاں عارضی اور ناپائیدار ہوتی ہیں۔“

جوزف غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ "خود سے بہت ناراض لگتے ہو۔ یہ کتنی بلا وجہ تو جو نہیں سکتی لگتا ہے کوئی۔ اصلی تمہارے اندر رنگ رہی ہے۔" میں نے ہاتھوں کا رخ کسی اور طرف موڑنا چاہا۔ "لیکن آپ۔۔۔۔۔ آپ نے نام کے ساتھ اپنا کوئی دوسرا تعارف نہیں کر دیا۔"

جوزف نے گہری سی سانس لی۔ "نام پڑھیں تاہی چکا ہوں۔ بسکے ہی پوچھ رہی تھی میں کا کون سا آفس ڈیپارٹمنٹ میں آئی ہو لیٹ پر وہ فیسر ہوں۔"

میں نے جلدی سے معذرت پیش کی۔ "معاف کیجئے۔۔۔۔۔ میں شاید کچھ زیادہ ہی بول گیا۔ آپ کا اعزاز وراصل اساتذہ والا نہیں ہے۔"

روشنی میں اتنی بے تکلفی۔۔۔۔۔

جوزف نے جس گرمیری بات کاٹ دی۔ ”اس معذرت کی کوئی ضرورت نہیں۔ دراصل میں چاہتا ہوں کہ وہاں کوئی جو انہوں کو بھیجے وہاں پہنچے۔“

”میری کلاس کا وقت اور ہا ہے۔“ مجھے اُمید ہے بہت جلد ہماری ایک دوسری ملاقات ہوگی جو اس جیسی کئی ملاقاتوں کا ایک خاص خیر ثابت ہوگی۔“ جوزف گر مجبھی سے مجھ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ کچھ دیر میں کامران کے آنے کا بھی وقت ہو گیا۔ میں بھی سامنے بیٹے شطاف پانی اور پرندوں سے رخصت کے کریوینڈورنی کی لمبی لمبی ریلواریوں سے ہوتا ہوا باہر گیٹ پر آ گیا۔ باہر کامران کی گاڑی پہلے سے موجود تھی۔ میں نے کامران کی تلاش میں ادھر ادھر نظر میں دوڑائیں، موصوف کچھ دور ایک پاپ کارن کی مشین کے قریب کھڑی دو دو جوان میوں کا ہاتھ دیکھنے میں مصروف تھے اور انہیں یقین دلارہے تھے کہ بہت جلد ان کی زندگی میں ایک خوبصورت شیا کی نو جوان آنے والا ہے جس کے آنے ہی ان کی زندگیوں میں انقلابی تبدیلیاں آ جائیں گی۔ مجھے کامران کی اس صلاحیت پر ہمیشہ سے ہی رشک آتا تھا۔ مجھے کسی انٹی لری تو کیا، کسی انٹی مرد سے بھی پہلی مرتبہ بات کرتے ہوئے ایک جھلک بھی محسوس ہوتی تھی تاوقتیکہ وہ اپنی خود ہی بات کرنے میں مہل نہ کر دے۔ جب کہ کامران راہ چلتے اٹھتے بیٹھے، سوتے کسی بھی وقت کسی کو بھی روک کر گفتگو باہم کر سکتا تھا۔ شاید میرے اعمد فکر سے جانے کا اور ہمیشہ سے موجود رہا تھا اور کامران ایسے کسی خوف سے بالکل نا آشنا تھا۔ مجھے کچھ کہ اس نے جلدی سے میری طرف ہاتھ بلایا۔ ان گوری میوں کو اپنا کارڈ دیا۔ ان کے فون نمبر لیے اور مسکراتے ہوئے میری طرف بڑھا آیا۔ ہم گاڑی میں سوار ہو گئے۔ میں نے کامران کو کھورا، ”تم بھی نہیں سو کر دے۔۔۔“ چہ نا۔“

کامران ہنسا "اے یار بد راجہ! پھر ہمت سے یو خود سخی کے گیت پر کھڑا۔ سو چان کا ہاتھ ہی دیکھ لوں۔"

"جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ میں نے تمہاری کچھلی سات نسلوں میں کسی دست شمس کا تذکرہ تک نہیں سنا۔"

کامران کے ہونٹوں پر اب بھی وہی شریری مسکراہٹ تھی۔ "جانے دے تا یار۔۔۔۔۔ یہ بتاؤ کہ کونجی کا کیا پروگرام ہے۔ میرے پیٹ میں تو چوہ دوڑ رہے ہیں۔ میں نے سیٹ ہیٹ کچھ ڈھیلی کی۔" ہوں۔۔۔۔۔ بھوکہ تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔ کیسں لگی لے چلو۔"

کامراہ نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ ”پکا ڈن کی طرف چلتے ہیں۔ وہاں ایک نیارے ٹورنٹ کھلا ہے۔ کافی تعریف سنی ہے۔“

کے مشہور نرجس والے ٹیل سے ہوتے ہوئے ہم پکاڑی کی طرف مڑ گئے۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ چوڑی چوڑی سی سڑکیں ہمیشہ سے بہت بھلی لگتی تھیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ افکار و ادب کے آفرورانیہ میں صدی کے اوائل میں یورپین حکام نے عوام کی بدادلوں اور بکو دوں کو روکنے کی حکمت عملی کے طور پر ان تمام شاہراہوں کو چوڑا کر دیا تھا تاکہ حکومت اور فوج کا علماً آسانی کے ساتھ ہجوم کو ایک ہی جگہ قابو میں رکھ سکے۔

پکاڑی سرکس سے ہائیں مڑتے ہی دور دراز درختوں کی لمبی سی قطار سے ڈھکی ایک خاموش اور سنسان سی سڑک شروع ہو گئی۔ سڑک کے کنارے بنی ہوئی چوڑی سی نالی میں پانی ایک ایک انچانے سے سر کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ میں اور کامران اس سڑک پر مڑتے ہی ایک دم سے خاموش ہو گئے۔ جیسے قدرت کی اس بے پناہ خوبصورتی نے ہماری زبانیں ہی سلب کر لی ہوں۔ سڑک پر درختوں سے گرے ہوئے سرخ اور زرد چوں کی چادری پھٹی ہوئی تھی۔ جوڑوں کی نوپلے سے اس پھٹتی ہوئی سڑک پر کچھ اس طرح سے لہراتے تھے جیسے کوئی ریشمی کپڑا بچھانے کوئی کاغذی پٹھان بیٹھا ہو، جو اپنی نظری سے رنگ برنگے نئے نقاشی نکال کر نو اٹیں ابرار ہو۔

کبھی کبھی ہم چند پاؤں میں ہی اپنی ساری زندگی بھر سے جی لیتے ہیں، درختوں اور ان سے خزاں رسیدہ چوں سے گھری ہوئی اس سڑک پر ہم دونوں کا یہ سڑبھی زندگی کے انہی چند پاؤں میں سے ایک تھا۔ کچھ دیر کے لیے تو ہم یہ بھول ہی گئے تھے کہ ہم اس سڑک کے اختتام پر پہنچنے والے ہیں۔

بالآخر دنیا کی ہر اچھی چیز کی طرح اس سڑک کا بھی اختتام ہو ہی گیا۔ ہم نے لکڑی کے بنے ہوئے اس چھوٹے سے خوبصورت ریسٹورنٹ میں اپنی پسند کا کچھ لیا۔ کامران مجھ سے یونہی دیکھ کر ہارے میں پوچھتا رہا اور میں نے اُسے سراسر نرک کے نیچر اور اپنے تعارف پر کلاس روم کی خاموشی کے بارے میں بتایا۔ کامران ایسے موقعوں پر بالکل پینڈ ہو جاتا تھا۔ اسے اپنے غصے پر بالکل کنٹرول نہیں رہتا تھا۔ اس نے زور سے گلاس میز پر مارا۔ "یہ سارے گورے کہیں کے۔۔۔ ان کی تو۔۔۔" بڑی مشکل سے میں نے اُسے قابو کیا۔ کامران کا موڈ اب بھی خراب تھا۔ میں نے اسے موڈ لانے کے لیے ایک لیفٹر بنا دیا۔ "ایک گوری میم پر کسی کتے نے کاٹنے کے لیے حملہ کر دیا۔ پاس سے گزرتے ایک شخص نے جان پر کھیل کر اس کتے سے میم کی جان بچائی۔ اگلے دن کے اخباروں میں کتے سے میم کو بچاتے ہوئے اس شخص کی تصویر چھپی اور ہیڈ لائن لگی۔" انکشاف میرا نے صورت کو کتنے سے بچا لیا۔

اس شخص نے اخبار کے دفتر فون کر کے کہا: "میں انگریز نہیں ہوں۔" دوسرے دن اخبار نے پھر سرفی لکائی "میرے بھائی میرے حوریت کو جان پر کھیل کر کتے سے بچا لیا۔" اس شخص نے پھر اخبار کے دفتر فون کیا اور بتایا کہ میں غیر ملکی نہیں، پاکستانی اور مسلمان ہوں۔" تیسرے دن اخبار نے اسی قصہ پر کہنے کے لیے سرفی لکائی: "خطرناک دہشت گرد نے پالتو کتے پر حملہ کر دیا۔"۔۔۔ کچھ دیر تک تو کامران حیرت سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر دم دونوں کے منہ سے بے ساختہ جیسی نکلی گئی۔ وہ چھوٹا سا ریسٹورنٹ ہمارے قہقہوں سے گونج رہا تھا اور اس پاس کے لوگ ہمیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆



## گھائل

بچپن میں جب کبھی مجھے کہتے ہوئے دُرُ بھاک میں کوئی چوٹ لگ جاتی تھی تو سُنیں کبھی دوسروں کے سامنے نہیں رونا تھا نہ شدید سے شدید درد میں بھی میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ لوگوں کے سامنے میرے آنسو نہ نکلیں۔ ایسی صورت میں نہیں فوراً کسی گوشہ تنہائی کی طرف بھاگتا اور وہاں دل کھول کر روتا۔ دراصل مجھے بچپن سے ہی سب کے سامنے رونا بہت عجیب لگتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ ہم دوسروں کے سامنے رو کر اپنی عزت ان کی نظروں میں کھود دیتے ہیں۔

مولوی صاحب کے گھر سے دہلی کے بعد بھی میری حالت کچھ ایسی ہی تھی۔ رونا چاہتا تھا لیکن رونے کے لیے جگہ میسر نہ تھی۔ عجیب بے بسی تھی۔

مولوی صاحب صحت یاب ہونے کے بعد دوبارہ سے سنی کو درس دینے کے لیے آنے لگے تھے۔ ان دنوں میں کسی بھی بہانے سے سنی اور مولوی صاحب کے آس پاس ہی چکر کاٹا رہتا تھا۔ اس اُمید میں کہ شاید سنی ان سے ایمان کی کوئی بات کرے۔۔۔ یا پھر مولوی صاحب ہی اپنے گھر کا کوئی تذکرہ چھیڑ دیں۔ لیکن میری یہ اُمید بھی ہمیشہ ٹوٹتی ہی رہی۔

پھر میرے جنوں نے ایک اور روپ دکھارا۔ میں مولوی صاحب کے آنے کے انتظار میں رہتا اور جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوتے تھے گاڑی نکال کر ان کے محلے کے گیٹ کے سامنے اور کبھی کبھار تو بالکل ہی ان کی گلی کے پاس بے جا کر گاڑی لگا دیتا اور مولوی صاحب کے واپسی تک گاڑی میں ہی بیٹھا ہنگامی لگاتے اس تاڑمین کی راہ بکتا رہتا۔ اس امید پر کہ کبھی نہ کبھی تو وہ گھر سے باہر نکلے گی۔ لیکن یہ حسرت بھی ہمیشہ ناکام ہی رہی۔ میں نے کبھی کسی کو اس گھر سے باہر نکلنے نہیں دیکھا۔ ہاں البتہ آس پاس سے گزرتے محلے کے کچھ کچھ میری گاڑی سے اچھی طرح سے واقف ہو چکے تھے۔ البتہ ان میں سے کسی نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہ مولوی صاحب کے گھر کی مریدہ شاہ کر کو ایسی بڑی گاڑیوں میں آتا جاتا دیکھ چکے تھے۔ لہذا انہوں نے اسے بھی کچھ اسی طرح سے قہجیر کیا ہوگا۔ البتہ یہ خبریت دہلی کران میں سے کسی نے بھی مولوی صاحب سے تذکرہ نہ کیا۔ ورنہ میرے لیے جواب دینا بہت مشکل ہو جاتا۔ دن بوجھ می گزرتے جا رہے تھے اور میرا جنون بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ پھر جیسے قدرت کو چھ پر رحم آئی گیا۔ ایک ایسی ہی گرم سرچر کو جب مولوی صاحب سنی کو درس دے رہے تھے۔ شاہ کر نہیں ڈھونڈتا ہوا اسی گول کمرے کی طرف آ نکلا جہاں میں بھی بوجھ بیاہنا کپ سے رسالے کے ایک ہی صفحے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ شاکر نے آتے ہی مولوی صاحب کو یہ سزا دے مٹایا کہ اس کی بڑی بیٹی کی منگنی ملے ہوگی ہے اور اگلے جمعے کی سرچر مولوی صاحب بیچ خاندان کے اس کے گھر دعو ہیں۔ مولوی صاحب نے منگنی ملے ہوئے پر شاکر کو بے حد مبارکباد دی اور خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن انہوں نے شاکر سے معذرت کی کہ جسے کے دن کا تو وہ پہلے ہی کسی تبلیغی جماعت سے وعدہ کر چکے ہیں کہ ان کے ساتھ علاقے

کے گفت پر چلیں گے اور اب اس وعدے کو جالنا کسی طور مناسب نہ تھا۔ البتہ انہوں نے یہ وعدہ ضرور کیا کہ وہ اپنے بچے عبداللہ کے ساتھ باقی گھر والوں کو مٹھنی کی تفریب میں ضرور پہنچ دیں گے۔ مجھے یوں لگا جیسے برسوں کی ویران بیابان صحرا میں پھرتے پھرتے اچانک کوئی ٹھٹھان دور سے مجھے نظر آ گیا ہو۔ میں جانتا تھا کہ شکر یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمارے اس ادارے زدہ گھر میں سے کوئی بھی اس کی اس خوشی میں شریک ہوئے نہیں آئے گا، ہم سب کو وحشت ضرور دے گا۔ شاکہ قدرت نے مجھے اس کی ایک جھلک دکھانے کے لیے ہی یہ سب انتظام کیا ہو اور پھر ہوا بھی یونہی۔ بابا نے حسب معمول ایک لمبا سا بھرا بھرا اور جب سے پرس نکال کر چند بڑے نوٹ شکر کے حوالے کر دیے۔

”میری طرف سے بچی کے لیے کچھ لے لیا۔“

اسی نے بھی گھر میں کام کرنے والیوں کو نہ انے صندوق اور الماریاں کھٹکھٹانے کا کہا اور کپڑوں اور نہ انے زیورات کی ایک مختصری شاکر کے حوالے کر دی گئی، شاکر نے سب کی طرف سے مایوس ہو کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے قلمی دی۔

”میں ضرور آ جاؤں گا۔ وعدہ رہا۔“

بابا کے چہرے پر ناگوار کی کے اثرات آجھرے، جوان کے پائپ کے دھوئیں کے پیچھے کھو گئے۔ اسی اور بھابھی نے بھی ناک ٹھوں چڑھائی لیکن کسی نے کچھ نہیں کہا۔ یہ کچھ ہے کہ اس مرتبہ شاکر کی خوشی میں شرکت کرنے میں میری اپنی شدہ غرض بھی شامل تھی، لیکن یہ بھی جج ہے کہ اگر بات ایمان کی ایک جھلک کی نہ بھی ہوتی تو میں ضرور شاکر کے گھر جاتا۔ اس کا اور میرا رشتہ تو کراہ و مالک سے بہت بڑھ کر تھا اور تمام گھر والے بھی بچپن سے میری شاکر سے اس افسانیت سے اچھی طرح واقف تھے۔

شاکر بہت پہلے مولوی صاحب کے اس چھوٹے سے محلے میں ہی رہتا تھا، اُسے بہت چھوٹی عمر میں دادا جان نے گھر کی ذرا بھری پر دکھ لیا تھا۔ بابا کی شادی بھی اس کے سامنے ہی ہوئی تھی۔ بعد میں کچھ سالوں کے بعد شاکر کی بھی شادی ہو گئی تو دادا نے ان دونوں میاں بیوی کو اپنے بچنے کے پیچھے بڑے سروشن کو ارٹرز میں بٹنے کی جگہ دے دی۔ سروشن کو ارٹرز کیا تھے؟ مجھے خاصے بڑے مکان تھے جو ہماری بُرائی حویلی کے دیکھو اڑے بٹے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں دادا جان کے پاس ان کے گاؤں کے درشتے داروں کا بہت آجا جاتا تھا۔ سناہوں نے پچھلے حصے میں پینٹ چار کو ارٹرز لٹوا لیے تھے۔ دارا کی وفات کے بعد بابا نے اپنی کشتری کے تقاضوں کے مطابق اس حد بد علاقے میں یہ کٹھی بنوائی تھی۔ البتہ ہماری بُرائی حویلی شہر کے مضائقہ میں اب بھی موجود تھی۔ شاکر اور اس کا خاندان ہی اب بھی اس حویلی کی رکوائی کرتا تھا اور ان کی رہائش اب بھی وہیں تھی۔ شاکر کی اولاد میں دو بیٹے اور ایک چھوٹی بیٹی شامل تھی۔ دونوں بیٹے محنت مزدوری کے سلسلے میں شہر سے زیادہ تر باہر ہی رہتے تھے۔ بابا کی خاص دعوتیں اور اجلاس وغیرہ اب بھی اسی حویلی میں ہی منعقد کیے جاتے تھے۔ بلکہ آج کل تو بابا اس بُرائی حویلی کو اپنا کپ آفس بنانے کا سوچ رہے تھے۔

شاکر تو اپنی بیٹی کی مٹھنی کا نیوچارے کر رہا تھا لیکن اب میرے لیے ایک ایک مل کا ٹکڑا قدر دہوا تھا۔ یہ بس نہیں ہی جانتا تھا۔ دن پھر گئے اور لمبے۔۔۔ مجھے اس قدر طویل کبھی محسوس نہیں ہوئے تھے جتنے ان چار دنوں میں، آخر خدا خدا کر کے دنے کا دن بھی آئی گیا۔

مجھے یاد ہے اس دن میرا دل کر رہا تھا کہ صبح سویرے نکلتے سے پہلے ہی میں بُرائی حویلی کے گیٹ سے ملحق باغ میں جا بیٹھوں جہاں سے تمام

مہمانوں کو داخل ہونا تھا۔ وہ بھی تو وہیں سے گزرے گی۔ جانے وہ کیسا لمحہ ہوگا جب نہیں پھر اُسے ایک مرتبہ دیکھ پاؤں گا۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ تقریب کا وقت شام 4 بجے کا رکھا گیا تھا اور ابھی تک تو ٹھیک سے صبح بھی نہیں ہوئی تھی۔

میں سر پہرنگی تک کھوئے ہوئے مسافر کی طرح اپنے ہی گھر کی راہداریوں میں اور دوشوں میں کئی چنگ کی مانند ڈول رہا۔ اس دن مجھے پتہ چلا کہ لمحے گفتگو کی طرح کیسے گزرتے ہیں۔ نہ جانے کب دن کے دو بجے اور میں اس بچے کی طرح گاڑی نکال کر اپنی بڑائی حویلی کی طرف بھاگا جو اپنے روزے کے دن عصر کے وقت سے ہی روزہ کھانے کے انتظار میں دسترخوان پر جا بیٹھا ہے۔

شا کر مجھے اس قدر جلدی وہاں پا کر بے حد خوش اور کچھ پریشان بھی ہوا۔ کیونکہ ابھی تک تو وہ اور اس کے بیٹے انتظامات میں ہی مشغول تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے شا کر کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ میری فکر چھوڑ دے۔ وہ اپنے کام جاری رکھے۔ تب تک میں حویلی کا ایک پھرنگا لوں گا۔ شا کر کو دکھانے کے لیے کچھ دیر تک میں اپنی آبائی حویلی میں کھوتا پھر جا رہا اور جیسے ہی شا کر کا درمیان دوسری طرف ہوا میں نظر پھا کر گیت کے پاس والے باغیچے میں لگی کیربوں میں سے ایک پر آ بیٹھا۔ تمام مہمانوں کو اسی مرکزی گیٹ سے ہی اندر آنا تھا کیونکہ شا کر کے کوارٹر کے لیے حویلی میں دوسرا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ ساڑھے تین بجے سے مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی اور میری دھڑکن کی اچھل چھل بھی۔۔۔۔۔ جب بھی کوئی پردہ نصیب دور سے گیت کی طرف آنی نظر آتی۔ میری سانسیں تھمسنے لگ جاتیں۔ لیکن جس کے انتظار میں میں جانے کتنی صدیوں سے یہاں بیٹھا تھا اس کا اب تک دور دور تک کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ مجھے لگا کہ جیسے وہ نہیں آئے گی۔ کہیں مولوی صاحب نے ہی منع نہ کر دیا ہو؟ کہیں کوئی اور مسئلہ نہ ہو گیا ہو؟ ہزار دوسو سے تھے جو ایک ایک ٹپ میں دل میں آتے اور میری وحشت کو بڑھا کر وہاں چلے جاتے۔

پھر اچانک اس شہدائی سڑک کے موڑ سے، جس کے کنارے ہماری حویلی موجود تھی۔ ایک ٹانگہ اپنی مخصوص تک تک کی آواز کے ساتھ نمودار ہوا۔ میری نظر میں آخری امید کے غمحات دینے کی طرح اس ٹانگے کی مخصوص رفتار پر جمی گئیں۔ ٹانگہ حویلی کے بڑے چوٹی گیٹ کے سامنے آ خرک گیا۔ اس میں اگلی سیٹ پر کوچان کے ساتھ ایک بڑے نور چہرے اور ہلکی سی داڑھی والا ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ سفید شلوار کرتے میں ملیں اس نوجوان نے آتے آتے کوچان کو کراپے دے کر قارغ کیا اور کھلی سیٹ سے سیاہ برقعوں میں ملیں دوڑا لیاں نیچے اتریں۔ فضا ختم ہی گئی، ہوا ساکت ہو گئی اور دوشوں کے کبھی پرندے وچھپنا بھول گئے۔ وہ وہی تھی۔ میں ان نازک قدموں کو بھلا کیسے بھول سکتا تھا۔ اس کے ساتھ لپیتا اس کی چھوٹی، لیکن تھی۔ دونوں لڑکیوں کی صرف آنکھیں غاب سے باہر تھیں۔ اف۔۔۔۔۔ پھر وہی آنکھیں۔۔۔۔۔ اس نوجوان نے حیرت سے پہلے اس عظیم الشان حویلی کو دیکھا اور پھر لڑکیوں سے جیسے ایک مرتبہ دوبارہ ہچکچاہٹ چاہی کیونکہ ایک ڈرائیور کی ایسی رہائش گاہ کا اسے تصور بھی نہ ہوگا۔ پھر شاید جیسے چھوٹی دانی نے اُسے کچھ بھمایا۔ وہ نوجوان انہیں لیے پیسے کسی شش و پنج میں جھکے ہوئے گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا۔ شاید وہ سب پہلی مرتبہ شا کر کے کمر آئے تھے۔

وقت اس نوجوان کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اور یہ کیا؟ وہ تینوں تو میری جانب ہی بڑھ رہے تھے۔ میں بڑبڑا کر کھڑا ہوا گیا۔ چھوٹی دانی کی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر ششاسائی کی ایک چمک لہرائی اور اس نے سرگوشی میں ایمان سے کچھ کہا۔ شاید چھوٹی مجھے پہچان گئی تھی۔ ایمان نے ایک نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ایک ہلکی سی چٹکی۔۔۔۔۔ پاس کی دوسری نظر میں جو میری نظر سے ٹکرائی تھی۔ بے خودی کی ایک لہر مجھ پر طاری ہو گئی۔ مجھے یوں



منیس مولوی عظیم الدین صاحب کا بھتیجا ہوں چچا اکثر آپ کی باتیں کرتے ہیں۔“

خوشگوارمی کی ایسے لہری میرے تمام وجود میں کھیل گئی، تو گو پاکسی بہانے ہی کہیں۔۔۔ میرا ذکر تاجپڑ بھی اس چار دیواری میں ہوتا تھا۔ ہو سکتا ہے کبھی میرا نام اس مہ جہیں کے بہنوں پر بھی آیا ہو۔ اس وقت جانے کیوں، ذہندگی میں پہلی بار مجھے اپنے نام پر خود بخود پیار آنے لگا۔ منس نے اس سے دوبارہ ہاتھ ملا لیا۔

”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی اس دن آپ کے گھر آنا ہوا تھا لیکن آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی لیکن آپ یہاں باہر کیوں کھڑے ہیں۔ اندر چلیے۔ کچھ دیر میں چائے کا اہتمام ہونے والا ہے۔“

عبداللہ نے کچھ تذہیب سے کہا، ”اگر اصل مغرب کا وقت ہونے والا ہے۔ آپ تو چچا کی طبیعت سے واقف ہیں۔ ہمیں اب اٹکنا چاہیے۔“  
میں اس انگڑائی میں یہاں کھڑا ہوں کہ اندر سے کسی کو بھیج کر گھر کی خواتین کو بلاؤں تو چلوں۔“

اتنے میں شاگرد امداد نے سے ہر آدھوا۔ ہم دونوں کو باہر کھڑا دیکھ کر وہ چل دی سے ۷ ماری طرف بڑھا۔۔۔۔۔ "حمدا یا ہا۔۔۔۔۔ خیر تو ہے۔۔۔۔۔ آپ باہر کیوں کھڑے ہیں۔"

میں نے مسکرا کر اسے عبداللہ کی طرف متوجہ کیا۔

”میری طرف سے تو سب خیر عا ہے۔ لیکن عبداللہ میاں واپسی کی فکر میں ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ دیر ہو رہی ہے۔“

”ابھی سے۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ ابھی تو انگوٹھی بھی نہیں پہنائی گئی۔ اور پھر مغرب کے بعد کھانا کھائے بچاؤ میں ہرگز کسی کو نہ جانے دوس گا۔ ناممکن۔“۔۔۔ عبداللہ اکساری سے گویا ہوا۔

”شما کر چٹا۔۔۔ مغرب کے بعد تو بہت دیر ہو جائے گی۔ ہماری طرف کی سواری ملنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ اور پھر چٹا۔“

ہے۔۔۔۔۔ رنجی بات سوارمی کی۔۔۔ تو میں خود تم لوگوں کو داناں چھوڑ دوں گا۔۔۔۔۔ بس طے ہو گیا۔“

شا کر نے قسمی فیصلہ دے دیا۔ عبداللہ کے پاس بھی مزید بحث کی اب کوئی گنجائش نہ تھی، اس نے شا کر سے مغرب کی نماز کے لیے اجازت

چاہی اور قرعہ مسجد کی طرف روانہ ہو گیا۔ شاہ کرنے اُسے جلد واپس لوٹنے کی تاکید کی۔ پھر جیسے اچانک شاہ کو کچھ یاد آیا۔ اس نے زور سے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔

”ارے خدا ہا۔۔۔ دیکھو آبِ واقعی بڑا سا ہوتا ہا رہا ہوں۔۔۔ اندر نگہت کی امی تمہیں بلاتی ہیں۔۔۔“ محبت شاکر کی بیٹی کا نام تھا۔ بچپن میں میری ساری کتابیں سالِ ختم ہونے کے بعد نگہت کے پاس ہی جاتی تھیں۔ شاکر کو اپنی بیٹی کی تعلیم کی بڑی فکر تھی۔ محبت جب

جس پر میری اصل خالائیں خاصی جڑ برہو تھیں نہیں اور ان سے نہیں غاصا مانوس بھی تھا۔ جیسے آج کل سنی مولوی صاحب کے لیے گھر سے چمپ چمپ کر چیزیں لے جاتا تھا اسی طرح میں بچپن میں گھرت اور خالہ کے لیے اپنے اسکول ایک میں چاکلیٹیں، کتاہیں اور دیگر چیزیں لے جایا کرتا تھا۔ اسکول سے واپسی پر میں شاکر سے خدا کر کے چند گھنٹوں کے لیے زبانی حویلی رکنا اور اپنے چھوٹے چھوٹے معصوم چھٹے خالہ اور گھت کو دے آتا۔ خالہ اس بات پر مجھ سے ہمیشہ ڈرامہ بھی ہوتی لیکن میرا یہ معمول تمام اسکول لائف میں جاری رہا۔۔۔ جب تک کہ مجھے بورڈنگ نہیں بھیج دیا گیا۔

اہستہ بورڈنگ سے بھی جب میں چٹیلوں میں گھر واپس آتا تو اس خاندان سے ملنے ضرور جایا کرتا۔

میں جانتا تھا، خالہ شاکر سے میرے بارے میں ضرور پوچھیں گی اور مجھے اندر ضرور بلوائیں گی۔ لیکن جانے کیوں نہیں اس میں سے گھر رہا تھا، کھرا رہا تھا۔ میں اس وقت اندر نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہاں سب ہوں گے۔ اور پھر سب نہ بھی ہوں تو کیا ہے وہ تو ہوگی۔ پتہ نہیں اس کے سامنے میں خالہ سے یا گھت سے ڈھنگ سے بات بھی کر پاؤں گا یا نہیں۔ پچھلے وہ یہاں آتے وقت گھت پر میری بڑبڑاہت ضرور مھوس کر چکی ہوگی۔ لیکن بہر حال، اس وقت شاکر کو نہ لے جایا نکال کر نہ کا کوئی موقع بھی مجھے میسر نہ تھا۔ شاکر میرے سر پر ہی کھڑا تھا اور مجھے ساتھ لے کر ہی وہ وہاں سے ملتا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میں تنہا کبھی بھی اندر نہیں جاؤں گا۔ شاکر کے ساتھ بھی میرا عجیب رشتہ تھا۔ میں نے کبھی اسے چچا، بابا یا کسی اور احترام کے نام سے پکارنے کی ضرورت مھوس نہیں کی تھی۔ جب کبھی مجھے اسے پکارنا ہی پڑ جاتا تو میں شاکر کے نام سے ہی پکارتا تھا۔ بچپن سے ہی میرا یہی معمول تھا۔ میں نے کبھی کسی روایتی طریقے سے اپنے دل میں موجود احترام کو ظاہر نہیں کیا تھا۔ شاید مارے سچ موجود اس رشتے کو کسی روایتی نام یا احترام کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

شاکر مجھے لپٹا ہوئے اندر نہ لے جانے کی طرف بڑھ گیا۔ اندر سے عورتوں کے چننے بولنے، ڈھونڈی اور شادی بیاہ کے گیتوں کا شور مٹائی دے رہا تھا، صحن میں، برآمدے میں اور اندر کمروں میں ہر طرف عورتیں ہی عورتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سب میری جانب متوجہ ہو گئیں۔ کچھ نہیں، کچھ نے سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے نہ جانے کیا کہا، میں اسی لیے اس طرح کے تسوانی جھوم میں جانے سے ہمیشہ بچھٹتا تھا، جب بہت سی عورتیں ایک جگہ جمع ہو جائیں تو وہ بہت بے باک ہو جاتی ہیں اور پھر معاملہ کسی ایسی مقفی یا شادی بیاہ کی تقریب کا ہوتا ہے بے باکی مردوں کو بھی مات دیتی ہے۔

خالہ مجھے دیکھ کر آگے بڑھی اور جلدی سے اس نے میری بازوئیں لے لیں۔ گھت جو سر جھکائے گھوگھٹ نکالے بیٹھی تھی، اس نے میری آغوش میں کر بٹکے سے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ شاکر نے میرے لیے بمشکل راستہ خالی کر دیا۔ میں نے گھت کے سر پر ایک ہلکی سی چپٹ لگائی۔

”میں جانتا تھا۔ یہ ساری شرارت تمہاری ہی ہوگی، کم از کم اپنی مقفی کے دن تو چپ کر کے چھٹی رہتیں۔۔۔“

گھت کھوکھٹ تلے مڑ گئی۔

”تمادیمیا۔۔۔ ابانے مقفی کے بعد مجھے کالج جانے سے منع کر دیا ہے۔ کہتے ہیں مسرہال والے نر امانا تے ہیں۔ آپ اب سے بات

”کچھ نہ۔۔۔ ہیری خاطرہ“ لکھو۔۔۔ لڑکیاں ہندی اور مگھلی والے دن جانے کیا کیا سوچتی ہیں کہ ان کا ہونے والا دلہا کیسا ہوگا؟ کہاں ہوگا؟ اور ان محترمہ کو آج کے دن بھی اپنی پڑھائی کی ہی سوجھ رہی ہے۔ مجھے زور کی قسم آگئی۔ میں نے دھیرے سے گھٹ کے کاس میں کہا۔

”تمہارے سسرال والوں کی تو ایسی ہی تھیں۔۔۔ بے گھر ہو جاؤ۔۔۔ کوئی تمہیں مزید پڑھنے سے نہیں روک سکتا۔ نہ تمہارے باپ اور نہ تمہارا چھ مہینے بعد ہونے والا میاں۔ میں خود بات کروں گا۔ اب تھو۔“

اور واقعی خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو تو آ گئے۔ یہ لڑکیوں کا دل اتنا چھوٹا کیوں ہوتا ہے؟ اور اسے راسی بات پر رووینے والا اور پھر خوش بھی کتنی چھوٹی سی بات پر ہوتا ہے۔ دل کا شیشہ اتنا صاف کیسے دکھائی دیتا ہے؟

دلہن میری نظر چھوٹی جیبا پر پڑی۔ وہ اسی کمرے میں موجود تھی جہاں ٹھہرتے ہوئے بیٹا گیا تھا۔ جیبا اس قسم کی عورت سے بالکل آواز میں کچھ بات کر رہی تھی، لیکن ایمان مجھے اس کمرے میں کہیں دکھائی نہ دی۔ میں اب یہاں سے اٹھنا چاہتا تھا لیکن شاکر عورتوں کے اس جھوم میں مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بچپن سے اس گھر کے چپے چپے سے واقف تھا۔ سوچا ساتھ والے کمرے سے ہوتا ہوا کچھ دروازے سے باہر نکل جاؤں گا کیونکہ

سامنے برآمدے میں تو خواتین کی ایک بڑی تعداد بچے فروش پر ہی دری ڈالے دھرتا ہوا تھا۔ بیٹا ساتھ والا کمرہ چونکہ رہائشی تھا اس لیے اس طرف کسی کے ہونے کا امکان کم ہی تھا۔ اس دوسرے کمرے کا ایک دروازہ کچھلے گھن میں کھلا تھا، جہاں اس وقت دیکھیں وغیرہ چڑھائی یا ماری تھیں۔

میں نے گھٹ کو اشارہ کیا کہ میں بعد میں اس سے ملتا ہوں اور دونوں کمروں کو ملانے والے درمیان کے دروازے سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں شام کے وقت کی وجہ سے ملگجھا سا اندھیرا چھایا ہوا تھا اور کمرہ سنسان تھا۔ میں اپنی ہی دھن میں کچھلے گھن کی طرف کھلتے والے

جانی کے دروازے کی طرف بڑھا، چاک و دیوار کے ساتھ بنی ہوئی گھڑی کی بڑی ہی الماری کے عقب سے کوئی جلدی میں اپنا آپ سنیا لے ہوئے نکلا، اس الماری میں زیادہ تر گھر کی کراکری اور شیشے کے برتن وغیرہ پڑے ہوتے تھے۔ وہ سامیائی ہی جھونک میں مجھ سے ٹکرایا اور اس کے ہاتھ سے

شیشے کی تین چار ٹہنیں پھسل کر فرش پر گر گئیں۔ ایک دینی یں لسانی چنچ فضا میں ابھری، کچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی ہلکا سا گیا، مجھ سے ٹکرا کر وہ سامیہ لڑا کھڑا سا گیا لیکن اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا تھا، لیکن اس تمام معاملے میں سنپیلے سنپیلے آٹھلے ڈھلک کر کندھوں پر آ چکا تھا۔ وہ ایمان تھی، قیامت

کی گھڑی کا تذکرہ تو صوب نے ہمیشہ سنا ہوگا لیکن وہ قیامت کی گھڑی ہوگی کیسی؟ اس کا شاید کسی کو مجھ سے بھرا اندازہ ہوگی نہ ہوگا۔ اس کا حسن بے

عیاب تھا اور مجھ سے اس قدر قریب تھا کہ اس کی الجھی ہوئی سانسوں کی مہک میں اپنے سینے پر محسوس کر سکتا تھا، اس کی مخصوص الجھی ہوئی سیات کھرک

اس کے چہرے پر آ پڑی تھی اور اس کا گلابی دودھ جیسا پیشہ چہرہ اس وقت شرم، خوف اور جیلا کے مارے انکارہ سا ہو رہا تھا۔

کیا کسی کی دعاؤں کا اثر قدرت نے اس قدر جلد اور اس قدر داخلی انجام کے طور پر بھی دیا ہوگا۔۔۔؟ شاید کبھی نہیں۔

دو بڑا کر بولی۔۔۔ ”معاف کیجئے۔۔۔ وہ نہیں۔۔۔ میں یہاں برتن لینے آئی تھی؟“

مجھ سے جواب میں کچھ بھی نہ بولا گیا۔ شاید میری زبان ہمیشہ کے لیے سلب کر لی گئی تھیں۔۔۔ اس نے میں برتن گرنے کی آواز سن کر پاس

دیکھ کر جیسے خود ہی سب سمجھ گئیں۔ ایمان جلدی سے خالہ کی طرف بڑھ گئی۔ خالہ فس کر بولی۔ ”ڈر گئیں کیا؟۔۔۔ ارے یہ اٹھائی بچہ ہے۔ حمار۔۔۔ نکمت کا تیرا بھائی ہی سمجھو۔“

حیات نے فسی روکنے کے لیے پتہ میں ملے لے لیا تھا۔ اب ایمان بھی سنبھل چکی تھی۔ اس نے جلدی سے اچھا اٹھا کر ماتھے تک لے جا کر جیسے بجھے آداب کیا۔ خالہ ہنسنے ہوئے بولی۔ ”اچھا تم جاؤ۔۔۔ نہیں اور حیات کا کچھ اٹھائیں گے۔ وہاں نکمت اکیلے ہے۔“ ایمان جلدی سے سنٹ پٹائی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ خالہ نے پھر سے مجھے کھانا کھائے بغیر دواہن نہ جانے کی ہدایت کی۔ مجھے یا فئیس کہ نہیں اس کمرے سے کب اور کس طرح باہر نکلتا تھا۔ یہ ایک بل میں کیا ہو گیا تھا۔ کیا آج قدرت نے ایک ہی دن میں میرے اس حقیر جہم میں کی ہوئی چند گنی جتنی نیکیوں کا صلہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ میرے کس قدر قریب تھی۔ میری شوگر سے بھی قریب۔ کچھ یہ ہے کہ اس دن مجھے خدا پر جس قدر ٹوٹ کر پیار آیا، اتنا پہلے بھی نہ آیا تھا۔ ہم انسان بھی کتنے ناشکرے ہوتے ہیں۔ آس پاس کی چیزوں سے، رشتوں سے، خدا کی بانی ہوئی نعمتوں سے، دن میں جانے کتنی مرتبہ پیار جتا رہے ہیں۔ ان کے پیار کا ذکر کرنے سے ہی ہماری آنکھیں تک سسکتے لگتی ہیں۔ لیکن ہمیں اس خدا پر بھی پیار نہیں آتا جو ہمارے بچنے کے یہ سب بہانے پیدا کرتا ہے۔

مجھے بھی پہلے کبھی نہیں آیا تھا لیکن اس دن آیا اور بہت ٹوٹ کر آیا، مجھے میری توقعات سے کہیں بڑھ کر نوازا تھا اس نے، میں نے خود سواکسی سے شش کی طرح آس پاس سے پرکھنا۔ وہیں کسی گوشے میں بیٹھا ہوا کھانا لگ چکا تھا۔ شاکر نے اسی گوشے میں مجھے کچھ ادا دیا۔ جانے کب کب قریب شتم ہوئی اور لوگ دھیرے دھیرے رخصت ہونے لگے۔ میں تب چوٹ کا جب میرے سامنے سے عورتوں کی آخری ٹولی بھی جلدی جلدی اپنی چادریں اور برقعے سنبھالتی گزر گئی۔ مجھے اپنی بے خودی پر غصہ آیا۔ کتنی وہ بیت گئی تھی۔ وہ ضرور واپس چلی گئی ہوگی۔ میں جلدی سے اللہ کریم کی طرف آیا، وہاں عید اللہ کو شاکر کے ساتھ کھڑے ہو کر میری جان میں جان ہی آ گئی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ان کے قریب پہنچا۔ شاکر نے مجھے دیکھ کر کہا۔

”لو۔۔۔ حمار بایا بھی آ گئے۔ اب مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

پتہ چلا کہ مہمانوں کو واپس پہنچانے کی فرض سے جو گاڑی کرائے پر منگوائی گئی تھی۔ اُسے شاکر کا بیڑا بیٹا لے کر گیا تھا لیکن اس کی واپسی میں دیر ہو گئی تھی۔ عید اللہ کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ میں نے جھپٹکے ہوئے شاکر کو تجویز پیش کی کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو میں گھر جاتے ہوئے انہیں سواوی صاحب کے یہاں چھوڑنا چاہوں گا۔

”مجھ کو تو میں عید اللہ میں ان کو کبہ رہا ہوں بایا۔۔۔ لیکن یہ حضرت کچھ تکلف سے کام لے رہے ہیں۔“

”اس میں تکلف کی کیا بات ہے۔ میں ویسے بھی بس نکل ہی رہا تھا۔ راستے میں آپ لوگوں کو گھر چھوڑنا چاہوں گا۔“

عید اللہ کے پاس میری تجویز ماننے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ رات ڈھلتی چار گنی تھی اور اس وقت کسی دوسری سواوی کا ماننا بھی اس علاقے میں محال تھا۔ جب تک میں گاڑی کے مرکز ملی سے مرکز کی گھٹ تک پہنچا شاکر اندر سے دونوں لڑکیوں کو بھی بلا لایا تھا۔ ایک ہی دن میں اتنے مجزے روٹنا ہو جائیں گے۔ یہاں آنے سے پہلے، ایسا نہیں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ شاکر سے رخصت ہو کر وہ سب گاڑی میں سوار ہو گئے۔ عید اللہ میرے ساتھ آگے بیٹھ گیا اور ایمان اور حیات کچھ سیٹ پر۔ میں نے کار آگے بڑھا دی۔ یا خدا۔۔۔ یہ کوئی خواب تو نہیں تھا۔ نہیں۔۔۔



ضروریہ کوئی خواب ہی ہوگا۔ وہ میرے ساتھ میری ہی گاڑی کی بجلی سیٹ پر موجود تھی۔ ایک دو سو روپے میں بیڑی نظریں اس کے سر اُپے کا طواف کرتی رہیں۔ گودھ کھل پردے میں تھی اور صرف اس کی آنکھیں ہی اس کے نقاب سے باہر تھیں۔ لیکن اس کا اس قدر قریب ہونا ہی کس قدر جاں فزا احساس تھا۔ نہیں کسی خواب کے عالم میں ہی گاڑی چلا تا رہا۔ عبداللہ خود بھی خاموش طبیعت اور کم گو تھا کچھ میں بھی اپنے خیالات کی رو میں جھٹکا ہوا تھا۔ راستے بھر ہم خاموش ہی رہے۔ اس دن پہلی مرتبہ مجھے سڑکوں کے خالی ہونے اور رات کی وجہ سے دُش نہ ہونے پر بے حد فخر آیا۔ فاصلہ بہت تیزی سے طے ہو رہا تھا۔ بجلی سیٹ پر وہ دونوں خاموش بیٹھی تھیں۔ ایمان مسلسل کھڑکی سے باہر گزرتے ٹھاروں کو ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ بھی دانستہ پاؤں دانستہ طور پر سامنے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اور میں سب کی نظر بچا کر مسلسل شیشے میں ہی کود کچھ جار ہوا تھا۔ جانے اس انہجانی سی لڑکی نے مجھ پر یہ کیا جادو کر ڈالا تھا کہ میں دھیرے دھیرے اپنے اوپر اپنا تمام اختیار ہی کھوتا جا رہا تھا۔۔۔۔۔

پلک جھپکنے میں ہی مولوی عظیم کا محلہ آ گیا۔ رات کی وجہ سے محلہ بھی بالکل سناٹا پڑا تھا۔ میں نے مولوی صاحب کی نگلی میں موڑ کر گاڑی کھڑی کر دی۔ عبداللہ نے نہایت ممنونیت سے میرا شکریہ ادا کیا اور رسوا اندر آئے کو بھی کہا۔ میں نے شکریہ کہا کہ رات بہت ہیچ ہے۔ چکر کبھی سکنا، ایمان اور حیا بھی گاڑی سے اتر چکی تھیں۔ ایمان تو خاموش رہی البتہ حیا نے اترتے اترتے دھیرے سے شکریہ کہا، میں صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ میں نے گاڑی واپس موڑی اور عبداللہ کو سلام کرتے ہوئے آگے بڑھا دی۔ گلی سے لٹکتے لٹکتے میں نے ایک دو سو روپے دیکھا کہ دروازہ کھل چکا تھا اور وہ تینوں اندر داخل ہو رہے تھے۔ پھر ہائے زکب میں گھر پہنچا اور کس طرح میں نے خود کو اپنے استر تک پہنچایا۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس ساری رات میں نہیں ایک بل کے لیے بھی نکلنے نہیں چھپکا پایا تھا۔ اس رات مجھے احساس ہوا کہ عشق کا ڈنگ پناؤ اور کر چکا ہے اور اب زہر دھیرے دھیرے میرے جسم کی تمام مہگوں میں پھیلتا جا رہا ہے۔۔۔۔۔

☆☆☆

## عشق کا شین (II)

کتاب گھر عظیم الحق کے تحریر کردہ ناول **عشق کا عین اور عشق کا شین (I)** کی بے پناہ کامیابی، اور قارئین کے پڑ در اسرار پر اپنی ندرت ہے **عشق کا شین (II)**۔ ان تمام قارئین کے لیے تھوڑا خاص، جو اس ناول کا دراصل عظیم الحق تھے، **تحریر کردہ پڑھنا چاہتے تھے**۔ عشق حجازی کے دیگر اردوں سے عشق حقیقی کے گھڑاوں تک کے سفر کی روداد۔ عظیم الحق حقیقی کی لازوال تحریر۔ **عشق کا شین (II)** کتاب گھر کے معاشرتی (وہانی) ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

## پہلی کلاس

اچانک میری آنکھ الارم بھاگ کی تیز گھنٹی سے کھل گئی۔ صبح کے سات بج رہے تھے۔ کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ یہ شور کیسے سا ہے۔ منہ سے فکڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ آج لندن کا آسمان پھر سے سفید بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور شاید بالکی پر بند باندی بھی ہو رہی تھی۔ پھر مجھے یاد آیا کہ آج سے میری باقاعدہ کلاس شروع ہو رہی ہیں اور مجھے نو بجے والی پہلی کلاس کے لیے آٹھ بجے تک ہر حال میں سب دے پہنچ جانا چاہیے کیونکہ اگر آٹھ بج کر دس منٹ والی ٹرین نکل گئی تو سمجھو یہاں پر بیٹھ گیا۔

انسان کی بہت عجیب فطرت ہے۔ جس چیز کا اسے پابند بنادیا جائے، اسے رفتہ رفتہ وہ پابندی بوجھ لگنے لگتی ہے۔ عام حالات میں نہیں اگر پوری رات بھی شب بیداری کر کے الفتا تو مجھے تب بھی کبھی اتنا زبردستی نہیں لگا جتنا اس دن مجھے یونیورسٹی پہنچنا لگ رہا تھا۔ پاول خواستہ نہیں نے نیم گرم پانی سے شادو لیا اور گرم کافی کا ایک مگ حلق میں اٹھایا، کامرین جا چکا تھا۔

لباس تبدیل کر کے نئے نیچے اترا، کبھی بھی شہر کی صبح، اس کے عام دن کے مقابلے میں بہت مختلف اور کبھی کبھی بے حد خوشگوار ہوتی ہے۔ کبھی لوگ فینڈ سے جاگ کر اپنے روزمرہ کے معمولات کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ جیسے اس وقت وہ آکٹپس گٹار بجانے والی لڑکی سامنے سے گزرتی فرام سے بس آڑی ای تھی۔ اس کے ہاتھ میں اس کا وہی مخصوص گٹار کہیں تھا۔ سچ یہ ہے کہ صبح صبح اُس کے چہرے پر جو بناوٹی تھی اور آنکھوں میں غیند کا ہلکا سا جو شمار تھا، اس نے اسے پہلے سے کہیں زیادہ حسین بنادیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ ہم دونوں میں اب کافی شناسائی ہو چکی تھی۔ میں نے جیب سے چند سکے نکال کر اسے دینا چاہے، لیکن اُس نے مسکرا کر میرا ہاتھ روک دیا۔ میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ اس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے بتایا کہ وہ پیسے صرف اپنی گٹار کی دھوئیں لیتی ہے، اور اس نے تو ابھی تک مجھے کوئی دھن سنائی ہی نہیں ہے۔ اس لیے وہ پیسے قبول نہیں کر سکتی۔ مجھے اس کی یہ بات جانے کیوں بہت اچھی لگی۔ میں نے فس کرنا سے کہا کہ یہ آج کی دھن کے پیسے نہیں ہیں۔ دو دن پہلے میں کافی قافلے پر کھڑا اس کی دھن بہت دیر تک سنتا رہا تھا لیکن تب میری جیب میں سکے نہیں تھے۔ یہ اُسی دن کا انوکھا ہے۔ یہ سن کر وہ بھی فس پڑی اور بھراس نے انکار نہیں کیا اور میری ہتھیلی پر پڑے سکے اٹھالے۔ اس دن پہلی مرتبہ اس نے مجھے اپنا نام بتایا۔ ”جینی“ اور مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میرا نام دھراتا اُس کے لیے اتنا آسان نہ تھا۔

”آ۔۔۔ ہاؤ۔۔۔“ مجھے ہنسی آ گئی۔ اس نے ہانکل ایسے کہا تھا کہ جیسے ہمارے ہاں کوئی کہے ”آ۔۔۔ بیل۔۔۔“ مجھے مار۔۔۔ میں نے اسے اپنے نام کا مختصر صورت بتائی۔ ”میڈی“۔۔۔ اس نے خوشی سے دہرایا۔ سینور۔۔۔ میڈی۔۔۔ میں فس کر آگے بڑھ گیا۔ جب تک میں یونیورسٹی پہنچا۔ جب تک یونیورسٹی باقاعدہ پارش کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ کلاس میں بھی اسٹوڈنٹس موجود تھے۔ پہلی کلاس سر آؤٹک کی ہی تھی۔ ان

کے کلاس میں داخل ہوتے ہی کلاس میں سنا سنا چھا گیا اور اعداد و اوز صرف کلاس کی آؤٹچی اوٹچی بڑی شیشے کی کڑکیوں پر پڑتی بارش کی ہوجھان کی تھی۔ کبھی کبھی یہ آواز باقاعدہ ایک جلتے رنگ کی سی کیفیت اختیار کر لیتی تھی۔ سر آ نرک نے پہلے چریٹ میں معاشیات کی چند سوئی سوئی باتیں بتائیں جن میں سے آؤٹچی میرے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ کچھ اس وجہ سے کہ بہت دنوں سے میں کتابوں سے بہت دور رہا تھا اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ میرا دھیان کئی طور پر بکچھری طرف نہیں تھا۔ جب ہمیں ٹائم ٹیبل یاد کیا گیا تھا تو اس میں ایک سبجیکٹ (Subject) میرے لیے قطعی طور پر نیا اور اچھا تھا۔ اس مضمون کا نام ٹائم ٹیبل ٹیٹ میں "ہیومنیرنگس" (Humanerings) دیا گیا تھا۔ آج اس مضمون کا پہلا لیکچر ساڑھے گیارہ بجے ہال نمبر سات میں تھا۔

مجھے اس وقت بڑی حیرت ہوئی جب سر آ نرک پھر سے کلا گاؤن پہنے کلاس میں داخل ہوئے۔ پتہ یہ چلا کہ یہ خاص مضمون خود سر آ نرک کی ہی فرمائش پر کورس میں شامل کیا گیا ہے۔ جلدیادی طور پر لفظ ہیومنیرنگس کا تلفظ کا مرکب تھا نمبر ایک ہیومن اور نمبر دو انجینئرنگ یعنی "ہیومن انجینئرنگ" یا دوسرے لفظوں میں آپ اسے انسانی انسانیات کی تعمیر بھی کہہ سکتے ہیں۔

سر آ نرک کے خیال میں ان کی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل طلباء کو نہ صرف اپنے شعبوں میں کامیابی سے داخل ہونا چاہیے بلکہ انہیں انسانیاتی طور پر بھی اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ وہ اپنے فیصلے پوری قوت کے ساتھ اپنے مختلف محکموں میں رائج کر سکیں۔ اسی لیے خصوصی طور پر انہوں نے ہیومنیرنگس کا یہ سبجیکٹ (Subject) خود اپنے پڑھانے کے لیے منتخب کیا تھا۔ آج پہلے لیکچر کا موضوع تھا "بہت زیادہ عقل مند کی بھی حماقت کا دوسرا نام ہے۔"

سر آ نرک کا کہنا تھا کہ ہم اپنی زندگی میں جن لوگوں کو بہت شدت سے چاہتے ہیں۔ اندر ہی اندر ہم کہیں نہ کہیں اچھانے میں ان سے ایک خاص قسم کی چیز چڑا ہوتی ہے۔ لیکن ان کے پیار میں ہماری بے بسی اور انہیں کھو دینے کا خوف ہمیں ان کے سامنے اس عقاب جذبہ کے اظہار سے روکتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو یہ اندرونی چیز پڑا ہوتی اندر ہی اندر مگر مرکز شدہ نفرت کا ٹرٹ و حصار لیتی ہے۔ اسی لیے جب کبھی ایسے شدید محبت کے رشتے ٹوٹتے ہیں تو ایک ہل میں ہی شدہ نفرت کا ٹرٹ اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ ایک ہل میں ہوئی نفرت دراصل دھچکے بہت بے عرصے سے ہمارے اندر لچھے منقہ جذبات کا گنجد ہوئی ہے۔

اُس دن میں نے محسوس کیا کہ سر آ نرک صرف ایک ایسے اور ماہر معاشیات ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر ایک کلاسٹر ایک وائٹ ورن بھی کہیں چھپا ہوا ہے۔ لیکچر ختم ہونے کے بعد انہوں نے کلاس کو اس موضوع پر اظہار خیال کی دعوت دی۔ میں نے اپنی باری آئے یہ کہا۔

"جذبہ چاہے شدید محبت کا ہو یا شدید نفرت کا۔ دونوں صورتوں میں انسان کو توڑ دیتا ہے۔" میں ذاتی طور پر نفرت سے زیادہ محبت کو خطرناک جذبہ سمجھتا ہوں۔ اور پھر۔۔۔"

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی میرے سامنے بیٹھی سہیرے بالوں والی ایک لڑکی نے خشن اور نفرت سے پلٹ کر مجھے دیکھا اور بولی۔

"کیونکہ لوگوں کی فطرت میں ہی ہر بات سے اختلاف کرنا شامل ہوتا ہے ایسے لوگوں کی تربیت میں ہی خدا اور بہت دھری موجود ہوتی ہے۔"

میں اس لڑکی کو نام سے نہیں جانتا تھا لیکن اس کا رول نمبر بائیس تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ جس دن سے میں یونیورسٹی میں آیا تھا بے لڑکی اور اس کے چار پانچ دوستوں کا مخصوص گروپ کسی نہ کسی طور پر میرے مذہب اور میری قومیت کو ملوث اور مذاق کا نشانہ بناتے رہتے تھے۔ عام طور پر میں ان کی نشی، ان ٹی کر دیتا تھا کیونکہ میں ان بے مطلب کی باتوں میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس دلت ہانے کیوں میں بھی اپنے آپ پر اختیار کھو بیٹا۔

”اس احساس کتری کا ذکر تو مجھے وہ لوگ لگتے ہیں جنہیں بظاہر اپنی تربیت پر بے حد ناز ہوتا ہے لیکن حقیقت میں ان کے اندر کی جہالت کہیں نہ کہیں رنگ دکھائی جاتی ہے۔“

یہ سننے ہی اس رول نمبر بائیس کا رنگ خستے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر مجھے کچھ جواب دینے کی کوشش کی۔ لیکن سر آ نازک نے دو سڑم پر زور سے ڈسٹر مار کر ہم دونوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

”پلیز پلیز۔۔۔ آپ لوگ آپس میں بحث کرنے سے گریز کریں۔ اختلاف رائے ہم سب کا حق ہے لیکن اسے اخلاق کی حدودوں میں ہی رہنا چاہیے۔ مس سارہ میرا، آپ مجھ سے لپچر کے بعد میرے آفس میں ہیں۔“

اس نے میں لپچر ختم ہونے کی تھکنی بھی نہ گئی۔ اس دن مجھے پتہ چلا کہ اس آفس مفت کا نام سارہ ہے۔ دیکھنے میں کسی بہت معقول گھرانے کی لکھی تھی لیکن جانے مجھ سے اس کی کیا پر خاشا تھی۔ سارہ اور اس کا ٹینگ مجھے خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کھاس سے لکل گئے۔ میں نے بھی اپنا بیک گلے میں لٹکایا اور باہر نکل آیا۔ بارش ختم ہو چکی تھی لیکن سردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ میں نے فوراً ہاتھ رگز کر اپنی جیکٹ کی جیبوں میں ڈال لیے۔ اور ابھی آگے بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اینیڈنٹ نے آکر ٹپایا کہ سر آ نازک مجھے اپنے دفتر میں یاد کر رہے ہیں۔

میں نے اس راہ راہی کی طرف قدم بڑھا دیے جس کے انتظام پر سر آ نازک کا دفتر موجود تھا۔ وہی دروازے پر لگی سی دھک دی اور دروازہ کھول کر دیکھا اندر سارہ خستے میں بھری سر آ نازک کے میز کی مخالف سمت پر لی کر سیوں میں سے ایک پر فٹھی ہوئی تھی۔ مجھے اس مختصر وقت میں سارہ کے منہ سے نکلے ہوئے چند الفاظ خائی دیے۔

”مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے ایک مسلمان کو بھائی خاص وجہ کے اپنی یونیورسٹی میں اینڈیشن کیسے دے دیا۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ۔۔۔“ سارہ کی بات آدھی رو گئی کیونکہ میں تب تک اندر داخل ہو چکا تھا۔ سر آ نازک نے مجھے دیکھ کر کہا۔

”آؤ صبر۔۔۔ آؤ۔۔۔“

سارہ پھپھی ہو گئی۔ میں میز کے سامنے لگی دوسری کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ سر آ نازک نے سامنے چلی فاکس پر کچھ نوٹ کر کے اسے بند کر دیا اور پھر نظراٹھا کر ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

”میں چاہتا تھا کہ تم دونوں کا آپس میں تعارف کروادوں۔ شاید اس سے چیزوں کو سمجھنے میں کچھ آسانی ہو جائے۔ سارہ۔۔۔ ان سے ملو۔۔۔ یہ حماد احمد رضا ہیں۔ ان کے دادا برٹش گورنمنٹ میں وائسرائے کے ذاتی خلاف میں نہایت اُردھچے عہدے پر فائز رہے ہیں۔ ہماری یونیورسٹی میں داخلے کی تمام کڑی شرائط پر پورا اُترنے کے بعد ان کا داخلہ منظور کیا گیا ہے، ان کا شمار ہمیشہ سے بہترین طالب علموں میں رہا ہے۔“

سارہ نے یہ ساری گفتگو ایک خاص غصہ بھرے انداز میں سنی۔ پھر آنکھوں سے آنسو بہا کر کہنے لگی: ”میرے سارے دوستوں نے کہا ہے کہ میں ایک بڑی بے وفاء عورت ہوں۔“

اور۔۔۔ تو یہ خوبصورت جلاسر آنرک کی بیٹی تھی۔ ایک بیرون۔۔۔ جیسی اس کے لیے سے ہر وقت ایک خاص قسم کا زہر چکھتا تھا۔ اس وقت بھی وہ چہرہ دوسری طرف کیے۔ سنگم راہ انداز میں چلی ہوئی تھی جیسے اس کے ساتھ دلی سیٹ پر نہیں یا ایک انسان نہیں بلکہ کوئی حقیر کٹڑا کھڑا میٹھا ہو۔ پھر سر آنرک نے ہم دونوں کو کلاس روم کے آداب اور یونیورسٹی ڈسپلن کے بارے میں ایک چھوٹا سا لکچر دیا اور ہم دونوں سے آمید ظاہر کی کہ آئندہ ہماری وجہ سے کلاس کا ماحول تناؤ کا شکار نہیں ہوگا۔ ہم دونوں ہی چپ کر کے سنتے رہے اور پھر ہمیں واپس جانے کی اجازت مل گئی۔ ہم دونوں تقریباً ساتھ ہی کمرے سے نکلے اور ایک دوسرے کو دیکھے، بنا مخالف سنتوں میں روانہ ہو گئے۔ اس دن مجھے احساس ہو گیا تھا کہ شاید میں اس یونیورسٹی سے معاشیات کی ڈگری اتنی آسانی سے لے کر نہیں جا پاؤں گا۔ میرے اور سارہ کے درمیان جس سرد جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ بہت جلد ایک بڑے طوفان کی شکل اختیار کرنے والی تھی۔

☆☆☆

## دجال (شیطان کا بیٹا)

انگریزی ادب سے درآہ ایک فروغ کا ٹولہ۔ علیم الحق حق کا شاندار ائمہ ہیں۔ شیطان کے پھیلاؤ اور مجرور کا دل کا نجات دہندہ شیطان کا بیٹا۔ جسے بائبل اور قدیم صحیفوں میں بیٹ (جانور) کے نام سے مشوب کیا گیا ہے۔ انسانوں کی دنیا میں پیدا ہوا چکا ہے۔ ہمارے درمیان پرورش پا رہا ہے۔ شیطان کا مقصد قدم قدم پر انکی حفاظت کر رہی ہیں۔ اسے دنیا کا طاقتور ترین شخص بنانے کے لیے مجرور سازشوں کا جال بنا رہا ہے۔ معصوم بے گناہ انسان، دافستہ یا نادارستہ جو بھی شیطان کے بیچے کی راہ میں آتا ہے، اسے قوراموت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

وہاں یہودیوں کی آنکھ کا ناروغ جسے یہاں میں اور مسلمانوں کو تہا و بریاد اور عیسیت و نابود کرنے کا مشن سونپا جائے گا۔ یہودی کس طرح اس دنیا کا ماحول وہاں کی آمد کے لیے سازگار بنا رہے ہیں؟ وہاں کی کس طرح تبلیغ اور اشاعت کا کام ہو رہا ہے؟ وہاں کس طرح اس دنیا کے تمام انسانوں پر سکرافی کرے گا؟ 666 کیا ہے؟ ان تمام سوالوں کے جواب آپ کو یہ نادل پڑھ کے ہی ملیں گے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ اس نادل کو شروع کرنے کے بعد شمع کے ہی دم لیں گے۔ وہاں نادل کے تینوں حصے کتاب گھر پر دستیاب ہیں۔

## زہر عشق

میں اس رات ایمان کو اس کے گھر چھوڑ تو آیا تھا لیکن اس پہلے کے بعد مجھے یوں لگتا تھا کہ وہ ہر گھڑی جیسے میرے ساتھ ساتھ ہی رہتی ہو۔ میں نے عشق اور محبت کی بہت سی داستانیں سُن رکھی تھیں لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ اس عشق کا ڈنگ اتنا زہریلا ہوگا۔ ایک ہی پہل میں یہ عشق کا زہر میری نَس میں سرایت کر گیا اور اب میری حالت ایسی تھی کہ دن رات کی تڑپ ہی میرا مقدر تھی۔

محبت بذاتِ خود ایک سبب سے بڑے عذاب کی صورت میں وارد ہوتی ہے۔ اور اگر بد قسمتی سے یہ محبت یک طرفہ ہو تو یہ ہر پہل انسان کو کچھ کے لگاتی رہتی ہے۔ ایک ایک پہل میں انسان سو سو بار جیتا ہے اور سو سو بار مرتا ہے۔

مجھے کوئی صورت بھائی نہیں دے رہی تھی کہ آخر کس طرح ایمان تک میرے اندر لگی اس آگ کی آٹھ بجتی سکے۔ اس کا گھر سے نکلنا محال تھا۔ میں پہلے ہی کئی کئی دن گتھنوں تک اس کے گھر کے باہر پہرہ دے چکا تھا۔ اور اب تو عبد اللہ بھی مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ گھر کے باہر کھڑے رہنے میں اس سے سامنا ہونے کا خطرہ بھی ہر لمحے موجود تھا۔ اور پھر ایمان جیسی لڑکی کو یوں سراہا روک کر بات کرنا بھی اب مجھے بے حد معصوب محسوس ہو رہا تھا۔ جانے وہ اس بات سے میرے متعلق کیا تاثر لیتی؟۔۔۔۔۔ تو پھر کیسے۔۔۔۔۔ آخر اس تک رسائی کیسے ہو۔۔۔۔۔؟ دن رات بس یہی ایک سوال اور یہی ایک دُشمن میرے سر پر سوار رہتی تھی۔

یہ سچ ہے انسان کی آرزوؤں اور خواہشات کی کبھی کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی۔ ہر منزل پر پہنچ جانے کے بعد اُسے وہ منزل ایک سنگِ میل لگنے لگتی ہے اور کوئی نئی اور اگلی منزل اس کی خواہش کا روپ دھار لیتی ہے۔ اور اسی سفر میں ہی انسان کی زندگی تمام ہو جاتی ہے۔ یا پھر انسان کا مقدر ہی ہمیشہ اور کبھی نہ ختم ہونے والا یہ سفر ہوتا ہے۔

کل تک ایمان کی صرف ایک جھلک کو پانا ہی میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ قدرت نے میری یہ خواہش پے در پے کئی مرتبہ پوری کر دی تھی لیکن آج میری التجاؤں کی حد صرف دو کچھ لینے سے کہیں بڑھ کر تھی۔ میں اس تک اپنے جذبوں کی آٹھ پہنچانا چاہتا تھا۔ اپنا یہ احساس اس تک منتقل کرنا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی نہیں سوچتا ہوں کہ شاید انسان کی ناشکری کی بنیادی وجہ بھی کسی مقصد کمی آرزو کو پالینا ہوتا ہے۔ نہ ہم آرزو کو پاتے اور نہ ہی خواہشات ختم لیتیں۔۔۔۔۔ بس ساری زندگی کسی ایک تمنائیں ہی گزر جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔

نہیں ایمان کو اس پارٹی کے بعد دوبارہ کبھی دیکھ پانا اور نہ ہی آج نہیں اس بخوں میں جٹکا ہوا۔ ساری زندگی وہ بدراس کی دوسری جھلک دیکھنے کے لیے ہی جھٹکتا رہتا ہوا چھا ہوتا۔

دن اسی کش مکش میں گزر رہے تھے اور راتیں اسی کرب میں کٹتی تھیں۔ ایک دن شاکر شام کے وقت مجھے ڈھونڈنا ہوا چھت پر آ پہنچا

جہاں نہیں بہت دیر سے بیٹھا جاتی گرمیوں کا سورج ڈھلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ گرمیوں کا سورج ڈھلتے ڈھلتے بھی کتنا وقت لپٹتا ہے۔ جسے رات سے اس کی کوئی جنگ چل رہی ہو، اور وہ اپنی دوست شفقت کو رات کے کالے سایوں کے حوالے نہ کرتا چاہتا ہو۔

”ارے عباد بابا آپ یہاں ہو۔۔۔ کب سے آپ کو محفوظ رہا ہوں، یہ گھبت نہ آپ کے لیے دیا ہے۔“

شاہ کرنے ایک واقعہ میرے حوالے کیا اور پھر وہاں چل دیا۔ پھر جیسے اُسے کچھ یاد آیا۔ ”اور ہاں۔۔۔۔۔ کبہ راہی تھی کہ عباد بھائی سے کہنا کہ اپنا وعدہ جلد ہی پورا کریں۔“ شاہ کہہ بیٹھا کا پیغام دیتے ہوئے اپنے آپ ہی مسکرا دیا اور وہاں سے چلا گیا۔ نہیں نے واقعہ کھول کر دیکھا۔ صرف چند سطریں ہی لکھی تھیں۔

”پیارے بھیا۔“

اپنا وعدہ بھول گئے تھے، اب اسے میری پڑھائی کی بات بھی نہیں کی۔ امتحانات سر پر آ رہے ہیں۔ اگر فارم نہیں بھرے تو میرا سال ضائع ہو جائے گا۔ آپ کی سفاکاری کی منتظر۔۔۔“

تب مجھے یاد آیا کہ واقعی میں نے گھبت کی معافی کے دن اُس سے شاہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب بھلا اُسے کیا خبر کہ آج کل تو مجھے اپنا ہوش بھی نہیں رہتا تھا۔ کسی سے کیے ہوئے وعدوں کا کیا بھرم رکھ پاتا۔ لیکن میں نے اسی وقت فیملی گر لیا تھا کہ آج ہی شاہ سے اس مسئلے پر حتمی بات کروں گا۔ نہیں جانتا تھا کہ شاہ میری بات کبھی رد نہیں کرے گا۔ اور اس کے لیے اگر ہم دونوں کو گھبت کے سنگین کر کے پاس بھی جانا پڑتا تو نہیں اس کے لیے اپنی طور پر تیار تھا۔

میں گھبت کا وعدہ اپنے ہاتھوں میں پکڑے پوچھی خانی الذہن سا بیٹا ڈوبے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ تھی اچانک میرے ذہن میں جیسے ایک جھماکا سا ہوا۔ گھبت۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ گھبت بھی تو وہ ذریعہ ہو سکتی تھی۔ وہ ایمان اور حیا کی کھلی تھی۔۔۔۔۔ ایمان تک براہ راست پہنچنے کا واحد ذریعہ۔۔۔۔۔ حیرت ہے۔ اسے دن پہلے تک نہیں دیا ہوں سے نگرانا رہا لیکن مجھے گھبت کا خیال کیوں نہیں آیا؟

اور اب جب یہ خیال میرے ذہن میں آئی گیا تھا تو جیسے میری بے چینیوں کو بھی اک نئی راہ مل گئی تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طور اُس کر شاہ کے گھر پہنچ جاؤں۔ بحر طور میں نے جیسے تیسے کر کے وہ رات کاٹی۔ اور اگلی صبح سویرے ہی میں نے اپنی حویلی پہنچ گیا۔ گزری شام میں نے شاہ کے جاتے جاتے اس سے گھبت کی مزید تعلیم کے مسئلے میں بات بھی کر لی تھی۔ شاہ کرنے نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ گھبت کے سنگین عامر سے اس مسئلے میں خود بات کر لے گا۔

گھر سے نکلتے ہوئے میں شاہ کو بتاتے ہوئے آیا تھا کہ میں نے اپنی حویلی کی طرف ہار ہا ہوں۔ یہ ایسی کوئی خلاف معمول بات نہیں تھی۔ میں گئی مرتبہ اپنے دوستوں کی وہاں پارٹی ہو رہی تھی۔ کامران جب بھی لندن سے واپس آتا تو ہم دونوں کو ان رات کا ٹھکانا دہی نے اپنی حویلی ہی ہوتی تھی۔ تب میں کتنا زبرد دل تھا، ہر وقت اس حویلی کے در و دربار ہمارے قہقہوں سے، حمیزہ زدک سے اور ہمارے ہلے کھلے سے گونجتے رہتے تھے۔ ایسے میں ہم گھبت اور خالہ سے ہی فرمائش کر کر کے مزے سے کچاں ہواتے تھے۔ خاص طور پر سوان کی باریشوں میں ہم بھر

پائیس بائیں میں دھما پکڑی چاتے۔ پھر پائیں کھوائی جاتیں۔ سوسے اور پکڑے بخوائے جاتے کولہڑا رک کے کر بیٹ بائیں میں باقی صاف پانی کی تالی میں رکھوا دیے جاتے۔ آمون کی بڑی بڑی نوکریاں پچھلوں میں لدوا کر حویلی کے فوٹ خانے میں پکڑوا دی جاتیں۔ آ۔۔۔۔۔ ابھی چند ہفتے پہلے تک مٹیاں کس قدر بھیتا جاتا انسان تھا۔ اس ایک محبت نے تو جیسے میرے جسم سے روح تک ہی چھوڑی تھی۔

گھبت اور خالہ کا معمول تھا کہ ان میں سے جس کسی کو بھی میرے حویلی پہنچنے کی اطلاع کسی چوکیدار وغیرہ سے ملتی تو وہ فوراً میرے ساتھ آنے والے مسلمانوں کے بارے میں پوری معلومات کر کے فوراً پائے ناشتہ وغیرہ بھجوا دیتیں۔ میں کبھی تجا ہوتا تو گھبت خود آ جاتی اسے نت نئی کتابیں پڑھنے اور منگوانے کا بہت شوق تھا کہ اسے سناؤ وہ مکمل کر کوئی فرمائش کر ہی نہیں پاتی تھی کیونکہ شا کر اس کی فرمائشوں پر اسے جھڑک دیتا تھا۔

اس دن بھی یہی ہوا جیسے ہی گھبت کو میرے آتے کی خبر ہوئی۔ وہ کچھ ہی دیر میں چائے اور ٹکین بسکٹ وغیرہ ایک ٹرے میں رکھ کر وہاں آ کر بیٹھی۔ اس دن گھبت کے چہرے سے ہی خوشی پھوٹ رہی تھی۔ پھر چاکلی دات ہی شا کرنے اُسے اپنے طور پر آگے پڑھنے کی اجازت دے دی تھی۔ اور وہ جانتی تھی کہ یہ سب میری ہی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ اس نے آتے ہی میرا غلوں دل سے شکریہ ادا کیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اپنی بات کا آواز کہاں سے کروں۔ گھبت بھی میری کشمکش کو بھانپ گئی۔

”کیا بات ہے عمو بھائی جان۔۔۔۔۔ آپ کچھ کھو گئے کھوئے سے لگ رہے ہیں۔“ گئی۔۔۔۔۔ اُس دن مغللی میں تھیں وہ لڑکی یاد ہے۔۔۔۔۔ وہی جو مجھ سے اندر میرے کمرے میں ٹکرائی تھی۔“

گھبت اپنی ہی دھن میں کپ میں چائے اٹھالیتے ہوئی بولی۔

”کون۔۔۔۔۔ اے ہاں۔۔۔۔۔ امی جان نے مجھ کو بتایا تھا“ گھبت کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

”وہ ایمان تھی۔ ہمارے بڑا نے مجھے میں رہتی ہے۔ مولوی عظیم الدین صاحب کی بیٹی ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے بھیا۔“

پھر جیسے گھبت کو کچھ شبلی آیا اور وہ فورے میری طرف دیکھنے ہوئے ہوئی ”خیر تو ہے بھیا۔ آپ ایمان کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں۔“

اس کی آنکھوں میں ایک خاص شرارت تھی۔ میں کچھ گڑبڑا سا کیا۔ دل کے کچھ سچ چھپانا کس قدر مشکل ہو جاتا ہے۔ جس گھبت کی ہم سب مل کر مٹھی اور شادی کے نام پر خوب کھپائی کیا کرتے تھے، اتنی کہ وہ اکثر رونے لگ جاتی تھی۔ آج اس کی ایک معصوم شرارت بھری مسکان نے مجھ سے میرا تمام اعتماد ہی جھین لیا تھا۔ شاید دل میں چور ہونا ہی کہہ سکتے ہوں گے۔

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔ وہ دراصل نہیں۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔“

گھبت نے میری چوری چکاری۔

”ہوں۔۔۔۔۔ تو یہ بات ہے۔۔۔۔۔ بھیا۔ دیکھیں اس کے ساتھ کوئی شرارت نہ کیجئے گا۔۔۔۔۔ وہ بہت بھولی بھالی سی لکلی ہے میری۔۔۔۔۔ اور بہت لمبی گھرائی سے قفل ہے اس کا۔“

گھبت میری بہت سی سلیلوں کے بارے میں جانتی تھی۔ وہ میری تمام دوستوں کو میری سلیلیاں ہی کہتی تھی۔ اور ایمان کے بارے میں



میری پوچھ گچھ کو بھی میرے انخیزنے والے معمولات میں سے ایک سمجھ رہی تھی۔ میں نے گھٹ کا ہاتھ پکڑ کر اسے دھیں اپنے پاس بٹھالیا۔  
 ”جینو یہاں۔۔۔ اور غور سے میری بات سنو۔“

میں نے ”الف“ سے ”سی“ تک آپ تک کی تمام کہانی گھٹ کو سن دینی تھی۔ گھٹ حیرت سے میری رام کھانسی رہی۔  
 ”اب تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں۔۔۔ میں بہت مشکل میں ہوں ابھی۔۔۔“ ہوں۔۔۔ یہ تو خاصا سمجیر معاملہ ہے۔۔۔ تو ایمان بی بی نے میرے پیار سے بھیا کی خیریں حرام کر رکھی ہیں۔۔۔ لیکن بھیا۔۔۔ آپ جیسا سمجھ رہے ہیں۔۔۔ دو دیکھی لڑکی نہیں ہے۔۔۔ ساری زندگی کسی ناخمر سے بات کرنا تو ذور کی بات ہے۔۔۔ اس پرانی کسی چیز کا سایہ تک نہیں پڑا۔ اپنی ساری تعلیم بھی اس نے پردے میں ہی حاصل کی ہے۔ اسے اپنی اور اپنے گھر کی عزت اپنی جان سے بھی پیاری ہے۔ مجھے کاہر گرائے اسے اپنی ہونٹا جانتا ہے اور آپ سے پہلے بھی کئی نوجوان اس کی ایک جھلک کے لیے سالوں اس کے گھر درگاہی کے چکر کاٹتے رہے ہیں۔ لیکن ایمان نے نظر اٹھا کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھا۔ میرا آپ کو بھی یہی مشورہ ہے کہ آپ اس کا خیال اپنے دل سے نکال دیں۔۔۔ دو ذور سے غمی یہ بڑی ٹیڑھی کھڑ ہے۔ آپ کا تو کچھ نہیں بگڑے گا البتہ میں اپنی سب سے پیاری دوست کو ہمیشہ کے لیے کھودوں گی۔“

مجھے گھٹ کی بات سن کر قہقہہ آگیا۔ میں اڈھ کر جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ تم رہنے دو۔۔۔ میں خود ہی کچھ کر لوں گا۔“

میں نے جانے کے لیے قدم آگے بڑھائے۔ گھٹ نے جاتے جاتے میرا ہاتھ پکڑ لیا اس کے چہرے پر شہری مسکراہٹ تھی۔

”ادھو۔۔۔ در دھو گئے پیارے بھیا۔۔۔“ لگتا ہے آپ واقعی ایمان کے لیے سنجیدہ ہیں۔۔۔ پھر تو واقعی کچھ کرنا ہی پڑے گا۔“

”تو پھر کچھ سوچو۔۔۔ آخر تم کس مرض کی دوا ہو۔ اپنے بھیا کا اتنا سا کام نہیں کرو گی۔“

میں اور گھٹ سر جو ذکر پہنچ گئے اور ایمان تک یہ راز دل پہنچانے کے مختلف طریقوں پر غور کرنے لگے۔ کبھی مجھے کوئی طریقہ سو بہت تو گھٹ اسے رد کر دیتی اور کبھی گھٹ کے ذہن میں کوئی بات آتی تو وہ طریقہ مجھے نہ بھاتا۔ اسی شش و پنج میں ہاتھ کتنی دیر بیت گئی لیکن کسی کم کسی قسمی فیصلے پر نہ پہنچ پائے۔ میں نے گھٹ کو ایمان کے نام ایک مختصر سارا قلم لکھ کر دیے کی جو یہ بھی دی تھی جین گھٹ نے صاف انکار کر دیا تھا اس کے کہنے کے مطابق ایمان کبھی اس رشتے کو کھول کر نہ پڑھتی اور اسے بھارا دیتی۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اس بات پر گھٹ سے بھی ہمیشہ کے لیے بات چیت بند کر رکھتی تھی۔

تھک ہار کر میں تو سر قہقہہ کر رہی ہوں بیٹھ گیا۔ گھٹ سے اپنے لاڈلے بھیا کی یہ حالت دیکھی نہیں گئی اور اس نے حیا کو اس معاملے میں اپنا راز دار بنانے کی ضمان لی۔۔۔ مٹے یہ پایا کہ گھٹ کسی بہانے ایمان اور حیا کو اپنے گھر بلاوے کی۔ حالانکہ اس معاملے میں مولوی صاحب بہت سخت اصول پسند واقع ہوئے تھے لیکن گھٹ کے مطابق وہ ایک بار انہیں مولوی صاحب سے بھی اجازت دلا دیتی دے گی چاہے اس کے لیے اسے خود مولوی صاحب کی مشق ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ اس دن مجھے بھی اطلاع کر دی جائے گی اور گھٹ چند لمحوں کے لیے میری ایمان سے جہاں میں ملاقات کا بندوبست کروا دے گی۔ میں جانتا تھا کہ گھٹ کے لیے یہ سب کس قدر مشکل ثابت ہوگا لیکن میری محبت میں اس نے اپنی بچپن کی دوستی کو داؤ پر لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ٹپے پاپا کما آنے والی جعرات کو اس منصوبے کو پانیہ پھیل چکے تھے۔ لیکن میری وہاں سے واپسی تک نگہت نے ہزاروں بار مجھے سے تصدیق چاہی کہ میں کہیں ایمان سے قلمت تو نہیں کر رہا۔ کہیں وہ بھی کہیں میری بہت سی سہیلیوں کی بھیڑ میں کھو نہ گیا۔ آخر کار مجھے اس کے کان پکڑ کر اُسے یقین دلانا پڑا۔ قصور اس کا بھی نہیں تھا اس کی بچپن کی کھلی تھی ہی۔ ایک ایسی گوربا یا پ۔۔۔۔۔ اس نے مجھے نگہت پر بے حد رشک بھی آیا۔ وہ کتنی آسانی سے اس مرد و اس گل رخ سے مل سکتی تھی، بات کر سکتی تھی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام سکتی تھی۔ میرا ہی چاہ رہا تھا میں گھٹنوں میں بیٹھا نگہت کے ساتھ ایمان کی باتیں کرتا رہوں۔۔۔۔۔ اس سے ایمان کی باتیں سنتا رہوں۔۔۔۔۔ محبت میں محبوب کا ذکر بھی کس قدر جاس فرما ہوتا ہے۔ جس اُس کے ذکر سے ہی بھوک پیاس ٹپتی رہتی ہے۔ صدیاں گزریں میں بیت جاتی ہیں۔ فضا بونہی خولہ خواہی دل کش لگتے لگتے ہے۔ آس پاس کا بھی شور بھی جیسے فضا میں دھل جاتا ہے۔ سخت جس زد و پھیل دھوپ میں بھی جیسے نہ وائیاں ہی چلتی محسوس ہوتی ہیں۔ رات اور دن سب ایک خواب زدہ ہی کیفیت میں گزرتے رہتے ہیں۔ ہونٹوں پر اپنے آپ ہی ہانسی بات کے ایک خاص میٹھی سی مسکان پھیلی رہتی ہے۔ سب دشمن بھی دوستوں جیسے پیارے لگتے لگتے ہیں۔ جانے کیا کچھ ہونے لگتا ہے۔

میں بھی اگلی جعرات کے آنے تک انہی سب محسوسات سے گزرتا رہا۔۔۔۔۔ کہتے ہیں ایک طرف عشق و سوسوں کا گھر ہوتا ہے۔ مجھے بھی اچانک عجیب سے دوسرے ڈسنے لگتے۔ پتہ نہیں وہ آج بھی پائے گی یا نہیں؟ کہیں مولوی صاحب منع ہی نہ کر دیں۔ وہ مجھ سے ملے گی بھی یا نہیں؟۔۔۔۔۔ جانے وہ میری اس کوشش کو کیا معنی دے گی۔۔۔۔۔؟

آخر جعرات کا دن بھی آ ہی کیا۔ نگہت نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اس کے مطابق سہ پہر میں سے چار بجے کا وقت اس ملاقات کے لیے نہایت مناسب تھا۔ گرمیوں کی اس لمبی سہ پہر میں ہر طرف سناٹا ہی چھا رہا تھا۔ پلان کے مطابق مجھے دو بجے ہی زبانی حوالی پہنچ جانا چاہیے تھا۔ حوالی کے بارے میں براہ راست سے کہتا تھا ہی۔ جہاں گرمیوں کے موسم میں دھوپ سے بچاؤ کے لیے بڑی بڑی پتلیں لٹائی جاتی تھیں، ایک بڑا سا کمرہ تھا جسے ہم حشدر کمرہ کہا کرتے تھے۔ اصل میں یہ کبھی دادا کی اسٹڈی تھی۔ کمرے کی تعمیر میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ گرمیوں میں ہوا کے رخ پر ہولنڈ اسٹڈی جتنی دور پہرہ میں بھی یہ کمرہ حشدر ہوتا تھا۔ اب بھی اس کمرے کے فلیٹ نادر کتب سے مبرے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے بچپن میں گرمیوں کی لمبی لمبی آبی اور پہرہ میں ہم اس کمرے میں اونٹن سے پڑے ڈارزن اور مرغیاری کی کہانیاں پڑھتے ہوئے گزار دیتے تھے۔

نگہت نے ایک اور انکشاف بھی کیا تھا کہ ایمان کو اچھی آواز میں پڑھنے کا جتن تھا، اور اس معاملے میں وہ اکثر نگہت سے کتابیں مستعار لیتی رہتی تھی۔ نگہت نے اُسے میرے دادا کی اس اسٹڈی بند کر دیتی تھی۔ آج میں خصوصی طور پر اسٹڈی کی چابی لے کر حوالی آیا تھا اور نگہت نے بھی ایمان کو اسٹڈی دکھانے کے بہانے ہی حوالی طلب کیا تھا۔ البتہ حیا کو وہ دھم دھم دے لے چکی تھی کہ اصل میں مقصد میری ایمان سے ایک ملاقات کا اہتمام ہے۔

مجھے اسٹڈی میں ہی ان کا انتظار کرنا تھا۔ نگہت حیا اور ایمان کو لے کر اسٹڈی دکھانے آئی تو انہیں چند لمحوں میں مجھے ایمان سے اپنے دل کی بات کہنی ہوگی۔ اب یہ آگے میرا نصیب تھا کہ وہ میری بات سن کر رکتی یا پھر مجھ سے پلٹ جاتی۔۔۔۔۔ میں اسٹڈی میں اسی شخص و بیٹا میں بیٹھا

سامنے لگی کلاڑی کی بڑی سی قدیم کمڑی کی سونپیاں گن رہا تھا۔ ابھی صرف دن کے ڈھائی بجے تھے اور مجھے یہاں پہنچنے صرف آدھ گھنٹہ ہی ہوا تھا لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے نہیں جانے کتنی صدیوں سے یہاں بیٹھا ہوں۔ بخلائی کے بڑے سے روشن دان میں چڑیوں نے اپنا گھونٹا بٹار کھا تھا اور اس وقت چڑیا بھی اپنے بچوں سمیت اپنے گھونٹے میں سستا رہی تھی۔ روشن دان سے سامنے کی دیوار پر پڑتی دھوپ دھیرے دھیرے سرک رہی تھی اور دھلتے دھلتے دیوار پر ملنے والے پتھر کی تھی۔ کبھی کبھی یہ انتظار بھی کتنا جان لیوا ہوتا ہے۔ انسان کو اپنی سانسیں تک رکھی محسوس ہوتی ہیں۔ میں نے گھبرا کر اس پاس کی الماریوں میں لگی کتابوں کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ لیکن حرف میری آنکھوں کے سامنے گڈمڈ سے ہونے لگے۔ ہر آہٹ پر میں جیسے انہیں ہی تو پتا نہ تھا، لیکن ہر آہٹ کے بعد باہر سے طویل سناٹا چھا جاتا۔ گرمیوں کا مخصوص اور غول سناٹا جس میں وقفہ وقفے سے دور کسی درخت پر بیٹھے کونے کی کانیں کانیں کے علاوہ اور کوئی بھی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ پھر حویلی کے باہر سے گزرتی لمبی کالی سٹان مرکز پر کسی نالے کی گزر نے کی آواز، یا پھر کسی موٹر گاڑی کی گھر گھر۔۔۔۔۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ آفریقین بچے، مہرے دوسرے بڑے مگے، خیمیں، وہ خیمیں آئے گی۔۔۔ حیات نے اُسے گھٹ کے سارے منصوبے کے بارے میں بتا دیا ہوگا۔ وہ گھٹ سے بھی ناراض ہوگئی ہوگی۔ ہمیں ایسا منصوبہ بنانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ جانے وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہوگی۔ یہ سب فطرتی ہی میری ہے۔

جانے دل میں کیسے کیسے وہم آنے لگے تھے۔ سوائتین بجے تک تو میرا مبر بھی جواب دے گیا۔ میں نے گھبرا کر وہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جیسے ہی میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے، ڈور برآمدے کے موڑ سے کچھ قدموں کی چاپ سنائی دی، اور چند سوائی فنی اور باتوں کے جلتے رنگ سے دور سے جھٹ سنائی دیئے، کوئی اس طرف آ رہا تھا۔ میری سانسیں رک گئیں۔ یہ تو اسی کے قدموں کی چاپ ہے۔۔۔۔۔ یا خدا۔۔۔۔۔ مجھے ہمت عطا کر۔۔۔۔۔

اچانک دروازہ کھلا اور سب سے آگے گھٹ اور اس کے پیچھے ایمان اور اس کے پیچھے حیا سکرانی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ گھٹ نے مجھے دیکھ کر مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

”السلام یلکم۔۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔۔ حماد کھتا آپ۔۔۔۔۔ یہاں۔۔۔۔۔ اس وقت؟“ میری توقع کے عین مطابق ایمان کے چہرے پر گھبراہٹ اور سرایتنگی سی پھیلی گئی۔ اُس نے پوچھا کہ میری طرف دیکھا اور فوراً جانے کے لیے پلٹی، لیکن حیا اس کے راستے میں اس کے پیچھے ہی کلاڑی ختمی ہلڈ اس کا راستہ رک گیا۔ گھٹ نے بھی جاتی ایمان کا ہاتھ مصنوعی سے تھام لیا۔

”شاید تمہاری دوست کو میری یہاں موجودگی کچھ پتہ نہیں آئی۔ میرا خیال ہے مجھے یہاں نہیں رکنا چاہیے۔“

ایمان نے گھبرا کر پھر سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ گھٹ نے اُسے نظروں نظروں میں ہی گھورا، پھر جلدی سے ہوئی۔

”نہیں نہیں بھئی۔۔۔۔۔ ہم تو دراصل یہاں کچھ پرانی کتابیں دیکھنے آئے تھے۔ دراصل ایمان کو اچھی کتابیں پڑھنے کا جنون ہے ہائیں

اسی لیے۔۔۔۔۔“

اب ایمان نے تجھ کو کھانا پانے والی نظروں سے دیکھا۔ لیکن تجھت نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رکھا۔

”ضرور۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔ آپ لوگ کتابیں دیکھئے۔۔۔ میں ابھی حاضر ہوا۔“ میں جلدی سے اسٹڈی سے نکل گیا۔ مجھ میں اس کی جا ب دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ آج اس نے کالے رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور کالے دوپٹے میں کچھ زیادہ ہی غضب و خمار تھی۔ دروازہ کھول کر میری آنکھوں میں اس کی لرزتی چٹکیں اور کالمچے ہونٹوں کا متحضر ہنجر ہاتھ اور اس کی وحی ایک پریشان سی ثابت۔۔۔۔۔

باہر برآمدے میں کچھ دیر کھڑا میں اپنے حواس قابو میں لانے کی کوشش کرتا رہا۔ سارا معاملہ ہی الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں کسی ایسا نہ تجھت کو حیا سمیت چند گھنٹوں کے لیے باہر برآمدے میں بھیج دیتا اور ایمان سے بات کر لیتا لیکن آئے دیکھ کر میں سب بھول کر خود ہی باہر نکل آیا تھا۔ مجھے اپنے اوپر شدید فضا بھی آ رہا تھا۔ شاید اب دوبارہ اس سے بات کرنے کا کبھی موقع نہ مل سکے۔ شاید میں یہ بازی ہمیشہ کے لیے ہار چکا تھا۔

اس نے جسے جسے سے بھرے اشاروں میں پوچھا کہ بھلا یہ کیا بات ہوئی؟ جواب میں میں نے صرف کاغذ سے اچکا کر ہی رہ گیا۔ پھر تجھت نے اندر حیا کو کچھ اشارہ کیا اور حیا بھی باہر نکل آئی۔ میں اب بھی گم سم اور گنگ سا وہیں کھڑا تھا۔ تجھت آگے بڑھی اور میری کلاہی تھام کر کھینچ کر مجھے اسٹڈی کے دروازے تک لے آئی اور مجھے اندر دھکا دیتے ہوئے فیس نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

”صرف تین منٹ۔۔۔۔۔“

میں گھبرا یا ہوا سا تجھت کے دھکے کے زور میں اسٹڈی کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ ایمان ڈور آخری الماری کے قریب کھڑی کسی کتاب کی درجہ گردانی کر رہی تھی۔ آہٹ ہوئی تو اس نے بے دھیانی میں پیٹ کر دیکھا۔ شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ تجھت اور حیا دونوں خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی ہیں اور ان کی جگہ اب میں دروازے پر کھڑا ہوں۔ گھبراہٹ کے مارے میں اس کے ہاتھ سے کتاب پیچھے گر گئی۔ اس نے سر کا پلجہ جلدی سے ٹھیک کیا اور باہر جانے کے لیے چلی۔ لیکن اس کا سب سے بڑا مسئلہ اس وقت یہ تھا کہ اسٹڈی میں آنے اور جانے کا صرف ایک یہی بڑا سار دروازہ تھا جس کے پچھلے بیچ میں اس وقت کھڑا تھا۔ جس قدر تیزی سے اس نے قدم بڑھائے تھے۔ اتنی ہی جلدی اسے رکتا بھی پڑا۔ پہلے ہی اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اور دوسرا جھکاؤ، دیکھا کہ کمرے کے بیچ و بیچ کھڑی تھی۔ شاندا اسے تجھت اور حیا پر بھی شدید فضا آ رہا تھا اور ان کی منسوبہ بندی بھی اب اس کی سمجھ میں آ چکی تھی۔ چند لمبے ہم دونوں خاموش رہے اور صرف ہمارے درمیان موجود خاموشی بولتی رہی۔ مجھے اس کی سانسوں تک کی آواز اس سانسے میں گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اس نے اپنی ہمت مجتمع کی اور اس کی آواز کا شر کمرے میں گھبراہٹ۔ اس کے وجود کی طرح اس کی آواز بھی لرز رہی تھی۔

”میں باہر جانا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ آپ دراستہ چھوڑ دیں۔“ میں نے پہلی مرتبہ اس کے منہ سے اسے بہت سے لفظ اکٹھے سنے تھے۔۔۔۔۔

کچھ دیر تو میں بالکل مہووت سا کھڑا رہا۔ پھر کا ایک جیسے مجھے ہوش آیا۔

”آپ کا راستہ اس طرح روکنے کی معافی چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے میری یہ حرکت تمام عمر کے لیے مجھے آپ کی نظروں سے گرا

دے۔۔۔ لیکن یقین چاہیے۔۔۔ میں نے بہت مجبور ہونے کے بعد یہ قدم اٹھایا ہے۔۔۔ پلیز۔۔۔ مجھے ملال نہ سمجھئے۔۔۔  
 ”آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔ مجھے جانے دیجئے۔۔۔ خدا کے لیے۔“

اس کی آواز اب بھر گئی تھی۔ آنسوؤں کا ارتعاش اس کی پلکوں کے گرد جمع ہو کر چمکنے کو ہے تب اب ہورہا تھا۔

”میں صرف آپ سے اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے۔ میرا آپ میرا اپنا نہیں رہا۔ میرے پاس شاید وہ لفظ ہی نہیں ہیں جن سے میں اپنی کمبلیت آپ پر ظاہر کر سکوں۔۔۔۔ میرے جذبے کے لیے اس وقت دنیا کی سبھی خوشیوں میں موجود ہر لفظ مجھے عامیانا لگ رہا ہے۔ شاید میرا یہ طریقہ بھی بے حد عامیانا اور ہٹکا ہے لیکن میں کیا کروں۔۔۔۔ میرے پاس اور کوئی ذریعہ تھا بھی نہیں۔ یہ میری اور میرے دل کی شدید مجبوری ہے جس نے مجھے آپ تک اپنی بات پہنچانے کے لیے ایسا کرنا ہوا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔۔۔۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجئے گا۔“

وہ اب بھی پوچھی خاموشی میں سر جھکائے کھڑی بیٹھے تھے تاہم میں نظریں گاڑے ہوئی تھی۔ اس نے مجھ کو ہی بات ڈہرائی۔

”آپ نے اپنی بات کہہ دی۔۔۔ اب مجھے جانے دیں۔۔۔ میں آپ کی منت کرتی ہوں۔“

”مجھے آپ کے جواب کا انتظار ہے گا۔“

میں اس کے راستے سے ہٹ گیا۔ وہ آواز کے ایک جھونکے کی طرح وہاں سے اپنا نازک وجود سنبھالتی ہوئی نکل گئی۔ بس اس کی خوشبو کمرے میں بکھری رہ گئی۔ میں نے باہر کے برآمدے کی طرف اسٹاپ کی کھلنے والی کھڑکی میں آسے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ تجھت اور حیا کے پاس زکے بغیر آگے بڑھ گئی۔ تجھت آسے آواز میں دیتی ہوئی اس کے پیچھے بھاگی۔ حیا کی نظر کھڑکی سے ہوتی ہوئی مجھ پر پڑی اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ اس نے مسکرا کر مجھے آداب کیا اور پھر وہ بھی ایمان کے پیچھے بھاگ گئی۔ مجھے اس لیے حیا بہت اچھی لگی۔ اس لڑکی نے ایک انجانے انسان پر اعتبار کر کے اپنی جان سے پیاری بہن کو اس سے ملنے بھیج دیا تھا۔ جانے تجھت نے آسے کے کس طرح میرا اعتبار دلا دیا ہوگا۔ بہر حال جو بھی تھا، فی الحال تو تجھت اور حیا وہ دونوں کی ہی خیر نہیں تھی۔ ظاہر ہے ایمان ان سے شدید ناراض ہو گئی ہوگی۔ جانے اب وہ دونوں اسے کس طرح سنا سکیں گی۔

میں بہت دیر تک اس کمرے میں پونجی کھڑوہ سا بیٹھا رہا۔ جانے کیوں وہاں سے باہر جانے کے لیے میرا دل ہی نہیں مان رہا تھا۔ میں بار بار اس منظر کو آنکھیں بند کر کے محسوس کرنا چاہتا تھا جب وہ ناز بیکر ہمیں اس کمرے میں سر جھکائے میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کا نازک وجود کسی بچے کی طرح لرز رہا تھا۔ اور وہ مجھ سے ہم کھلم تھی۔

دھوپ داخل ہوئی تھی اور اب روشن دان سے اندر چھٹنے والی روشنی میں وہ حدت باقی نہیں تھی۔ میری کھڑکی پر نظر پڑی تو شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ بادل غراستہ میں وہاں سے اٹھا۔ اچانک میری نظر اس کتاب پر پڑی جو ایمان کے ہاتھ سے چھوٹ کر مجھے مل گئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر کتاب اٹھائی۔ بانو قدسیہ کی ”راہِ گمراہ“ تھی۔ اچانک میری نظر کتاب کے پاس ہی پڑے دو چھوٹے سے سوجھوں پر پڑی۔ ایسے موتی تو میں نے ایمان کے بیڈروں میں لگے دیکھے تھے۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ مجھ سے بات کرتے ہوئے اس کی نظر پھر اوقت زمین میں

گڑی ہوئی تھی اور میری نظر بھی اس کے نظر کے تعاقب میں اس کے قدموں کی طرف کئی بار اٹھی تھی۔ سرور جب اس کے ہاتھ سے کتاب گری ہوئی تو اس کے قدموں سے گر گئی ہوئی۔ تجھی یہ موتی علیحدہ ہو کر گر پڑے ہوں گے۔ میں نے وہ دونوں موتی اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیے۔

اب گھٹ کا انتظار کرنے کا فائدہ نہیں تھا۔ مجبوراً میں ٹوٹے قدموں سے وہاں سے نکل آیا۔ رات بھر میری پلکوں تلے دو سارے منظر کسی فلم کی طرح چلتے رہے۔ میری حالت اس نالائق طالب علم کی سی تھی جو پرے میں ایک بھی سوال ٹھیک طرح سے حل کر کے تو آیا ہو لیکن پھر بھی اُسے نتیجہ کا بے چینی سے انتظار ہو۔

گنجی گنجی ہم زندگی میں کچھ ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ہمیں نتیجہ کی کیفیت سے زیادہ نتیجہ کا پتہ چل جانے کی جلدی ہوتی ہے۔ ہمیں اس بات سے غرق نہیں ہوتا کہ فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا یا مخالف میں، ابس فیصلہ ہو جانے کی اتنا ہوتی ہے۔ عام طور پر ایسا کمزور اعصاب والوں کے ساتھ ہوتا ہے جو انتظار کی اذیت اور جھجھک کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے اور جتنی دباؤ کے ہاتھوں ٹک آ کر روحانی دینے لگتے ہیں کہ کسی جو بھی ہوتا ہے وہ آج ہی ہو کر رہے۔ ایسے لوگ اس وقت اس بات سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں کہ جس نتیجہ اور جس فیصلے کا اپنی مخالفت میں طے ہو جانے کا خیال ہی انہیں اس قدر دہکان کر رہا ہے کہ وہ بے چینی سے اس کے اعلان کی دعائیں کر رہے ہیں، وہ فیصلہ اعلان ہونے کے بعد جب واقعی ان کے حق میں نہیں ہوگا تو تب ان کا کیا حشر ہوگا۔۔۔۔۔؟

میری کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی اس رات۔ مجھے ایمان کے فیصلے کا انتظار تھا اور میں ایک ایسے کرب سے گزر رہا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو، بس مجھے جلد از جلد اس کا فیصلہ سنائی دے دیا جائے۔ شاید اس جلد بازی میں میرے دل کی ایک اور چوری تھکا کا بھی عمل داخل تھا۔ میرا دل اس وقت کسی طور بھی اس دلہری کی طرف سے کسی رابطہ کسی کام کی خواہش میں مغل رہا تھا، میں چاہتا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر بس میرا نام آئے۔۔۔ چاہے، برسرِ انرام ہی آئے۔ جانے عشق میں یہ دل ایک چھوٹے بچے کی طرح کیوں بڑاؤ کرنے لگتا ہے۔ عشق میں دل کو صرف اسی پل، اسی لمحے، اسی دن کی لگر ہوتی ہے جو گزر رہا ہوتا ہے۔ مستقبل کا ڈر، خوف یا دوسرے اس سے کوسوں دُور ہوتے ہیں۔ عشق کو بس حال سے غرض ہوتی ہے۔ عشق انجام سے بے خبر اور لاعلم ہوتا ہے۔

جانے وہ رات کیسے ڈھلی اور کب صبح ہوئی۔ میرا پی چار رہا تھا کہ میں اڑ کر نکلتے کے پاس پہنچ جاؤں اور اس سے کل کی تمام روداد پوچھوں، کر کے کر کے سوال کروں۔ لیکن روز بروز یوں لگتی چلی جانا بھی تو کچھ ٹھیک نہ تھا۔ تجھت میری مذہبی مہن سی تھی لیکن آس پاس جو بلی کے دوسرے نوکر چا کر بھی تو تھے۔ جانے وہ میرے روز روز کے یوں وہاں آئے اور تجھت سے شہابی میں ملنے کو کیا رنگ دیں۔ پھر میں نے خود ہی ان فضول خیالات کو سر سے جھٹک دیا۔ یہ نہیں کیا سوچ رہا تھا، یہ بے بنیاد سے وہم میرے اندر رکھاں سے پلٹنے لگے تھے۔۔۔؟ شاید محبت انسان کو اپنے اوپر شک کرنا بھی سکھا دیتی ہے۔

سازمے گیارہ بجے ٹاکر مجھے ڈھونڈتا ہوا میرے کمرے تک آن پہنچا۔ میں ابھی تک کمرے میں ہی بند تھا صبح سے، ٹاکر نے مجھے گھٹ کا دیکھا ایک بند لٹاؤ تھا میرا اور حسب معمول پوچھا۔۔۔۔۔ "بابا۔۔۔۔۔ کل آپ جو بلی گئے تھے۔۔۔۔۔ کچھ کام تھا کیا۔۔۔۔۔؟"



## زرد لندن

لندن کی شام اگر دن بھر دھوپ نکلنے کے بعد ہو تو شاید ہی اس سے حسین شام دیتا کے کسی اور خطے پر اتنی ہوگی۔ اور اگر موسم خزاں کا ہو تو پھر تو سونے پر سہاگروانی بات ہوتی ہے۔ وہ بھی ایک ایسی ہی شام تھی۔ آسمان پر شفق کی سرخی کا رنگ تھا اور زمین پر خزاں میں چلے سرخ پتوں نے جیسے اک آگ سی لگائی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی مصور نے صرف سرخ اور زرد رنگ کی آمیزش سے کیوں کر ایک خوبصورت تصویر بنائی ہو۔

میں اور کامران اس روز باغیچہ پارک سے شہر کی طرف جاتی ہوئی سسٹان سڑک پر پتھل قدمی کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ سڑک دونوں طرف سے گھنے پھیل کے درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ جس کے خزاں رسیدہ پتے نوا سے ہمارے سروں پر یوں گر رہے تھے جیسے کسی دو لمبے کے سیرے پر پھول چھار کیے جاتے ہیں۔ سردی کی شدت نے ہم دونوں کو اپنے آپ اور کورٹ گنگے تک بند کرتے اور ان کے کارا اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ سڑک کے کنارے جی ہوئی برف کے دھیر دھیرے دھیرے پھیل کر ساتھ جی لوہے کی جالیوں سے ڈھکی ٹالیوں میں ایک دھم سے شور کے ساتھ گر رہے تھے۔ قریب ہی ایک جواز سردی سے بے نیاز، وہاں کھڑی آئس کریم گاڑی سے اپنی پینڈ کی کون آئس کریم خواہ رہا تھا۔ سچ ہے، آئس کریم کھانے کا مزہ تو شدید سردی میں ہی آتا ہے۔ لڑکی اپنے لباس میں خود بھی اس وقت کوئی رنگ نہ لگتی آئس کریم ہی لگ رہی تھی۔ لڑکے نے جانے اُسے کیا کہا، دونوں ایک ساتھ درو سے ہنسے۔ کامران نے حسب معمول نہ اساتہ بنایا اور لندن کی تمام حسین اور جوان لڑکیوں کی عقل کا ماتم کیا۔ اور کہیں سورج داخل رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ یہ سڑک ہمیں سیدھے اُس ڈو سے جو سورج کے گولے کی طرف ہی لے جا رہی ہو۔

”کچھ بھی ہو یا ریمیڈی۔۔۔۔۔ مجھے اس یہودن کے ارادے کچھ ٹھیک نہیں لگتے۔ تم یہاں سکون کی تلاش میں آئے ہو۔ تمس تو کہتا ہوں چھوڑو یہ پڑھائی دڑھائی کا چکر نہیں بھی کھنڈن آف لیتا ہوں اور نکلتے ہیں سنکڑ لینڈ کی طرف۔“ کچھ نئی محبتوں کی تلاش میں۔۔۔۔۔ بول۔۔۔۔۔ کیا ہوتا ہے۔“

میں جانتا تھا کامران کس قسم کی نئی محبتوں کی تلاش میں نکلتا چاہتا تھا۔ ”سدرہ جاؤ مسٹر کامران۔ تمہاری لڑکی حرکتوں کی وجہ سے تین لڑکیاں باقاعدہ سال سال تک تمہاری سنگیتر بننے کے بعد تمہیں چھوڑ کر جا چکی ہیں اب تک، اب کیا ڈھل ہیٹ حرکت کا ارادہ ہے۔“

ہم چوک پر پہنچے ہوئے بڑے سے فوارے کے پاس پہنچ چکے تھے جس کے دو میان ایک بڑے سے فوارے کے بنے شیر کے منہ سے خون کی دھاروں کی بجائے پانی کی پھواریں نکل رہی تھیں۔ البتہ اس وقت شدید سردی کی وجہ سے دو چار دھاریں جم کر باقاعدہ برف کی پتلی کمانوں کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ آخری شام نکلنے ہی والی تھی۔ ہم دونوں باقاعدہ دوڑتے ہوئے پیپلرنگ کی شام جس پر بڑی سے الال بکسیریں ڈالی ہوئی تھیں، میں سوار ہو گئے۔ اندر ایک جھبی عجیب سے گھما گھما لٹا لباس میں باقی لوگوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کامران کو اور کامران اُسے دیکھ کر مسکرایا۔ میں نے حیرت سے کامران کی طرف دیکھا۔



”تم اسے جانتے ہو۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ لیکن کیا فرقی پڑتا ہے۔ وہ تو مجھے جانتی ہے، جیسی تو مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔“ اسنے میں جیسی نے والہانہ انداز میں ہاتھ پھیلائے اور کامران کی طرف بڑھی۔ کامران کے دل کی کھلی کی طرح اس کا چہرہ بھی کھل گیا اور اس نے بھی ہاتھ پھیلا دیئے۔ جیسی ہم دونوں کے درمیان میں سے ہوتی ہوئی ہمارے پیچھے کھڑے لیے بالوں والے ایک ٹیبلے سے چینی کے گچے جاکھی، کامران ویسے ہی بازو پھیلائے کھڑا رہ گیا۔ مجبوراً مجھے ہی اسے گچے لگانا پڑا۔ چند لمبے تو وہ حیرت اور غصے کے عالم میں ہی گنگ سا کھڑا رہ گیا اور پھر ہم دونوں ہی توجہ مار کر فرس پڑے۔ ٹرامپٹی مخصوص دیمچی سی رفتار سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔

کچھ لوگ محبت کو زندگی میں سب سے خالص جذبہ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں کبھی محبت سے زیادہ خالص جذبہ کوئی اور ہوا ہی نہیں سکتا۔ اتفاق سے نہیں اور کامران دونوں ہی اس نظریے سے متفق نہ تھے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس معاملے میں بھی ہم دونوں کے نظریات ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھے۔

میں نفرت کو دنیا کا سب سے مکمل اور خالص جذبہ سمجھتا تھا، محبت میں تو کچر بھی کہیں کچھ ملاوٹ، کچھ کھوٹ ہو سکتا تھا، لیکن نفرت، بنا کسی کھوٹ اور ملاوٹ کے ہوتی ہے۔ بالکل اصلی، شدید اور خالص۔۔۔۔۔ جب کہ کامران کے خیال میں ”ہوس“ دنیا کا سب سے سچا جذبہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان صرف ہوس کے معاملے میں ہی خالص اور سچا ہوتا ہے۔ باقی سب جذبول میں وہ کبھی نہ کبھی ڈھری ماری جاتا ہے۔ چاہے محبت ہو یا چاہے نفرت لیکن گینا بات تو یہ ہے کہ چاہے محبت ہو یا نفرت، چاہے عشق ہو یا کچر صرف ہوس۔۔۔۔۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ چاروں ایک ہی جذبہ کے چار رخ دکھائی دیتے تھے۔ محبت کی بنیاد پر نفرت کرنے والے یا عشق کی سچائی ثابت کرنے کے لیے اپنی ہوس ٹھکانے والے مجھے ہبوس ہی سے مستحق سمجھتے تھے۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ کھلے عام ہوس کا رشتہ رکھنے والے ہی اصل میں بہادر اور سچے لوگ ہوتے ہیں۔ شاید ہوس ہی دنیا کا ازلی اور شاید ابدی رشتہ ہوتا ہے۔ اور ہم سب بھی ایسے ہی کسی رشتے کی پیہ دار ہیں۔

کامران نے رات سوتے سے پہلے پھر مجھے سرتا عزاک کی بیٹی مس جیو پز کے ساتھ اُلجھنے سے منع کیا۔ دراصل اسے سمجھن سے میری ایک خاص عادت کا بہت اچھی طرح سے اندازہ تھا۔ میں کسی ایک خاص حد تک ہی چیزوں کو نال پاتا تھا۔ اس کے بعد اگر وہ معاملہ میرے دماغ کی رگوں پر سوار ہونے لگتا تو پھر نہیں اپنے نفع و نقصان کا احساس نکلا کہ اس معاملے کو مدھارنے کے پیچھے پڑ جاتا تھا۔ کامران جانتا تھا کہ نہیں یہاں اپنے ماضی کی پرچھائیوں سے چھپا چھڑانے کے لیے آپا ہوں پلندا وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں کسی بھی قسم کا تاؤ برداشت کروں۔

لیکن شاید قدرت اس وقت کامران کی خواہش کے حق میں تھیں تھی۔

اگلی صبح میری پہلی مڈمیرل میس جیو پز سے ہوگئی۔ یو تیرو ٹلی کے معاملے میں جوزف ندی کنارے اپنی پندیدہ جگہ پر کھڑا پرندوں کو چارہ ڈال رہا تھا۔ اس نے مجھے دُور سے آتے دیکھا تو وہیں سے ہاتھ کے اشارے سے مجھے قریب بلائے۔ نکال۔ میری کلاں میں ابھی کچھ دقت باقی تھا۔ سوچا دو گھڑی جوزف سے پہلو پائے کر لوں۔ نہیں جوزف کی طرف بڑھنے کے لیے پیسے ہی لکڑی کے بنے ہوئے اس پل پر چڑھا جو ندی کے دونوں کناروں کو

ماننے کے لیے بنا ہوا تھا۔ تو پانچ دوسری طرف سے سارہ اپنے چار دوستوں کے گینگ کے ہمراہ اس پل پر چڑھ آئی۔ اس کے دوستوں میں دو لڑکے اور دو لڑکیاں شامل تھیں اور یہ سب میری ہی کلاس کے اسٹوڈنٹ تھے۔ سارہ نے قریب سے گزرتے ہوئے عبرانی زبان میں کہہ دیا۔ وہ شاید اس بات سے بے خبر تھی کہ مشترک زبانیں کبھی میری خاص دلچسپی کا حامل ہوا کرتی تھیں۔ جیسے لوگوں کو کلک جگ کرنے، نیکے اکٹھے کرنے معوق کرنے کا شوق ہوتا ہے، اسی طرح کبھی میرا واحد شوق دنیا کی پُرانی زبانوں کے بارے میں جاننا تھا۔ یہ شوق مجھے دلاوا جان سے متعلق ہوا تھا۔ ہماری پُرانی حویلی کی لائبریری اور مٹھی میں اب بھی اس طرح کی کئی قدیم کتابوں کے نئے مخطوطات تھے، جن میں تو ریت اور زبور کے قدیم نسخے بھی شامل تھے۔

اسی لیے مجھے سارہ کی کبھی ہوتی بات سمجھ میں آ گئی۔ اس نے میرے مذہب کے بارے میں کوئی غلط بات کہی تھی۔ لیکن انگریز کی بجائے عبرانی زبان اس نے شاید اس لیے استعمال کی تھی کہ قلمد شاید مجھے چوٹ پہنچانے سے زیادہ اپنے دوستوں سے داد وصول کرنا تھا۔ میں بھی اتنی عبرانی تو بول ہی سکتا تھا، سو میں نے بھی عبرانی میں ہی اسے جواب دیا۔

”کوئی مذہب کسی دوسرے کے مذہب پر کچھز اچھالنے کی اجازت نہیں دیتا، اور کچھز اچھالنے والے دراصل خود اپنے مذہب کو ہی گالی دے رہے ہوتے ہیں۔“

میری بات سننے ہی چند لمحوں کے لیے سارہ ٹلک سی وہ گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں اس کی بات سمجھ جاؤں گا۔ نہ صرف سمجھوں گا بلکہ اسے اس کی زبان میں ہی جواب بھی دوں گا۔ اس کے گروپ میں سے ایک لڑکا جو شاید عبرانی نہیں جانتا تھا جلدی سے سارہ کے قریب آیا اور اس سے پوچھنے لگا کہ میں نے اس سے کیا کہا ہے۔ سارہ لب بھی خاموش کھڑی تھی۔ میں آگے بڑھنے لگا۔ دوسرا لڑکا میرے سامنے میں آکھڑا ہوا دوسرا دستہ بند کر دیا۔ چند لمحے ہم ایک دوسرے کے سامنے کھڑے خاموشی سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اک دوسرے کو گھورتے رہے۔

جوزف جو اب تک ڈور کھڑا یہ سارا مناظر دیکھ رہا تھا۔ شاید معاملے کی سنگینی کو محسوس کیا، اسی لیے وہ جیز جیز قدموں سے ہماری طرف چلا آیا اور زور دہی سے چلا کر کہنے لگا ”ہے صدامین تم کہاں ہو۔۔۔؟“ ہلدی یہاں آؤ۔۔۔۔۔ مجھے خلم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“

جوزف چونک کر اسی یونیورسٹی کا ایک کچھڑا لہذا اس کے سامنے ان لڑکوں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ میں بھی سامنے کھڑے لڑکے کو ہٹا کر جوزف کی طرف بڑھ گیا۔ سارہ کا گروپ بھی دوسری جانب چلا گیا۔

جوزف نے پریشانی سے مجھ دیکھا۔

”کیا کہہ رہے تھے یہ لوگ تمہیں۔“

”کوئی نہیں۔۔۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تائن الیون کے بعد یہ مذہبی تعصب ان بڑی یونیورسٹیوں تک پھیل چکا ہے۔“

”ان لوگوں سے مذہبی الجھوٹو بہتر ہے۔ یہ سب ہی یہاں کے اونچے ور جے کے یہودی امراء کے بچے ہیں۔ تمہارے لیے کسی بھی وقت کوئی مصیبت کھڑی کر سکتے ہیں۔“

میں اور جوزف پہلے ہوئے اپنے مخصوص شیخ پر جا بیٹھے۔ ہمارے ارد گرد کبوتروں کا ایک غول دانہ چب کر ایک زوردار آواز کے ساتھ اڑا رہی تھی۔ اور اس کی جگہ سے کبوتروں نے لے لی۔

”میں کسی سے الجھنا نہیں چاہتا۔ لیکن ہانے پر لوگ کیوں ہر بار میرا ساتھ کٹ جاتے ہیں۔ ہانے نہیں مجھ سے کیا پر غاش ہے۔“

جوزف نے خاکی کا ٹکڑے لٹکانے سے کبوتروں کا دانت نکال کر فضا میں اچھال دیا۔ ”تمہیں جانتا ہوں تم اپنے کام سے کام رکھتے ہو، ذی تم نے بھی ان لوگوں سے اذیت اٹھنے کی کبھی کوئی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ لوگ اس یونیورسٹی کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں اور یہاں کے اسٹوڈنٹس کو اپنی رعایا۔ اور تم رعایا کے جملہ حقوق پر ہمارے نہیں اتر رہے۔“

”کیا مطلب۔۔۔ رعایا کے جملہ حقوق پر کیسے پورا اترنا جاسکتا ہے۔“

”اور اصل تمہارے انداز میں، تمہاری چال وصال میں اور تمہارے بات کرنے کے انداز میں ایک خاص متانت، ایک خاص غرور سا ہے۔ تمہاری شخصیت میں مروجہ عیسائی کی ذرا بھی جھلک نہیں ہے۔ اور یہی بات ان سب کو کھلتی ہے۔ جو شخص ان سے مرعوب نہ ہو۔ ان کے سامنے تن کر چلے۔ یہ بھلا اُسے کہاں برداشت کر سکتے ہیں۔“

مجھے خیر آ گیا۔

”مرعوب ہونے یا ان سے دہنے کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔۔۔۔۔ تمہیں کسی خیراتی سکا کر شپ پر تو یہاں آیا نہیں ہوں۔ ہزاروں پونڈ نہیں بھری ہے۔ اس یونیورسٹی کا میرٹ لیٹ پاس کیا ہے۔ بلکہ نہیں شاید یہاں پر موجود ہر اسٹوڈنٹ سے زیادہ ڈونیشن اور تحفے دیتا ہوں کیونکہ مجھے اسٹیشن سیٹ پر یہاں داخلہ دیا گیا ہے۔ پھر بھلا میں کسی کے زعب میں کیوں آؤں؟“

”تمہارے اسی ڈونیشن اور تمہاری اسی بھاری فیس نے ان یہودی سناہوکاروں کے منہ بند کر رکھے ہیں۔ تم ان کے لیے ایک سونے کی کان ہو جسے پانچ انا کے ہاتھوں کو نہیں سکتے۔۔۔۔۔ نہ امت مانتا۔۔۔۔۔ یہ تمہاری قابلیت نہیں تھی جس کی وجہ سے تمہیں یہاں داخلہ ملا۔۔۔۔۔ بلکہ وہ تمہاری بینک ٹیلیس کی ہیٹ جو تمہارے ریکارڈ کے ساتھ جڑی ہوئی تھی اس نے تمہیں اس یونیورسٹی تک پہنچایا ہے۔“

میں نے حیرت سے جوزف کی طرف دیکھا۔

”یہ سب آپ کو کیسے پتہ چلا؟“

”تم نے شاید غور نہیں کیا۔۔۔۔۔ یہاں بسنے والے مسلمان اسٹوڈنٹ ہیں۔ ان میں سے بھی زیادہ تر میرے نام مسلمان ہیں۔ جو یہاں کی تہذیب میں دل ل کر اپنا اور دوسروں کا فرق مٹا چکے ہیں۔ باہر سے صرف تہی ہو۔ یہ یونیورسٹی داخلہ دینے وقت سات گھنٹوں تک حسب نسب کالج لے کر عادی ہے۔ ہو سکتا ہے تمہارے شجرہ نسب میں انہیں کوئی قابل گزر چیز بھی نہ ملی ہو۔“

میں نے چونک کر جوزف کی جانب دیکھا، یہ بات تو اس نے چاہے اچھا نہ کی۔ لیکن بالکل ٹھیک کہی تھی۔ میرے دادا، پردادا برٹش گورنمنٹ کے خاص وفادار اور وکیلہ خوارہ چکے تھے، ہماری سات نسلوں میں کوئی باقی پیدا نہیں ہوا تھا۔

میں نے غور سے جوزف کو دیکھا۔

”لیکن آپ مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہے ہیں۔ آپ بھی تو اسی یونیورسٹی کی انتظامیہ کا ایک حصہ ہیں۔ پھر انتظامیہ کے یہ راز کچھ پر کیوں کھول رہے ہیں۔“

جوزف مسکرایا۔

”میں خود بھی اس بات پر کبھی کبھی بہت حیران ہوتا ہوں کہ آخر ختم میں ایسی کیا بات ہے جو اپنا اپنا گلے پر مجبور کرتی ہے۔ تم اوروں سے مختلف کیوں دیکھتے ہو؟۔۔۔ شاید اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ تم نے کبھی ٹوٹ کر کسی سے محبت کی ہے۔۔۔ اور میرے دل میں محبت کرنے والوں کا بہت اونچا مقام ہے۔۔۔ بہت اونچا۔“

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

”گو یا آپ نے بھی کسی سے کبھی محبت کی ہے۔۔۔ لیکن آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں نے کبھی ٹوٹ کر کسی کو پا ہوا ہوگا۔۔۔؟ ہو سکتا ہے میں محبت کے نام سے بھی واقف نہ رہا ہوں۔“

”ہم ممکن۔۔۔ تمہاری آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں بول سکتیں۔۔۔ ان کی گہرائی میں محبت کے کتنے راز، کتنے درد چھپے ہیں۔۔۔ یہ شاید تم خود بھی نہیں جانتے۔۔۔ محبت انسان میں غمراؤ لے کر آتی ہے۔۔۔ وہ اوپر سے بھٹانے سکون نظر آتا ہے، اندر سے اتنا ہی بے چین ہوتا ہے۔۔۔ تم بھی ایک ایسا ہی خاموش اور نہ سکون مسترد ہو۔۔۔ جو اپنے اندر ہزاروں طوفان چھپائے بیٹھا ہے۔“

میں نے ایک لمبی سی سانس لی۔۔۔ تو گو یا اب یہ دل کے راز میرے چہرے سے بھی عیاں ہونے لگے تھے۔۔۔ کہاں جاؤں۔۔۔؟ کیسے چھپاؤں اپنے اس کہتی کہ پئی دل کے آئینے کو۔۔۔؟

میں اور جوزف یونانی خاموش بیٹھے رہے۔ ہمارے سامنے میز میں پانی پیسے سے فضا میں اک ہلکا سا ارجاش پیدا ہو رہا تھا۔ ہمارے آس پاس کیوتروں اور دانے چھتے پرندوں کی ٹی ٹی ٹی آوازیں تھیں۔ سرد ہوا میری آنکھوں سے نگرانی تو مجھے پتہ چلا کہ میری آنکھوں کے گوشے ہلکے پکے ہیں۔ میں نے ٹوٹ کی جیب سے گہرا کالا چشمہ نکال کر پہن لیا۔ دل کے راز جب دل میں ہی رہیں تو اچھا ہوتا ہے۔۔۔ لیکن جب یہ آنکھوں سے بہہ کر چھلکنے لگیں جب ان پر پردہ ڈال لیا نہ ہی بھرتہ دتا ہے۔

☆☆☆

## محبت کی دو پہر

محبت انسان پر دو چھپ کی طرح دیر سے دیر سے اترتی ہے، جوان، جوانی میں کسی سحر کی جتنی دھوپ کی طرح۔ جس کی حدت کا صبح کے پہلے پہر میں انسان کو اتنا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن جیسے جیسے محبت کی دو پہر قریب آتی ہے، بے چینی اور آنکھوں سے انسان کا اندھا حال ہونے لگتا ہے۔ پیاس سے طلق میں کانٹے آگ آتے ہیں۔ دم لبوں پر آ کر اکٹک جاتا ہے، نہ جان جسم کے اندر رقی، نہ پوری طرح جسم سے باہر نکلتی ہے۔

جیسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب میں ایمان کی محبت کے پہلے پہر سے نکل کر اس محبت کی دو پہر تک جا پہنچا تھا۔ مجھے تو اس کی محبت کے پہلے پہر کا سکون بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ جب تک میں اس محبت ابتداء کی کھجکے سے سنبھلا، جب تک اس کی محبت کی کڑکٹی دو پہر میرے سر پر موجود تھی۔

اس دن حویلی کی مٹھی میں رو کے چائے پر اور اس سلاش میں اپنی عزیز از چان کھلی اور اپنی مین کے شریک ہونے پر وہ اس قدر برہم تھی کہ اس نے نئی روز تک اپنی بہن حیا اور نگہت سے بات نہیں کی۔ لیکن نگہت بھی اپنا دھن کی پکی تھی۔ وہ باقاعدہ دھڑا دے کر ایمان کے گھر کے کچے کچن میں جا بیٹھی کہ جب تک مجھے معاف نہیں کرو گی، میں بیس بیٹھی رہوں گی۔ ایمان کی اماں نے پہلے نگہت کو اور پھر ایمان کو ڈھانپا دیں کہ گھر کے کمرہوں کی دابھی کا دھت ہے، خدا کے لیے ان دونوں کے درمیان جو بھی جھگڑا ہے ختم کرو۔ خاص طور پر انہیں مولوی صاحب کا ڈھتا۔ اگر وہ گھر آ جاتے اور نگہت کو بول مومن میں جینا دیکھ لینے تو جانے کیا بکھتے۔۔۔۔۔ ان کا بچوں پر رعب بھی تو بہت تھا۔ مجبوراً ایمان کو ہی چھپا کر ڈالنے پڑے اور وہ نگہت کو بازو پکڑا اٹھا کر اپنے اور حیا کے کمرے میں لے گئی اور پھر وہاں سنبھلے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ نگہت کے گلے لگ کر خوب روئی اور اس نے نگہت سے وعدہ لیا کہ وہ آئندہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گی جس سے ایمان یا اس کے ماں باپ کی عزت پر کوئی حرف آتا ہو۔

نگہت نے اس سے وعدہ تو کر لیا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اسے یہ یقین دلانے کی بھی پوری کوشش کی کہ میں اُن ماموں جو انوں میں سے نہیں ہوں جو اس طرح کے رشتوں کو کھیل بکھتے ہیں۔ نگہت نے اپنے ماں باپ کی قسم کھا کر اسے میری اور میرے ہڈے کی سچائی کا اعتبار دلانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اس معاملے میں ایمان نے صرف اتنا ہی کہا کہ اس کی زندگی کا اختیار صرف اس کے ماں باپ کو ہے، وہ جہاں چاہیں گے، جیسے چاہیں گے اس کی زندگی کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔ وہ اس سلسلے میں مزید کوئی بات کہنا چاہتی ہے اور نہ ہی سننا چاہتی ہے۔

یہ تمام باتیں مجھے نگہت کی زبانی پتہ چلی تھیں۔ نگہت نے پُرانی حویلی پڑا کر یہ ساری داستان میرے گوش گزار کرتے ہوئے مجھے پھر یہی مشورہ دیا کہ میں اگر ایمان کی جانب کوئی غلط رفت کرنا چاہتا ہوں تو اس کا صرف، واحد اور ایک ذریعہ میرے گھر والوں کی طرف سے اس کے گھر رخصتے کا جانا ہی تھا۔

بہر حال مجھے ایک بات کا اطمینان تو ہو گیا تھا کہ ایمان فی الحالہ کہیں منسوب نہیں تھی لیکن اس جیسی مادہ تپ کے لیے جانے کتنے اور دل

دھڑکتے ہوں گے۔ جانے اور کشتوں کی وہ نور نظر ہوگی۔ مجھے جو بھی کرنا تھا۔ بہت جلدی کرنا تھا۔ لیکن مجھے اپنے گھروالوں کے رد عمل کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ شہر کے سب سے اونچے اور امیر گھرانے کا رشتہ اور دوہجی کسی غریب مولوی کے گھر؟ ہماری شان اور انا بھلا یہ سب کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ لیکن گھروالوں سے بات کیے بنا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ مجھے مولوی صاحب کے گھر تک پہنچنے کے لیے اپنے گھروالوں کی شناخت کی ضرورت تھی۔ میری اپنی تو فی الحال کوئی شناخت بھی نہیں تھی۔

اور پھر وہی ہوا جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ پورے گھر میں جیسے ایک بھونپال سا آگیا۔ سب سے پہلے امی چلائیں۔ ”کیا۔۔۔ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔“

کشمکش صاحب کو ہلال آگیا۔ وہند سے پاپ کا دھواں اٹھتے ہوئے وہاڑے ”ہماری سات نسلوں کی عزت کو ہٹانے چلا ہے۔“ صبر نہ بھائی نے بڑا سمانہ بنایا۔ ”What Rubbish! سجاد بھائی نے سر پیٹ لیا۔ ”مجھے پتا تھا یہ کوئی نکل ضرور کھائے گا۔“ پورے گھر میں صرف عباد تھا جس نے آکر میری پیٹھ ٹوکھی ”گریٹ میڈی بھائی گریٹ۔۔۔ زبردست چوائس ہے۔ جیسٹ آف لک۔“ لیکن عباد بے چارہ یہ نہیں جانتا تھا کہ صرف قسمت کے لیے خدا دینے سے کسی کی قسمت اچھی نہیں ہو جاتی۔ اور پھر مجھے تو اپنی قسمت کی کلیئر پھر سننے سے ترشائی تھی۔ صرف ایک تیشے کی مدد سے پھر سے دودھ کی ٹیر کھود تھی۔ زندگی کا پھر سے کوہِ بامِ سختان لینے کو تیار تھی۔

میرے والدین اور بڑوں نے اس معاملے میں میری کوئی بات سننے سے ہی ساف انکار کر دیا۔ مجھے باد ہے ہم سب ڈرنجبل پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا دماغ پھر سے ڈہرایا۔۔۔ بابا نے قصے میں ہاتھ میں پکڑے چھری اور کانٹے کو زور سے پلیٹ میں دے مارا۔ ”بس۔۔۔ بہت سن کی تمہاری عشق کی داستان۔۔۔ ایک بات کان کھول کر سن لو۔۔۔ تم اگلے پختے لندن چار ہے ہو۔ میں نے وہاں کی لکھی۔ بہت بڑی ایویئرٹی میں تمہارے داغے کا انتظام کر دیا ہے۔ دو سال کی ڈگری ہے۔ پہلے پڑھائی ختم کر لو۔۔۔ شادی واوی بھی ہوتی رہے گی۔“

”لیکن میں لندن نہیں جانا چاہتا۔۔۔ مجھے اکناس کی ڈگری میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

امی چلائیں ”تو پھر کس چیز میں دلچسپی ہے تمہیں ہاں۔۔۔؟ چاروں میں ہی ایسا کیا جاوے گا کہ تم پر اس شریف زادوی نے۔۔۔؟“

صبر نہ بھائی نے فوراً تر کا لگا لیا ”مجھے تو اسی دن اس پر شک ہو گیا جس دن وہ یہاں پارٹی میں نیک پروین بنی بیٹھی تھیں۔ آف۔۔۔ یہ چوٹے لوگ۔“

میں مزید یہ لغویات نہیں سن سکتا تھا۔ لہذا میں قصے میں اپنی کرسی پیچھے کھسکا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور غنیمت زور سے میز پر جھٹک کر دہاں سے باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے بھی امی کی تیز قصے میں بھری آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ وہ شاید بابا سے کہہ رہی تھیں۔

”دیکھا۔۔۔ دیکھا آپ نے۔۔۔ کس قدر خوب ہو گیا ہے۔۔۔ میں کوکتی ہوں۔۔۔“

ان کا جملہ پورا ہونے سے پہلے میں ڈانٹنگ ہاں سے باہر نکل چکا تھا۔ لیکن کاش میں اس دن وہاں کمرے سے باہر نکلنے سے پہلے امی کا پورا جملہ سن لیتا تو اگلے دن وہ غضب نہ ہوتا جو نہا۔

سوائے مہادی کے تمام گھر والوں نے میرا عمل بانٹنا شروع کر رکھا تھا۔ اگلے دن میں یونہی گم سم اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اچانک مجھے سے اسی اور بھابھی کے زور زور سے چلانے کی آوازیں آنے لگیں جیسے کسی سے لڑ رہی ہوں۔ پہلے تو میں نے اس بات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی کیونکہ آج کل گھر میں ایسے ڈرامے تقریباً روزی ہو جاتے تھے۔ لیکن کچھ دیر کے بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ معاملہ تو کچھ مجھ سے متعلق ہے۔ میں جلدی سے اپنے کمرے سے باہر نکلا اور بیٹک کے قریب آ کر دیکھا تو پیچھے لاؤنچ میں مولوی علیم سر جھکائے کھڑے تھے، ان کے ماتھے پر ندامت کا پینہ آنکھوں میں آنسو اور سارے بدن میں جیسے لرزش سی تھی ماما اور بھابھی مل کر جانے انہیں کیا کیا غلغلات سنارہی تھیں۔ میرے قدموں کے پیچھے سے تو جیسے زمین ہی اٹھ گئی۔ میں وہیں اوپر سے کھڑے کھڑے چلا پلا۔ "ہی۔۔۔ بس کریں بہت ہو گیا۔"

اسی اور بھابھی مجھے دیکھ کر پُپ ہو گئیں اور لاؤنچ سے ملوث ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئیں۔ مولوی صاحب بھی اپنے اپنے اور ٹولے ہوئے قدموں سے واپس ہو لیے، جب تک نہیں جوتے پتہ کہ بھانجی ہوا یا بھرتی ہوا اپنی سائیکل نکال کر گیت تک پہنچ چکے تھے۔ میں بھاگتا ہوا ان کے سامنے آ گیا اور ان کے راستے میں حرام ہو گیا۔ مولوی صاحب کی آنکھوں سے آنسو اس رفتار سے بہہ رہے تھے کہ ان کی سفید داڑھی بھی بجلی بجلی تھی۔ مجھے اور تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا بس میں نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"من سب کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ حالانکہ ان کا گناہ قابل معافی نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی میں آپ سے التجا کرتا ہوں۔"

مولوی صاحب نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا، ان کی اس ایک نظر میں جو شکوہ تھا اس نے جیسے مجھ پر گزراں پانی ڈال دیا میری نظر خود بخود جبک گئی۔

"میں نے تمہارا کیا بکاڑا تھا حاد میاں۔ غریب آدمی کے پاس صرف ایک ہی بھرم ہوتا ہے۔ اس کی عزت کا بھرم۔۔۔ تم نے آج مجھ سے وہ بھرم بھی چھوڑ دیا۔ کیوں۔۔۔ آج میرے بازو میں میری مصوم بچیوں کے کردار پر کچھڑا اچھا لگایا۔ انہیں زسوا کیا گیا، صرف تمہاری وجہ سے اکاش۔۔۔ کاش میں تمہیں کوئی ہڈ عا دے سکتا۔۔۔ لیکن۔۔۔ بہر حال وہ بڑا انصاف والا ہے۔۔۔ میرا انصاف بھی وہ خود ہی کرے گا۔"

۔۔۔۔۔ مولوی صاحب کی آواز جذبات کی رو میں ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہی تھی۔ انہوں نے اس کے بعد کوئی بات نہیں کی۔ اپنی سائیکل پر سوار ہو کر وہاں سے چل دیے۔ میں سر جھکائے وہیں گیٹ کے پاس کھڑا رہ گیا۔

میرے ذہن میں طوفانوں کی آندھی چل رہی تھی۔ میرے ذہن میں پہلے یہ بات کیوں نہیں آئی کہ میرے گھر والے اس حد تک بھی گر سکتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا مجھ پر کوئی زور نہیں چل سکتا۔ اس لیے انہوں نے رستے ہی کو اس وجہ کو ہی قسم کرنے کا منصوبہ بنالیا تھا جس کی وجہ سے میں نے بد دوستی کی جرأت کی تھی۔ کاش۔۔۔ کاش اگر مجھے پہلے ان کے ارادوں کا علم ہو جاتا تو میں مولوی صاحب کو راستے سے ہی واپس بھیج دیتا۔۔۔ کاش۔۔۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اسی اور بھابھی نے موقع پا کر اپنا ارادہ کر دیا تھا۔ مولوی صاحب کو کالی دی گئی تھی کہ وہ محفلوں میں اپنی بیٹیوں کو کھاس کر اس لیے بھیجتے ہیں کہ مجھ جیسا کوئی رئیس زادہ ان پر فریفتہ ہو جائے۔ ان کے منہ پر اس مادی کی تحفہ دار مار کر انہیں آئندہ اس گھر کا زائے نہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ذرا سوچئے۔۔۔ اس سلوک اور ان الزامات کے بعد ایک سفید پریش اور ایک پاک باذہبیت مند انسان کے پاس سوائے مر جانے کے اور کیا چارہ رہ گیا ہو گا؟ لیکن مولوی صاحب جیسوں کے پاس تو موت جیسی عیاشی سرزد ہونے کا بھی کوئی موقع نہ تھا۔ اگر ہمارے مذہب

میں خود کبھی حرام نہ ہوتی تو اس روز مولوی صاحب بچپنا خود کو ختم کر لیتے۔ اور یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا تھا۔ میں ان کی اس بے عزتی کا ذمہ دار تھا۔ مجھے اس لئے خود سے ہی شدید نفرت کا احساس ہوا۔ میں غصے میں واہیں اندر کی طرف چلتا اور پھر میرے راستے میں ڈرانگ روم، لالائی، لالائی کی جو بھی چیز آئی وہ لوٹ کر کرجوں میں تبدیل ہوتی گئی۔ بھابھی تو ڈر کے مارے اپنے کمرے سے ہی باہر نہیں نکلتیں۔ البتہ امی کے ساتھ خوب بحث ہوتی۔ انہیں نے رواجی عورتوں کی طرح مجھے طے دیے۔ مجھ پر مولوی صاحب کے گھر والوں کی طرف سے خوب کلموں کے زیر اثر ہونے کا الزام بھی لگا۔ پھر آخر میں وہی۔۔۔ جواک ہاں کا آخری ہتھیار ہو سکتا ہے۔۔۔ آسو۔۔۔

رات کو کشمیر صاحب کی عدالت گئی اور میرے خلاف حتمی فیصلہ دے دیا گیا کہ مجھے اس گھر کی رواتھوں کو توڑنے کی ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی۔ اور اگلے دن مجھے ہر حال میں لندن کی فلائٹ لینے ہی ہوگی۔ میں نے اس رات کشمیر صاحب سے زیادہ بحث نہیں کی۔ میں جانتا تھا اور فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا تھا۔

دوسرے دن صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی میں پرائی ہوٹلی جا پہنچا۔ شاکر کو حلی کے دوسرے نوکروں سے اس معاملے کی سن گن مل چکی تھی۔ لیکن گھر پہ کل موجود نہ ہونے کی وجہ سے اسے پوری بات کی خبر نہیں تھی۔ اس قدر صبح وہ مجھے پرائی ہوٹلی میں پا کر اور تیرا دو پریشان ہو گیا۔ اور بھابھا کا گھر میرے پیچھے حلی کے پڑانے پر بے گول کمرے میں چلا آیا۔

”حماد بابا۔۔۔ یہ سب کیا ہے۔۔۔ یہ شش کیا سن رہا ہوں۔۔۔ کل مولوی صاحب کو کوری سے فارغ کر دیا گیا۔۔۔ بلکہ مجھے تو شرافت چکیدارنے بتایا ہے کہ۔۔۔“

”تم نے ٹھیک سنا ہے، اور یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے۔“

میں نے شاکر کو ساری بات الف سے لے کر ی تک سنا دی۔ شاکر سر ہٹا کر وہیں بیٹھ گیا۔ ”یہ آپ نے کیا کیا بابا۔۔۔؟ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ آپ کے گھر والے اس رشتے کے لیے کبھی راضی نہیں ہوں گے۔۔۔ اور مولوی صاحب۔۔۔ وہ تو بہت بڑا انسان ہیں بابا۔۔۔ اور محبت۔۔۔ اس سے تو مجھے اس بے وقوفی کی بالکل بھی توقع نہیں تھی۔“

”اس میں غلطی کا کوئی تصور نہیں ہے، تم جانتے ہو وہ میری بات نہیں ٹال سکتی۔ بلکہ تم اسے کچھ مت کہتا۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن جو زیادتی گھر والوں نے مولوی صاحب کے ساتھ کی ہے اس کا ازالہ کیسے ہوگا۔“

”اس کا ازالہ کبھی نہیں ہی کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرا رشتہ لے کر مولوی صاحب کے گھر جاؤ۔“ شاکر اچھل پڑا۔

”کیا۔۔۔؟۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، حماد بابا۔۔۔ شش بھلا کیسے؟“

”اس کے سوا اب اور کوئی چارہ بھی نہیں۔۔۔ امی اور بابا ابھی اس گھر رشتہ لے کر نہیں جائیں گے اور مولوی صاحب کے اچلے دم پر جو راج میری وجہ سے لگا ہے وہ کبھی مٹ نہیں پائے گا۔ اس لیے میں نے یہ حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ اب تمہیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ تم میرا ساتھ دو گے یا نہیں۔“

شاکر خاموش بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔





## یادیں

”یادیں بھی ہمارے ساتھ کبھی کبھی کیسے کیل نکلتی ہیں۔ یہ ہمیں وہ سب سوچ کر بٹھنے پر مجبور کر دیتی ہیں جب ہم کسی کے ساتھ مل کر رہے تھے۔۔۔ اور کبھی ہمیں یہ سوچ کر رونے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ کبھی ہم کسی کے ساتھ مل کر نہیں تھے۔“

اس دن میرا قی زہان والی نوک جھونک کے بعد سارہ کافی جھٹکا ہو گئی تھی۔ وہ اب بھی مجھ پر طرے کے وار تو کرتی تھی۔ لیکن اب اس کے انداز میں احتیاط کا پلوٹو نمایاں تھا۔ جو زف سے اب بھی ہمارے اسی پسندیدہ اور مخصوص شیٹ پر لکڑی بٹاؤز اندر ہی ملاقات ہوتی تھی۔ اُس نے مجھے اپنی بہت سی اندرونی باتیں بھی بتادی تھیں۔ مٹھا یہ کہ اُس کے خاندان میں اب صرف وہ اور اس کی بیوی ہی ایک چھت تلے رہتے ہیں۔ تینوں بچے جوان ہونے کے ساتھ ہی ایک ایک کر کے گھر چھوڑتے گئے۔ اس عمر میں وہ یہ نوکری بھی اس لیے کر رہا ہے کیونکہ گزشتہ برس کے لیے اس کے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں اور وہ اولد ہوم جانا نہیں چاہتا۔ وہ ایک دن مجھے یونیورسٹی سے واپسی پر برج ڈاؤن میں واقع اپنے چھوٹے سے گھر بھی لے کر گیا تھا۔ اس کی بیوی میری ایک مہربان عورت تھی جس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی گہری لداؤں تھی۔ وہ مجھ سے اسی طرح جیش آئی جیسے ایک ماں اپنے کسی چھوٹے سے جیش آ سکتی ہے۔ اُس نے دیر تک مجھے واپس نہیں جانے دیا اور اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی بہت سی چیزیں بھی کھلائیں اور ہمارے گاؤں کی بڑی بوڑھیوں کی طرح جاتے ہوئے میری پیچوں میں بھی بھرویں۔ جیسے بچپن میں میری نانی اور میری دادی ان کے گھر سے واپسی پر میری پیٹیں اغروٹ، کشمش، پستے اور خرپانوں سے بھر دیتی تھیں۔۔۔۔ شاید دنیا کے ہر خطے کی محبت کی ایک ہی بولی ہوتی ہے، شیرے چھٹی منہنی اور کچے دھوس جیسی آنکھیں جالانے والی بولی۔۔۔۔

لندن کے موسم کا بھی بے وقاصی کی طرح کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ ابھی پل میں دھوپ چمک رہی ہوتی ہے کہ دوسرے ہی پل دم جم کر کھڑی آپ کا تن من بھگوئے لگتی ہے۔ اس دن بھی جب صبح میں نے یونیورسٹی کے لیے نکلنے سے پہلے کھڑکی سے باہر جھانکا تو دھوپ چمک رہی تھی۔ لیکن جب میں گھر سے نکل کر سڑک کے کنارے لگی کافی کی شیشیں تک پہنچا جب تک آسمان بادلوں سے ڈھک چکا تھا اور میرے یونیورسٹی کپٹے پکٹے پھوسا پڑنا شروع ہو چکی تھی۔ میں یونہی بھینکا ہوا کاندھے پر اپنے نوٹس کا بیگ لٹکائے گاں میں روٹا ہوا لیکن یہ کیا۔ آج تو کلاس بالکل خالی پڑی تھی۔ کیا میں جلدی آ گیا تھا یا پھر لکچر کسی اور کمرے میں ہوا تھا۔ میں یہی سوچتا ہوا کلاس سے نکلنے کے لیے پلٹا۔ اس لمحے میری نظر لکچر ہال کے بیک بورڈ پر پڑی۔ اور وہاں کھسی تحریروں نے میرے قدم جکڑ لیے۔ بلیک بورڈ پر مسلمانوں کے لیے تضحیک آمیز جملے لکھے ہوئے تھے۔ اور ہر جملے کے بعد یہودیوں کا مخصوص نشان (David star) یعنی چھ کونوں والا ستارہ دیا ہوا تھا۔ ہر جملے سے زہر پک رہا تھا، ڈاؤن ویڈ مسلمز (Down with Muslims)، ٹرورسٹس (Terrorists)۔ جیڑوی آر دی داؤنی گریت ہٹل مسلمانوں یہ کیسے چھوڑ دو، اور اس طرح کے دوسرے بہت سے فقرے۔۔۔۔

میں جانتا تھا کہ اس کلاس میں صرف نہیں ہی ایک اکیلا مسلمان تھا اور یہ سب کچھ میرے لیے ہی لکھا گیا تھا۔ اور کس نے لکھا تھا۔ یہ بھی نہیں بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ میرے خون میں ایک عجیب سی گرم لہر دوڑ گئی۔ مجھے پہلی مرتبہ کامران کی کہی ہوئی باتوں میں صداقت محسوس ہوئی۔ اسے میں کلاس میں ریپکا داخل ہوئی ریپکا آسٹریلین تھی اور میرے ہی سیشن میں میری ہم جماعت بھی تھی۔ اُس نے جیک بورڈ پر لکھی تحریریں دیکھ کر حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”ہے میڈی۔۔۔۔۔ یہ سب کواں کس نے لکھی ہے یہاں پر۔“

کلاس کی سب سے مفرد اور ہر داغ لڑکی نے۔۔۔۔۔ اور بھلا کوئی ایسا کیوں کرے گا۔“

”یو مین سارہ۔۔۔۔۔؟“ لائسن۔۔۔۔۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی۔“

”اگر تمہیں کہیں وہ مل جائے تو اس سے کہنا کہ سنیں نہیں جانتا تھا کہ خود کو عظیم کہنے اور دیکھنے والے اس قدر کمزور ہوں گے کہ ان میں اپنے مخالف کے منہ پر بات کہنے کی جرأت بھی نہیں ہوگی۔“

میں ریپکا کو یہ پیغام دے کر وہاں سے نکل آیا۔ اب میرا کلاس لینے کا بھی بالکل موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ باہر اب بھی ویسے ہی بجلی ہی مٹھو اور کا سلسلہ جاری تھا۔ جن دنوں بارش یا پرف ہادی ہوتی تھی، ان دنوں گاس کے میدانوں میں اور یونیورسٹی کے درمیان سے گزرتی نہر کے کنارے پر پڑے پتھروں اور کرسیوں پر لگی بڑی بڑی نیلی نیلی چھتریاں کھول دی جاتی تھیں۔ باہر نکلتے ہی جوزف بھی مجھے ایک ایسی ہی نیلی چھتری کے نیچے نہر کنارے اپنے پسندیدہ مقام پر بیٹھا نظر آیا۔ آج وہ بارش کی تصویر کشی کرنے کے لیے اپنے ساتھ کیوس شینڈو وغیرہ بھی لے کر آیا تھا اور نہر میں گرتی بوندوں سے پیدا ہونے والے پانی کے ارتعاش اور اس ارتعاش سے گزرتے، سکتے پانی کے ٹکس پر بنی شیشوں کی تصویر کشی کر رہا تھا۔

میں اُس کی طرف بڑھ گیا اور چند کراس کی تصویر بننے دیکھتا رہا۔ واقعی جوزف بہت اچھا مصو ر تھا۔ اُس نے نہر میں یونیورسٹی کی عمارت کے ٹکس کی تصویر بنائی تھی لیکن یہ سارے ٹکس کی تصویر نہیں تھی بلکہ نہر کے پانی میں گرتی بارش کی بوندوں سے ہوتی لپکال کے دوران اس ٹکس میں ہوتی تبدیلیوں کی تصویر تھی۔ جوزف نے بہت چھوٹی چھوٹی سی چیز نیات کا بھی پورا احسان رکھا تھا۔ جوزف تصویر بناتے بناتے میری طرف پلٹا۔

”کو کبھی لگی۔۔۔۔۔؟“

”بہت خوب، لگا ہے کہ کیوس خود ایک نہر ہے۔ جس پر تم بارش کے چھینٹوں کی صورت میں رنگ پھینک رہے ہو۔“

جوزف نے خوشی سے ہاتھ پر ہاتھ مار کر تالی بجائی۔

”واہ۔۔۔۔۔ میری تصویر کی آج تک کسی نے اتنی مکمل تعریف نہیں کی۔ واقعی تمہارے لفظوں کا جواب نہیں ہوتا۔ تمیں رنگوں سے تصویر بنانا ہوں اور تم لفظوں سے تصویر کشی کرتے ہو۔“

جوزف اپنی تصویر کو اختتامی ملزوک دے کر میرے ساتھ شفق پر آ بیٹھا۔

”کیا بات ہے۔ آج تم کچھ اُلجھے ہوئے سے نظر آ رہے ہو۔“

میں نے جوزف کو کلاس روم میں پیش آنے والا سارا واقعہ سنا دیا۔ جوزف کو بھی غصہ آ گیا۔

”تکلف فطری کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ لیکن جانے کیوں، نہیں بھی رپکا کی اس بات سے متعلق ہوں کہ سارا ایسا نہیں کر سکتی۔ شاید میں نے جنہیں پہلے بتایا نہیں۔ وہ یہاں دھاپے سے پہلے بھی ایک اور ادارے میں مجھ سے شام کی سٹینک کا سڑ لیتی رہی ہے۔ اور وہ خود بھی ایک بہت اچھی مصورہ ہے۔ تم لوگوں کے خلاف اس کے دل میں واقعی بہت بغض بھرا ہوا ہے اور وہ اس دشمنی میں کسی انتہا تک جاسکتی ہے۔ لیکن اُسے سامنے سے وار کرنے کی عادت ہے۔ وہ یوں ٹھپ ٹھپ کر کوئی ایسا شے خدا تم نہیں کر سکتی۔ دراصل وہ اسے بھی یہودیت کی توہین سمجھتی ہے کہ دشمن کی پیٹھ پیچھے وار کیا جائے۔“

میں نے بے زاری سے سر ہلایا۔

”کیا کیا سکتا ہوں۔۔۔۔۔ بہر حال۔۔۔۔۔ آپ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ میرا ان لوگوں سے ٹکراؤ ناگزیر ہوتا جا رہا ہے۔ شاید پروٹیسٹنٹ ای ان یہودیوں کا سب سے بڑا اہمiliar ہوتا ہے۔“

”نیک کجے ہو تم، اسی لیے یہ لوگ ساری دنیا میں کاروبار پر چھائے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ کاروبار کو اپنے پروٹیسٹنٹ کے لیے اور پروٹیسٹنٹ کو اپنے کاروبار کی وسعت کے لیے اس کا سیانی سے استعمال کرتے ہیں کہ جس کا کوئی جواب نہیں۔ اور اس یزس سے یہ اتنا کھاتے ہیں کہ ان کی دولت دنیا کی چند سب سے بڑی کمپنیوں کی بادشاہت بدلنے کا باعث بنتی رہتی ہے۔ شاید تم یہ بھی جانتے ہو کہ دنیا میں فریخا تر سسٹم کے بانی بھی یہودی ہیں اور اسی سسٹم کی بدولت آج یہ دنیا کے ہر کونے میں اپنا کاروبار پھیلا چکے ہیں۔“

میں نے غور سے جوزف کی طرف دیکھا۔

”اگر یہ سنے ہی کا میاب ہیں تو پھر اس قدر خوف زدہ کیوں ہیں۔“

جوزف مسکرایا۔ ”شاید یہ ایک خوف ہی ان کی قسمت میں ازل سے لکھ دیا گیا ہے۔ آج تک دنیا میں سب سے زیادہ نبی اسی قوم پر اترے ہیں۔ یعقوب سے لے کر موسیٰ تک چار ہزار نبی اس قوم پر مبعوث ہو چکے تھے۔ اگر اس خدا کو تم ان کی نسل پر تقسیم کر دو تو ان کی ہر نسل پر تو سب نبی اترے ہیں لیکن پھر بھی یہ قوم کمر اوی رہی۔ یہ خوف اسی کمرائی کا خوف ہے۔“

میں حیرت سے جوزف کی باتیں سن رہا تھا۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ وہ یہودیوں کی تاریخ کے بارے میں اتنی تفصیل سے جانتا ہوگا۔ جوزف نے گہری سانس لی۔

”بہر حال نہیں تم سے پھر بھی کہوں گا کہ ان لوگوں سے نہ اچھا نہی بہتر ہے۔ کیونکہ سارا اور چھری لڑائی میں دشمنی ہمیشہ سری ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو اپنی عظمت اور برتری کا جنون ہے۔ جسے ان کے دماغوں سے نکالنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔“

ہمارے سامنے نہر میں بیٹے دائروں میں یک دم بھڑکی سی آگئی۔ بارش تیز ہو گئی تھی، مہرے بیوں کی ایک ڈار نے تیز بارش سے گھبرا کر لمبی سی ڈار بھری۔ ساکت فضا میں پرد کے پل پل آنے کا شور گونجا۔ جوزف نے اپنی تصویر اور دیگر سامان جمع کرنا شروع کر دیا۔ نہیں بھی اس کی مدد کرتا رہا۔ لیکن میرا ذہن اب بھی جوزف کی باتوں میں الجھا ہوا تھا۔ شاید جوزف بھی میری بے خیالی جھانپ گیا۔

”کیا سوچ رہے ہو۔“

”سوچ رہا ہوں کہ کہیں نہ کہیں یہ لوگ بھی جانتے ہیں کہ اصل میں وہ خود عظیم نہیں ہیں، عظیم کوئی اور لوگ ہیں۔ اور اصل میں ان کا یہ خوف اسی وجہ سے ہے کہ کہیں وہ دوسری نسل اپنی عظمت کو وہ بارہ پہچان نہ لے۔ اسی لیے وہ ان کو اور کسی دوسری نسل کو بھی سنبھلنے نہیں دے رہے۔ کہتے ہیں کہ جھوٹ کو اگر روزانہ ایک ہی تسلسل اور روانی سے بولا جائے تو ایک وقت آتا ہے کہ جھوٹ جھوٹ نہیں رہتا۔ سچ بن جاتا ہے اور لوگ سچ کو جھوٹ سمجھنے لگتے ہیں۔ شاید یہ یہودی بھی اسی کچھ پر عمل کر رہے ہیں۔ یہ جانتے ہیں کہ ان کا جھوٹ دنیا پر سچ بن کر ظاہر ہو رہا ہے۔ اور ہمارا سچ بھی اب لوگوں کو جھوٹ لگتا ہے۔ یہ دنیا زور آوروں کی ہے۔ زور آور جو کہے گا، وہی سچ ہوگا۔ اور اس وقت یہودی ہی وہ زور آور ہیں۔“ جوزف بھی میری بات سن کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

## کیا آپ کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں؟

اگر آپ شاعر/مصنف/مواقف ہیں اور اپنی کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں تو ننگ کے معروف پبلشرز ”علم و عرفان پبلشرز“ کی خدمات حاصل کیجئے، جسے بہت سے شہرت یافتہ مصنفین اور شعراء کی کتب چھاپنے کا اعزاز حاصل ہے۔ خوبصورت ویدہ فریب ٹائٹل اور افلاطون سے پاک کمپوزنگ، معیاری کاغذ، اعلیٰ طباعت اور مناسب دام کے ساتھ ساتھ پاکستان بھر میں پھیلا کتب فروشی کا وسیع نیٹ ورک۔ کتاب چھاپنے کے تمام مراحل کی مکمل نگرانی ادارے کی ذمہ داری ہے۔ آپ پس میٹر (مواد) کو بھیجئے اور کتاب لجنے خواہش مند کے لیے سنہری موقع۔ سب کام گھر بیٹھے آپ کی مرضی کے عین مطابق۔

ادارہ علم و عرفان پبلشرز ایک ایسا پبلشنگ ہاؤس ہے جو آپ کو ایک بہت مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے کیونکہ ادارہ دنیا بھر میں پاکستان کے کئی ایک معروف شعراء/مصنفین کی کتب چھاپ رہا ہے جن میں سے چند نام یہ ہیں۔۔۔۔۔

عمیرہ احمد	ماہ ملک	فرحت اشتیاق	رخسانہ نگار مدد خان	قیصر و حیات	انجم انصار
نازیہ کول نازی	نگہت عبداللہ	رہمت سراج	نبیلہ عزیز	نگہت سیما	میونہ خورشید علی
اقرا صفیر صدیقی	ہاشم ندیم	طارق اسماعیل ساگر	انجم اے۔ راحت	انتخاب ساجد	شیما مجید (تحقیق)
حکی اللہ بین نواب	علیم الحق حق	احمد جاوید	جاوید چوہدری	ابیس ایم ظفر	

مکمل احکام کے ساتھ رابطہ کیجئے۔ علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار لاہور۔ [ilmolrnanpublshers@yahoo.com](mailto:ilmolrnanpublshers@yahoo.com)

## محبتِ ناقص

شاگرد سے اپنا رشتہ ایمان کے گھر لے جانے کی بات کرنے کے بعد اس دن شام کو نہیں واپس گھر پہنچا تو کشف صاحب کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ میں لاؤنج کی میز صیایں چڑھ کر اوپر جا ہی رہا تھا کہ ان کی گرجتی آواز نے میرے پاؤں جکڑ لیے۔

”مظہر۔“

میں رک گیا۔ اہی اور سجاد بھائی بھی جبرینہ بھابھی سمیت اپنے کمرے سے نکل آئے۔ ہا! آج ایک مکمل کشف صاحب کے روپ میں موجود تھے اور میں ان کے سامنے کئی بستہ ”ب“ کے مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

”تو تم لندن نہیں جاؤ گے۔“

”میں لندن جانے کے لیے تیار ہوں، اگر آپ لوگ اس گھر میں مولوی علیم کے ساتھ کی گئی بدتمیزی کا اندازہ کریں۔“

کشف صاحب دھماڑے۔

”واٹ۔۔۔۔؟۔۔۔ تو کیا اب تم چاہتے ہو کہ ریٹائرڈ کشف صاحب رضا جس کے نام کی کوچ ایوان صدر تک ہے وہ اب ایک معمولی مولوی کے سامنے محذور تہیں نہیں کرتا پھرے گا۔ جسٹ فارگٹ اٹ۔ Just forget it۔“

”تو پھر آپ سب بھی یہ بھول جائیں کہ میں آپ لوگوں کی کسی ہدایت پر عمل کروں گا۔“

میں نے میز صیایں چڑھنے کے لیے قدم اٹھایا۔

کشف صاحب بھر وھاڑے۔

”تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ تم جس صحت سے رہتے ہو وہاں صرف میری ہدایات اور میرا حکم ہی چلتا ہے۔“

گویا مجھے بالواسطہ یہ دھمکی دی جا رہی تھی کہ اگر میں نے کشف صاحب کے احکامات کی تعمیل نہیں کی تو مجھے گھر بدر بھی کیا جاسکتا ہے۔ مجھے کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی۔ کشف صاحب اپنی کشتری کے دور میں بھی تو نجی مجرموں کو شہر بدر اور قید بدر کرتے رہے ہوں گے۔ اور پھر میرا تو جرم بھی بہت بڑا تھا ”نرم عشق“۔۔۔ اور اس جرم کی معافی تو کسی بھی دور میں روا نہیں رکھی گئی۔ آج میں بھی اپنے گھر دانوں کی اس خود ساختہ عدالت میں محبت کا مجرم بنا کھڑا تھا۔

میں کشف صاحب کی طرف پلٹا۔

”تو کیا میں یہ سمجھوں کہ مجھے اس گھر میں مزید رہنے کا کوئی حق نہیں۔“

ابھی گھر آئیں۔ شاید انہیں بات کچھ بگڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”نہیں بیٹا۔۔۔ ہم بھلا ایسا کیوں چاہیں گے۔۔۔ ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ تم اپنے ذہن اور دل سے اُس لڑکی کا خیال نکال دو۔“

”نہیں اے اپنے ذہن اور دل سے نکالنے سے زیادہ آسان اس گھر سے نکلنے کو بھگتا ہوں۔۔۔۔۔“

میں نے واپس جانے کے لیے قدم باہر کی طرف بڑھائے۔ امی چلائیں۔

”خدا۔۔۔۔۔ یہ کیا طاقت ہے؟“

کشنر صاحب گرجے والے کے لہجے میں طنز اور تحقیر کا ایک طوفان چسپا تھا۔

”جانے دو! سے۔۔۔۔۔ دونوں میں آئے وال کا بھاد معلوم ہو جائے گا۔ اے باہر کی دھوپ ابھی تک لگی نہیں ہے۔ لو کروں کی قوت کی

خند محسوس تلے اخیر کٹھنڈ کمرہ میں زندگی گزارنے والے اور منزل و اثر چنے والے اس شہر سے لے ابھی تک گھر سے باہر کی نعمتوں کی اک جنگ

بھی نہیں دیکھی۔۔۔۔۔ ایک رات باہر رہے گا تو عشق کا سارا بھوت سر سے اتر جائے گا۔ تو لہجہ سے پیدل چلنا بھی نہیں آتا، کیوہاں جہاں

جانا چاہتے ہو وہاں تک چلے جاؤ گے پاؤں تیرے کوں کہ حصیں وہاں تک چھوڑ آئے۔“

میں کشنر صاحب کی طرف چلا۔

”بچے کو پیدل چلنا اس کے ماں باپ سکھاتے ہیں۔ انہوں آپ دونوں تے مجھے واقعی پیدل چلنا نہیں سیکھایا۔ لیکن وقت سب کچھ سکھا

دیتا ہے۔ وہ بھی جو انسان کے ماں باپ اے سکھانا بھول جاتے ہیں۔ میں بھی لو کروں، انیر کنڈیشنڈ کروں اور منزل و اثر کے بتا دینا سیکھ ہی جاؤں

گا۔ اور اگر نہ بھی سیکھ پایا تو آپ اطمینان رکھیے۔ آپ سے عدا مانگنے بھر بھی نہیں آؤں گا۔“

ابھی چلتی رہیں! ہچکار بھائی شہنا کے دھمکے۔ باا تھلا کر اپنے چانپ کا دھواں نکلتے رہے اور میں اس گھر سے نکل آیا۔

میرے سامنے شہر کے کھلے راستے تھے اور سر پر دھوپ لگنا آسان، کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرف کی راہ لوں۔ بابا نے سچ کہا تھا، میں

کبھی پیدل گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ میں نے اس شہر کا ہر راستہ اپنے سے ماؤں کی گاڑی کی دھڑکیوں سے ہی دیکھا تھا۔ آج زمین پر ان راستوں پر

چلتے ہوئے ان کی طوالت اور اصل منظر کا احساس ہو رہا تھا۔

کہتے ہیں ہر انسان دنیا کو بد لنے کی باتیں تو کرتا ہے۔ لیکن خود کو بد لنے کی کبھی کوشش نہیں کرتا۔ آج سے میں نے خود کو بد لنے کی کوشش

شروع کر دی تھی۔ بہت دیر تک میں ایک پارک کے بیچ پر بیٹھا ان بد لے ہوئے حالات پر غور کرتا رہا۔ میری جیب میں دو چار سو روپے ہی موجود تھے۔

اپنا اے۔ ٹی۔ ایم کارڈ اور کریڈٹ کارڈ میں وہیں لاؤنج میں گھر سے نکلنے سے پہلے گھر والوں کے سامنے پیشک آیا تھا۔ جانے یہ پیسے کیسے رو گئے

تھے جیب میں۔ شام دیر سے دیر سے پارک میں اترتی جا رہی تھی۔ لوگ جو آس پاس چل رہے تھے یا سوار تھے دیر سے دیر سے اپنے اپنے

گھروں کو روانہ ہونا شروع ہو چکے تھے اور کچھ ہی دیر میں دو پارک خالی ہو گیا۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ پارک کے چوکیدار نے مجھے آکر پارک بند

ہونے کی اطلاع دی۔ غار ہے اس کے کہنے کا مقصد یہی تھا کہ صاحب پارک بند ہو چکا ہے۔ اب آپ بھی اپنے گھر جائیے۔۔۔۔۔ لیکن میرا تو آج

کوئی گھری نہیں تھا۔ میں کس کے گھر جاؤں۔۔۔؟ بچپن سے لے کر آج تک میں جسے اپنا گھر سمجھتا رہا وہ کشنر صاحب کی عدالت نکلا۔ بات مانو تو رہو۔۔۔ نہ بالوں تو نکل جاؤ۔ ایسے ماں باپ ہم بچوں سے سالانہ ٹیکہ کنٹرکٹ قائم کیوں نہیں بھر دالیا کرتے۔۔۔؟۔ جس میں تمام شرائط درج ہوں اور ہر سال بچوں کو پڑھ کر سناٹا جائیں۔ تاکہ ہم کبھی اس چار دیواری کو کبھی اپنا ذاتی گھر سمجھنے کی غلطی نہ کریں۔

رات کا اندھیرا اب سڑکوں پر اتر آیا تھا اور سڑک کے کنارے کھڑے ٹریلوں پر لٹکے ٹیکس کے بھاری روشن دان اب جلنے لگ پڑے تھے۔ چلتے چلتے میری نظر گورنمنٹ سول ہسپتال کے گیٹ پر پڑی۔ مجھے یاد آیا کہ بچپن میں جب میرے تایا یہاں سول سرجن ہوا کرتے تھے جب میں اور کارما ران اسکول سے واپسی پر یہاں سے ضرور گزرتے تھے۔ ہمارا اسکول اسی ہسپتال سے آگے جاتی سیدھی سڑک پر واقع چوک کے بعد آتا تھا۔ ہم دو دنوں تایا کے دفتر بھی جاتے اور گفتگوں اس ہسپتال کی لمبی راہ پارہیوں میں دھما چوڑی مچاتے رہتے۔ ہسپتال کی صوبہ بھرے درختوں سے ڈھکی سڑکوں پر کھینچے رہتے تھے، مجھے یہ بھی یاد آیا کہ ہسپتال کے لیے لمبے اور گریں کے درختوں سے لکڑی کے لیے لمبے ٹیچے پڑے ہوئے تھے۔ جن پر مریضوں کے وہ لواحقین پڑے آرام کرتے رہتے تھے جو دور درواز کے علاقوں سے آتے ہوئے تھے اور شہر میں کوئی ہوٹل یا کسی کمرے کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ میری آج کی رات بھی ایک ایسے ہی لکڑی کے ٹیچے پر گزرنے والی تھی۔ اس وقت مجھے ان چند روپوں کا دھیان بھی نہیں رہا تھا جو اس وقت میری شرت کے جیب میں پڑے ہوئے تھے۔

میں ایک خالی ٹیچہ دیکھ کر اسی پر جا کر لیٹ گیا۔ بہت دنوں کے بعد سر پر کھلے آسمان اور تاروں کو یوں اپنے آپ سے ہاتس کرتا محسوس کیا تھا۔ بچپن میں جب ہم نانی کے گھر گرمیوں کی رات کو ان کے کھلے گھن میں چار پارنیاں ڈال کر سو یا کرتے تھے تو جب بھی کہانی سناتی نانی جان کی آواز صرف ہم تک نہیں بلکہ ہمیں دیکھ کر ان مکانے تاروں تک بھی جاتی تھی۔ تبھی تو ہمارے گھن میں چار پارنیاں ڈال کر ان پر چڑھتی یہ سارے تارے بھی ہمارے چار پارنیاں کے اوپر نانی کے گرد دست آتے اور پھر جب تک ہم کہانی سن کر سو نہیں جاتے۔ یہ تارے بھی ہمارے ساتھ جاتے رہتے دھتے کہینے اور ہاتس کرتے رہتے۔

بچپن کی طرح آج بھی یہ سارے تارے میری آج رات کی تنہائی کے ساتھی تھے۔ میں ان تاروں سے کچھ شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے انہیں اتنا عرصہ بھلائے رکھا تھا لیکن آج جیسے ہی تھا ہو کر میں نے پچھلی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا تو میرے یہ بھی بڑے دوست بنا کسی شلوے اور حکایت کے پھرے ہاتس کی طرح میرے سر پر آن بیٹھ ہوئے تھے۔ میرا درد باٹھنے کے لیے۔۔۔۔۔ بچپن میں ہر چچا اپنی پسند کا ایک تارہ منتخب کر لیتا ہے۔ دو کارما ران والا تارہ تھا، یہ لگی کا تارہ، یہ دو ہوا نے اپنے لیے رکھ چھوڑے تھے۔ اور یہ رہا میرا تارہ۔ سب سے چمک دار مجھے بچپن سے ہی سب سے الگ اور سب سے نمایاں چیزیں پسندنے کی عادت تھی۔ وہ بھی تو ایسی ہی تھی۔ سب میں نمایاں، سب سے الگ، اگر میرے دل نے اس کی خواہش کی تھی تو اس میں ایسا کیا بڑا تھا۔ یہ سارا زمانہ میرا دشمن کیوں ہو گیا تھا۔۔۔؟ یہ زمانہ ہمیشہ ہی سے محبت کرنے والوں کے خلاف کیوں ہو جا رہا ہے؟ ایسے ہی کچھ بے نام سے سوالوں کی پلٹا میں ساری رات بیت گئی۔ میں جب چونکا جب میرے دوست ستاروں نے ایک ایک کر کے مجھ سے دوا لینا شروع کر دی اور صوبہ بھرے اور چیری کے درختوں پر بندوں کے گھونسلوں سے ان کے نغھے مجھے بچوں کی چیخ و پکار بلند ہونا شروع



ہو گئی۔ شاید پرندوں کے گھونسلے بھی ہمارے گھروں کی طرح ہی ہوتے ہیں۔ پہلے بڑے چاک کر بچوں کے لیے ناشتے پانی کا بندوبست کرتے ہیں پھر چھوٹوں کا چنگا پاتا ہے۔

ہسپتال کی چھوٹی سی مسجد سے اذان کی آواز ابھری اور بھر مزاری ایک ایک کر کے مسجد کی طرف چل پڑے۔ میں کچھ دیر حیرت سے من نمازیوں کو دیکھتا رہا جو یوں صبح سویرے صمن اندھیرے اپنی خیر ترک کر کے، آنکھیں ملے ایک جذبے کے ساتھ مسجد کی طرف روانہ تھے۔ میں آج تک کبھی یوں صبح سویرے اٹھ کر نماز پڑھنے کی مسجد میں نہیں گیا تھا۔ جانے یہ کیسے لوگ تھے اور وہ کون سا جذبہ تھا جو انہیں یوں مسجد کی جانب کھینچنے لے جا رہا تھا؟ میری ساری رات آنکھوں آنکھوں میں ہی کٹ گئی تھی اور اس وقت سورج کی کرنیں اوجھے، لمبے چڑوں کی شاخوں سے چمن چمن کر زمین تک پہنچ چکی تھیں۔ زندگی کا کاروبار رواں دواں ہو چکا تھا۔ شاید کسی بڑے ڈاکٹر کے دورے کا وقت تھا۔ ہسپتال کے سفید وردی میں ملبوس عملے نے جلدی جلدی ہم سب شیخ کے کینوں کو دوپاں سے ہٹانا شروع کر دیا۔ میرا اب ویسے بھی یہاں بیٹھے رہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مجھے شاکر کے گھر جا رہا تھا۔ شاید وہ کل مولوی صاحب کی طرف گیا ہو؟ شاید اس کے پاس کوئی نئی خبر ہو؟ میں نے جیب میں خیر ارادی طور پر ہاتھ ڈالے تو نوٹوں کی کڑکڑاہٹ محسوس ہوئی۔ ہاتھ نکال کر دیکھا تو سو سو کے وہی چھ نوٹ جو گھر سے چلتے وقت میری جیب میں رہ گئے تھے باہر نکل آئے۔ میں نے ہسپتال کے گیٹ کے قریب کھڑے تانگے والے کو اشارہ کیا اور تانگے میں بیٹھ کر اپنی حویلی کی طرف چلنے کا کہا۔ اس دن مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ تانگے کی کچھلی سیٹ پر بیٹھے انسان کو اس پاس کے تمام مٹھریوں دکھائی دیتے ہیں جیسے کوئی ظلم الہی چل رہی ہو۔

شاکر جو اس وقت حویلی کے گیٹ سے نکل ہی رہا تھا، مجھے دیکھتے ہی جیسا پنے حواس کھو بیٹھا، اور میری طرف دوڑا چلا آیا۔ کچھ دیر تک تو وہ مجھے یوں ٹول ٹول کر دیکھتا رہا جیسے نہیں کسی اور جہاں کی مخلوق ہوں۔

”عماد بابا۔۔۔ آپ کدھر چلے گئے تھے۔ رات کہاں گزار دی ہے آپ نے، یہ کیا حالت بنائی ہے اپنی۔“

شاکر مجھے لے کر اپنے ہی کوارٹر میں چلا آیا، کیونکہ میں نے حویلی کے ڈرائنگ روم کی طرف جانے سے انکار کر دیا تھا۔ شاکر نے جلدی سے اپنے کوارٹر کی بیٹھک کا دروازہ کھولا جو باہر حویلی کے کچھواڑے والے باغ میں کھتا تھا۔ میں آنکھیں موندھے وہیں صوفے پر بیٹھا رہا جب تک شاکر اندر سے جلدی سے ناشتے کی ٹرے لے کر آ گیا۔ ٹھکت نے جلدی جلدی چند پراسے تھپے ہوئے اور ابلے ہوئے اطوؤں کا خاکینہ اور چائے بنا دی تھی لیکن میرا دل اس وقت کسی چیز کو ہاتھ لگانے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ شاکر نے بے حد اصرار کر کے چند گھنٹہ چائے کے میرے حلق سے نیچے اتروائے۔ مجھے شاکر سے مولوی صاحب کے گھر کے حالات جاننے کی جلدی تھی۔ لیکن شاکر نے پہلے میرے گھر کا احوال دیا۔ اس نے بتایا کہ وہ اس وقت مولوی صاحب کی طرف گیا ہوا تھا جب میں نے گھر چھوڑا تھا۔ شاکر جب ہمارے گھر پہنچا تو نوکروں نے گھر میں ہونے والے ہنگامے کا اس سے ذکر کیا۔ شاکر کے مطابق ای کچھ پریشان تھیں جب کہ باپا اور سہو بھائی کو یہ طہننا تھا کہ میں اور پدری شوگر میں کھا کر رات بھر میں ہی واپس آ جاؤں گا۔ البتہ چھوٹا عہد رات بھر مجھے میرے دوستوں کے گھروں میں تلاش کر رہا تھا۔

میں نے شاکر کو یہ نہیں بتایا کہ میں نے رات کہاں گزار دی تھی۔ اس کے تمام سوالوں کے جواب میں میں نے صرف ایک سوال کیا۔

”تم مولوی صاحب کے گھر گئے تھے۔۔۔؟ وہاں کی کیا خبر ہے۔“ شاگرد ہر سوال سن کر خاموش سا ہو گیا۔

”ہاں گیا تھا، مولوی صاحب تو اسی دن سے بستر پر پڑے ہیں، جس دن سے وہ آپ کے گھر سے واپس آئے تھے۔ پورے گھر پر سوگ جیسی کیفیت طاری ہے۔ ایسے میں مجھے ان سے کوئی دوسری بات کرنا چھان نہیں لگا۔ بس ان کی عیادت کر کے واپس چلا آیا۔ انہیں اس صدمے نے بالکل غمگین کر دیا ہے۔ شریف آدمی کی زندگی بھر کا اثاثہ صرف اس کی غیرت ہوتی ہے ہا۔۔۔ اگر کوئی اس پر ہی وار کر دے تو پھر وہ صرف ایک چلتی پھرتی لاش بن کر رہ جاتا ہے۔“

میں جانتا تھا کہ مولوی صاحب کے گھر پر اس وقت کیا قیامت گزر رہی ہوگی۔ شاگرد نے اچھا ہی کیا کہ وہ ہمارا کچھ بات کیے وہاں سے واپس چلا آیا۔ اب میرے وہاں مزید بیٹھے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس لیے میں بھی جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ شاگرد نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

”کہہ کر اوارا رہے جانا ہا۔۔۔ میں اب آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گا۔“

”میری اب کوئی منزل نہیں ہے۔ جس طرف قدم اٹھیں گے چلا جاؤں گا۔ مجھے اپنے آپ کو پیچانے کا ایک موقع ملا ہے۔ مجھے روک کر اسے ضائع نہ کرو۔ ورنہ میں ساری زندگی بچاؤ کیا خود اپنے سامنے بھی نظریں نہیں اٹھا سکوں گا۔“

شاگرد میری طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا کہ میں جو بات ایک مرتبہ دل میں بھان لوں۔۔۔ پھر اس سے پلٹا میرے لیے ناممکن ہو جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں بھرا آئیں۔ وہ جانتا تھا کہ میری ساری زندگی پھولوں کی بیج پر گزری ہے۔ یہ کتنے مجھے بہت جلد بولہاں کر دیں گے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میں نہیں رکوں گا اور یہ بردہ ہی اب میرا مقدر ہے۔ شاگرد میرے ساتھ حویلی کی آخری حد تک آیا مگر سے قلعے ہوئے غلبت پر میری نظر پڑی جو اپنے دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کرتی دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ میں نے کچھ آگے جا کر زبردستی شاگرد کو گھر واپس بھیج دیا۔ اُسے اچھی ڈیوٹی پر بھی بھیجنا تھا۔ کسٹمر صاحب کا پارہ ویسے ہی رات سے بہت چڑھا ہوا تھا۔ اور میں جانتا تھا کہ آج حویلی کے جو کدوں کی شامت آئی ہوگی۔ شاگرد واپس پلٹ گیا۔

سڑک پر کچھ دُور چلنے کے بعد مجھے پھر ایک ناگاہک مل گیا۔ میں نے تانگے والے کو ریلوے اسٹیشن چلنے کے لیے کہا۔ مجھے یاد پڑتا تھا کہ کامران کے ایک دوست کے رشتے دار ریلوے میں اسٹیشن ماسٹر تھے۔ شاید چارہ صدیقی نام تھا۔ وہ مجھے نہیں جانتے تھے لیکن میں نے کامران سے ان کا بارہا ذکر سنا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اب تو کوئٹہ ریلوے اسٹیشن پر ہی تعینات ہوں؟۔۔۔ زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ اور پھر مولوی علیم صاحب کا ایک جملہ میرے کانوں میں جیسے اٹک کر رہ گیا تھا۔

اس دن جب میں ان سے گیٹ پر معافی مانگ رہا تھا اور ان سے کہہ رہا تھا کہ وہ میرے گھر والوں کی زیادتی کی جو سزا چاہیں مجھے دے دیں۔ تو اس دن شاید انہوں نے میں ہی سمجھی، لیکن ان کے منہ سے ایک بہت بڑا جملہ نکل گیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔

”تمہاری اپنی شہادت ہی کیا ہے؟۔۔۔ معافی مانگنے اور معاف کیے جانے کا حق صرف انہیں ہوتا ہے جو خود اپنی کوئی شہادت رکھتے ہیں۔ تم تو خود ان کے جنازے پر حضور نے آج میری سفید پوشی پر اور میری معصوم بچیوں پر کچھ اچھا لیا ہے۔“



ملیوں تھا۔ کانہ سے پرہیز، سترج، کپڑے اور ہاتھ پر لٹو ہے کا پلا (ج)۔۔۔ اس نے کمرے میں گھسنے سے پہلے بیڑی بجھا دی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ صدیقی صاحب کی بہت عزت کرتا تھا۔ غوراً غوراً کر سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔

صدیقی صاحب نے بھر سرائیا۔

”ہاں بھی غورے۔۔۔ تمہاری نظری پوری ہوئی یا نہیں۔“

”کوہر صاحبہ بی۔۔۔ وہ سٹو کا بیٹا جسے پچھلے مہینے منویا ہو گیا تھا۔ اس نے ابھی تک ڈپٹی پرپورٹ نہیں کی ہے۔ وہ ایک اور بھی ہیں حرام غور، جو مفت کی چٹیاں کرتے رہتے ہیں۔ میں نے کاغذ بنایا ہے، کل آپ کو کھپات مل جائے گی۔“

معلوم ہوا کہ غوراً اسٹیشن پر موجود ریلوے پورٹ کا لیبر انچارج تھا۔ صدیقی صاحب نے مجھے اسی کے ساتھ عارضی طور پر لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ کیونکہ مستقل قلمی بننے کے لیے مجھے سے باقاعدہ اجازت نامہ لینا پڑتا تھا اور یہ لمبا کام تھا۔ ابوت یہ صدیقی صاحب کے اختیار میں تھا کہ وہ روز کی آمدت پر عارضی طور پر رکھے جانے والے مزدوروں یا قلمیوں میں میرا نام ڈلوادیتے۔

”غورے۔۔۔ یہ جاد ہے۔۔۔ آج سے یہ تو جوان تمہارے سائڈ راکم کرے گا۔ فی الحال عارضی ہے۔ کام ہو چکے کر فیصلہ کریں گے کہ بکا پمٹ جاری کریں یا نہیں۔“

غورے نے حیرت سے سر سے ہر تک ہر اچانک لیا۔ جاتے میرے چہرے پر ایسی کون سی تحریر تھی کہ ان میں سے کوئی بھی مجھے مزدور تسلیم کرنے پر ذہنی طور پر رضا مند ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ پہلے صدیقی صاحب اور اب یہ غور۔ شاید عمر بھر کی خوش حالی از خود ہمارے چہرے پر ایک خاص تحریر اور ایک خاص پنک پیدا کر دیتی ہے۔ لگتا تھا یہ تحریر مٹنے مٹنے مٹنے کی اور یہ پنک جاتے جاتے جاتے۔

صدیقی صاحب نے جاتے جاتے مجھ سے کہا کہ کسی بھی وقت کوئی بھی مسئلہ درپیش ہو تو میں ان کے پاس آسکتا ہوں۔ میں تے انہیں بتایا کہ میرے پاس رہنے کا کافی المال کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اور میں اکیلا ہوں۔ صدیقی صاحب نے غورے سے کہا کہ وہ قرقر کا اس والے ویٹنگ روم کے چڑا سیں کو میرے بارے میں بتا دے کہ میں رات وہیں بسر کیا کروں گا فی الحال۔ ویسے تو اس وقت گرمیوں کا موسم تھا اور رات پلینٹ فارم پر بھی گزار دی جا سکتی تھی۔ غورے نے سب سے پہلے میری دردی کو داس سے ٹکوا کر میرے حوالے کر دی۔ مجھے میری فی شاشت کا پہلا نمبر بھی ملا تھا کہ دیا گیا۔ میری پہلی شاشت۔ حاد۔۔۔ مزدور نمبر 137۔ بلکہ یہاں تو مزدوروں کو ان کے نام سے نہیں بلکہ ان کے نمبروں سے ہی پکارا جاتا تھا۔ میں بھی اب حاد تھا۔ میرف۔ ایک نمبر تھا۔ مزدور نمبر 137۔۔۔۔۔ بلکہ یہ تو اچھا ہی تھا۔ میرا نام بھی ان مزدوروں کے ناموں میں کسی بھی طرح نہیں جاتا تھا۔ اگر شاشتی کا رو کی نقل پر لکھا تو میں جمع کروانے کی شرط نہ ہوتی تو شاید میں اپنا نام بھی بدل ہی لیتا۔

ہر ریلوے اسٹیشن کی اپنی ایک الگ ہی دنیا ہوتی ہے۔ الگ ہی صبح شام ہوتے ہیں۔ میں آج تک نہ توئی جہاز سے ہی سڑکرتا چلا آتا تھا۔ میرا زمین کے سڑک پر جو صرف لندن اور یورپ کی ٹرینوں کا تھا۔ اپنے ملک میں تو میں نے کبھی ٹھیک سے کوئی ریلوے اسٹیشن بھی نہیں دیکھا تھا۔ اور نقد رکاوٹ یہ کہ مجھ پر تھا کہ میں آج اپنے ہی شہر کے ریلوے اسٹیشن پر مزدور بنا کھڑا تھا۔



## نیند

اُس رات کلاس میں بلیک بورڈ پر نعرے لکھنے والے واقعے کے بعد میں بہت دیر تک بستر پر گرہ میں بدلتا رہا۔ جاتے نیند کو آنکھیں بند ہونے کے ساتھ ہی کیوں منسل کر دیا گیا ہے۔ انسان آنکھیں بند کر کے بھی تو ساری عمر جاگ سکتا ہے۔ میں تو ایسے کئی لوگوں کو کبھی جانتا ہوں جو کھلی آنکھوں سے تمام عمر نیند میں ہی ڈوبے رہے ہیں۔ شاید ہم جسے نیند سمجھتے ہیں وہ اصل میں نیند ہے ہی نہیں۔ نیند کا تعلق تو سکون سے ہوتا ہے۔ چٹکیں بند کر لینے سے نہیں۔ میں بھی جانے کتنی صدیوں سے صرف چٹکیں ہی بند کر پار ہاتھار نیند تو جانے کب سے مجھ سے روٹی ہوئی تھی۔

اگلے دن صبح کامران نے مجھے یونیورسٹی ڈراپ کیا۔ اتفاق سے پارکنگ میں ٹرکے وقت سارو بھی اپنی سفید چٹل کار میں سے اترتی دکھائی دی۔ کامران کی ساری توجہ اسی کی طرف تھی۔ نیپلہ اسکرٹ میں اور اوپر بند گھٹے کی سفید سوٹر میں واقعی اس کا لحسن قیامت ڈھار ہاتھار۔ کامران کے منہ سے سٹی بی ٹی۔

”یار میڈی۔۔۔ تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمہاری یونیورسٹی میں ایسی ایسی حوریں بھی پڑھنے آتی ہیں۔ تمہارا اگلھا میسٹر کب سے شروع ہو رہا ہے یار مجھے آج اپنی جاہلیت کا دور ہے احساس ہو رہا ہے۔“

”زیادہ آج میں بھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بھول تمہارے پیدہ ییودن ہے جو میری جان کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اس لیے اس پر ٹلو ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسے مسلمانوں سے شدید نفرت ہے۔“

کامران نے ڈھٹائی کی انتہا کر دی اور سارو کو ایک مشہور ہالی وڈ ایکٹر میں سے ملا جینا۔ یہ اس کی پُرانی عادت تھی۔ وہ لوگوں کو ان کے چہرے کی مماثلت سے مشہور اداکاروں سے ملا ج اور پھر اسی نام سے انہیں پکارتا تھا، اُس نے پھر شہنشاہی آدھ بھری۔

”کوئی بات نہیں یار۔ یہودی بھی تو اہل کتاب ہوتے ہیں۔ اور پھر مجھے تو یہ بالکل مسلمی بائبل لگتی ہے یار۔ اتنی خوبصورت لڑکی سے دشمنی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں اپنی کھچلی جو بوج واپس لینا ہوں۔ اور تمہیں فوراً اس سے دوستی کرنے کا نیا مشورہ دیتا ہوں۔“

میں نے بمشکل کامران کو زبردستی دہلی سے واپس بھیجا۔ سارو بھی گاڑی سے اترتی ہی کسی طالب علم کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئی تھی۔ کامران نے حتی الامکان گاڑی اس کے بہت قریب سے گزرا وہی جس کا سارو نے کچھ خاص نوٹس نہیں لیا۔ میں اپنا بیک سنبھالے آگے بڑھ رہا تھا کہ سارو نے مجھے آواز دی۔

”مسٹر حاد۔۔۔ ایک صف چلیز۔۔۔“

میرے بڑھتے قدم ٹک گئے۔ سارو ہلدی سے اپنے ہوا میں لہراتے کھلے بالوں کو سنبھالتی ہوئی میری طرف چلی آئی۔ ”مہیا نے مجھے

تھمارا بیغام دے دیا تھا۔ میں نے آج تک زندگی میں کبھی کسی کو کوئی وضاحت پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لیکن ابھی اپنے اوپر کسی دوسرے کے کیے ہوئے کا اثر ابھی برداشت نہیں کیا۔ میں نے کلاس روم کے بلیک بورڈ پر دو سب کچھ نہیں لکھا تھا اور مجھے لکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ میں اپنے خیالات کا برملا اظہار کرتی ہوں اور اس کی مصمت بھی رکھتی ہوں۔

”تو پھر میں اس وضاحت کو کیا سمجھوں۔ کیا تم اپنے دوستوں کی طرف سے بھی وکالت پیش کر رہی ہو، ظاہر ہے یہ ان میں سے ہی کسی ایک کی حرکت ہے۔“

”میں ان میں سے بھی کسی کی وکالت پیش نہیں کر رہی ہوں، کیونکہ جج کو وکالت کی ضرورت نہیں ہوتی۔“

”جج کو وکیل کی ضرورت تو ہوتی ہے نا اور جن کے پاس وکیل نہیں ہوتی وہی ایسی بچکا نہ کر سکیں کر کے اپنا قصدا اپنی فرسٹریشن نکالتے ہیں۔“ سارہ نے ایک گہری نگاہ میرے اوپر ڈالی اور سرد سے لہجے میں بولی۔ ”دوسروں کا تو مجھے نہیں پتہ لیکن میرے پاس ہزاروں دلائل موجود ہیں لیکن میں نے کہا نا، جج کو وکالت کرنے کے لیے میں ان دلائل کو بیان کرنے میں اپنا اور تمہارا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی۔“ میں نے اُسے فیصلہ سنا دیا۔

”تو پھر طے رہا ہم دونوں میں سے جس نے بھی دوسرے کو اپنے جج سے قائل کر دیا، دوسرا اسی کا راست اپنا لے گا، بولو حضور ہے۔“

سارہ نے چونک کر میری طرف دیکھا اور شاید اُسے میری آنکھوں میں چمپا چنبلی بھی سانس نظر آ گیا۔

”منظور ہے، تمہیں برا کر مجھے واقعی بہت خوشی ہوئی۔“

”اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا۔ جیسٹ آف لک ”Best of Luck“ میں اور سارہ مخالف سمتوں میں مڑے اور اپنے اپنے راستوں پر چل دیے۔ دُور سے کوئی دیکھنا تو اسے یوں لگتا کہ ہم ایک ہی کمان سے چھوٹے دو مختلف تیر ہیں جنہیں دو مختلف سمتوں میں ایک ساتھ چھوڑ دیا گیا ہو۔

اس دن کلاس میں سارہ کے ٹیگ نے مجھ پر دو قافو قافترے بازی کرنے کی کوشش کی لیکن میں پُپ رہا۔ ربیکا سارہ کی بہت اچھی دوست تھی لیکن جانے کیوں اس دن کے بعد سے اس نے میرے ساتھ ہی ڈیسک پر بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ کلاس میں پڑے ہر ڈیسک پر دو طالب علموں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اور جس دن سے میں کلاس لے رہا تھا سب سے اب تک میں اکیلا ہی بیٹھتا تھا۔ ربیکا ابھر ہر کدہ گدہ کرنے والی، ہمیشہ جیٹر جیکٹ میں لباس پہنے اور جوتے پہنانے والی ایک شوخ و شنگ تھلی جیسی لڑکی تھی، جو چلتے وقت اپنے پوائے کٹ ہالوں کو ایک خاص اداسے جھکتی تو آس پاس کے نوجوانوں کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ لیکن ایک آدھ دن جب وہ میرے ساتھ ڈیسک پر بیٹھی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ پڑھائی میں بھی اتنی ہی دلچسپی رکھتی ہے جتنی دوسری شہنیوں اور لائبال پنا میں۔

سارہ کا ٹیگ لیڈر ابھر ایک یہودی لڑکا جم تھا، اُس کے علاوہ بیٹا بھی ان کے گروپ کی سرگرم رکن تھی۔ یوں سارہ بیٹا، جم اور ڈیوڈ پر مشتمل یہ چار کونوا تھا جو در پردہ سارہ جی کی دی ہوئی ہدایات پر عمل کرتا تھا۔ پھر ایک دن بریک کے دوران جب جم نے اسٹوڈنٹس کو ڈانے کے لیے

کچھ رکاوٹوں بنائے اور چند مزاحیہ جملے لکھے تو مجھے اس کی لکھائی سے اندازہ بھی ہو گیا کہ اس دن بلیک بورڈ پر اسی کی تقریر تھی جو زہرا گل دہی تھی۔ بہر حال اس دن کے بعد کم از کم بلیک بورڈ کی حد تک دوبارہ کسی نے وہ حرکت ڈہرانے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن میں جانتا تھا، یہ لا واندہری اندر رکھیں چک رہا ہے۔ تیسرے ہی دن یونیورسٹی میں شعبہ جات کے درمیان تقریری مقابلے کا اعلان ہو گیا۔ تقریر کے لیے نام طلب کیے گئے تو ریکارڈ شراست میں میرا نام بھی نوٹس میں مل گیا۔ اس وقت کچھ لکھنے میں مگن تھا، سارہ نے ریکارڈ کی اس حرکت پر اسے کڑی نظر دوں سے گھورا، بہر حال میرا نام بھی اب مقررہ کی اسٹس میں شامل ہو چکا تھا۔

اس دن یونیورسٹی کا مرکزی ہال کچھ کچھ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ لندن کے میگز کوہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ مجھ سے پہلے سارہ کی باری آئی۔ وہ بلیک کوٹ اور اسکارف میں ہال پانچمے کسی اسکول کی طالبہ لگ رہی تھی۔ سارہ نے جم کر تقریر کی اور یہودیوں کے ایک مفروضے ”ہالوکاسٹ“ (جس میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران نازی جرمنوں نے پچاس لاکھ سے بھی زیادہ یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا) کے بارے میں والکل دیے۔ میں اس وقت اس مفروضے کے بارے میں اتنی تفصیل سے نہیں جانتا تھا۔ میں سارہ کی تقریر کے دوران یہی سوچتا رہا کہ بعد میں جوزف سے اس معاملے پر تفصیلی بات ضرور کروں گا۔ سارہ کے بعد میرا نام پکارا گیا۔ ہال میں سناٹا سا چھا گیا جس میں صرف ریکارڈ جوزف کی تالیوں کی گونج باقی رہی۔ میری تقریر کا موضوع بین ال مذہب مکالمہ Inter Religion Debate تھا۔

میں نے صدر محفل کا شکر یہ ادا کر کے حاضرین کو مخاطب کیا جن میں سب سے اگلی قطار میں سر آئزک ہینے ہوئے تھے۔

معزز حاضرین۔۔۔ مختلف مذاہب کے درمیان مکالمہ اس دور کی حادیہ سب سے بڑی ضرورت ہے۔۔۔ دنیا کا کوئی بھی مذہب، مذہبی تعصب کی اجازت نہیں دیتا۔۔۔ ہاں یہ حقیقت ہے کہ کل جن کو عروج حاصل تھا۔ آج وہ اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے زوال کا شکار ہیں، مذہبی تعصب کی سمینٹ چڑھ رہے ہیں ان میں ان پر تنقید کی جا رہی ہے۔ مذہب اور سائنس کے ٹکراؤ کی گھنٹا بجا رہی ہے۔

کیا وجہ ہے کہ فرانس میں کوئلہ قیوری کو تو حقیقت مان لیا جاتا ہے۔ لیکن روشنی کے اس سفر کی سب سے بڑی شہادت ”واقعہ معراج“ کو جھٹلایا جاتا ہے۔۔۔؟ تاہم مشین اور مشین میں سفر کے قصے تو سب کی زبان پر ہیں اور ان ایجادات کے ظہور کا انتظار بھی کیا جاتا ہے، لیکن اسی روشنی کی رفتار سے برحق پر سفر کرنے والے اور مسات آسمانوں کی شہادت لانے والے پر یقین نہیں کیا جاتا۔۔۔؟ حق اور برتری کے جنون میں اسٹیم بم برسانے والوں کو تو مذہب کہا جاتا ہے اور اسے گھر کی حفاظت کے لیے پتھر اٹھانے والوں کو دہشت گرد کا رتبہ دے دیا جاتا ہے۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ اور ایسے بہت سے دوسرے سوال ہیں جن کا جواب نہیں اپنی ہی اس نسل سے چاہتا ہوں۔۔۔۔۔“

میں ایک جذب کے عالم میں جانے کیا کچھ بولتا رہا۔ اور جب چونکا جب ہر طالب علم کو دیے جانے والے اساتذہ منت ختم ہونے کے بعد اسٹیج سیکڑی نے نکھنی بھا کر مجھے احساس دلایا کہ میرا وقت ختم ہو چکا ہے۔ میں شکر یہ ادا کر کے اتر آیا۔ تمام ہال کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ پھر سب سے پہلے ریکارڈی کھڑی ہوئی اور اس کی تالیوں کی گونج میں رفتہ رفتہ دیگر ہال بھی شامل ہو گیا۔ میں نے اسٹیج پر کھڑے ہوئے بھی اور پھر نیچے اترتے وقت بھی سر آئزک کو کسی گہری سوجھ میں ڈوبا ہوا پایا تھا۔ سارہ کے چہرے پر البتہ کچھ جبرانی اور کچھ ٹھنڈائی کی کیفیت تھی۔ میں نے نوٹ کیا کہ



وہ اپنے ہڈ ہات کو چپانے میں کمال رکھتی تھی۔ تقریب ختم ہونے کے بعد ہال سے نکل کر منس راہداری سے گزر رہا تھا کہ دیکھا نہ جانے کہاں سے مجھے آوازیں دیتی بھاگتی ہوئی چلی آئی۔ اس کا سانس بھولا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے ڈور سے ہاتھ ملایا۔ اور خوشی سے بولی۔

”ہے میڈی۔۔۔۔۔ گریٹ یار۔۔۔۔۔ میں نے تو یونہی مستی میں تمہارا ہاتھ کھڑا کر دیا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تم اتنا بہترین بول پلٹے ہو۔ ویسے تو بڑے چپ چاپ رہتے ہو ہاں۔ بہر حال۔۔۔۔۔ تم مانو نہ مانو۔۔۔۔۔ تمہاری تقریر نے پورے ہال پر سسکھٹ ماری کر دیا تھا۔۔۔۔۔ لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی تمہاری باتیں سننا اور ان پر یقین کرنے پر مجبور تھے۔ کیونکہ تمہارے پاس ہر بات کی دلیل موجود تھی۔“

میں نے مسکرا کر اس زندگی بھر کی لڑائی کی خوشی کو سراہا۔

”میں نہیں جانتا یہ تمام لاج (Logic) یہ تمام دلائل میرے پاس کہاں سے ایک دم ہی آ گئے تھے۔ کیونکہ میں کبھی کوئی خاص مذہبی انسان نہیں رہا۔ اور میں نے پہلے سے اس تقریر کے لیے کوئی تیاری بھی نہیں کی تھی۔“

”نہیں جانتی ہوں۔ سب مقررین کو موقع پر ہی تقریر کے عنوان دیے گئے تھے۔ بہر حال اہم نے میدان مار لیا۔ چلاوی بات پر حصص کیلئے میرا سے بہترین کافی پلے آتی ہوں۔“

ریٹائی کی عادت تھی کہ وہ بات کہہ کر جواب سنے بغیر آگے چل دیتی تھی۔ سو میں بھی ایک لمبی سی سانس بھر کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ کیونکہ اس سے بحث کرنے یا منع کرنے میں اس سے کہیں زیادہ وقت لگ جاتا تھا کافی کا ایک سگ مطلق سے نیچے اتارنے میں لگتا ہے۔

بظاہر یونیورسٹی کا ماحول بے سکون تھا، لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ میری اس دل کی، کی ہوئی تقریر آگے چل کر چند ملتوں میں کن کن نٹ سے اور بڑے طوفانوں کو جنم دینے والی ہے۔ بقول کامران ”میں یہودی نظروں میں آچکا تھا لیکن بے خبر تھا۔“

☆☆☆

## تساؤ کے آدم خور

تساؤ کے آدم خور : حکایات کے موضوع پر ایک مستند کتاب اور تحقیقی چرائی چھاوا تھا۔ یوگنڈا (کینیا) کے دو خوشوار شیر جو آدم خور بن گئے تھے۔ ایک سال کی قید میں 140 انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والے **تساؤ کے آدم خور** جنہوں نے یوگنڈا میں پچھنے والی ریلوے لائن کا کام کھائی میں ڈال دیا تھا۔ جو لومڑی سے زیادہ مکار تھے اور چھٹا وہ کی طرح غائب ہو جاتے تھے۔ اس سچے واقعے پر انگلش فلم Ghost & The Darkness بھی بنائی گئی۔ جون ہنری پیٹرسن (فونی اور ریلوے لائن کا انچارج) کی کتاب The Man-Eaters of Tsavo (آرڈر جبر **کتاب گھر** پر **شکاریات** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

## خدا اور محبت

مجھے ریلے اسٹیشن پر مزدوری کرتے تقریباً ایک ہفتہ ہوئے کو آیا تھا۔ میرے ہاتھوں کو چمکا ایسی مشقت کی عادت نہیں تھی اس لیے پہلی رات ہی ان پر چھالے پڑ گئے تھے۔ جواب رفتہ رفتہ معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ غصہ اور امیرا جس حد تک خیالی رکھ سکتا تھا وہ رکھ رہا تھا۔ ویسے بھی نہیں دوسرے مزدوروں سے کچھ الگ تھلک ہی رہتا تھا۔ ان کے اپنے چھوٹے چھوٹے نم تھے چھوٹی چھوٹی خوشیاں تھیں۔ ان سب میں ان کی دانست میں زیادہ بڑھا کھٹا ہونے کی وجہ سے غصہ نے میرا نام "باؤنڈ رکھ چھوڑا تھا۔

میری راتیں پلیٹ فارم یا ویٹنگ روم کے کسی بیچ پر گزرتی تھیں۔ اور دن سارا مزدوری کرتے ہوئے۔ مجھے ان دنوں میں اس بات کا احساس شدت سے ہوا کہ ہم انسانوں نے اس زندگی کو ایک خواہ مخواہ کا کھینچا بنا کر رکھ چھوڑا تھا۔ انسان چاہے تو اس کا گزرا وہ دوڑے کپڑے میں بھی بہت خوش اسلوبی سے ہو سکتا ہے۔

میں سارا اور امیرا، جس کے کپڑے لندن کے بڑے بڑے بونیک سے تیار ہو کر آتے تھے۔ جو کف نکس اور ٹائی کی پٹن بیچنگ نہ ہونے کی وجہ سے پورے کا پورا سوٹ اٹھا کر باہر بیچک دیتا تھا اور جس نے کبھی کسی تقریب میں ایک دفعہ کا پہنا ہوا لباس دوبارہ نہیں پہنا تھا۔ وہ سارا آپ بڑے عام سے اپنے ایک جوڑا اینٹ شرٹ اور ایک دروی میں گزارا کر رہا تھا۔ ریلے کے دھوئی گھاٹ سے پانچ روپے میں جوڑا حل کر آ جاتا تھا اور دروی تو ویسے بھی سرکاری طور پر ہر دوسرے روز دھل کر آ جاتی تھی۔

کبھی میری سمجھیں کا نئی نینٹل، انگلش یا عربی ناشتے کے لوازمات کے بغیر مکمل بھی نہ ہوتی تھیں۔ فرانس کا بنا ہوا کارن فلیکس اور مصر کا در آمد شہد نہ ہوتا تو میں ناشتہ ہی اٹھوڑا چھوڑ کر اٹھ جاتا تھا۔ اب پلیٹ فارم کے کیمین کی تیز چلنی کی چائے اور بند کھن کے ساتھ بڑے مزے کا ناشتہ ہو جاتا تھا۔

فریش اسٹرابری ٹیک کی جگہ گئے کے رس نے لے لی تھی۔ فائین اسٹار ہونٹوں کے بچ اور ان کی جگہ پلیٹ فارم کے ہونٹ کے عکس کی سادہ روٹی اور شوربے نے لے لی تھی، اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ شروع کے دو تین دن کے علاوہ بعد میں مجھے کوئی خاص فرق بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ ان دنوں مجھے حذت سے یہ احساس ہوا کہ واقعی ہم انسانوں نے خود اپنی زندگیوں کو مفت کے جمیلوں میں الجھنا یا ہوا تھا۔ خاص طور پر ہم امیر لوگ، ہماری خود پرستی اور خود پسندی اک عذاب ہی تو ہے۔

مجھے یہ بات بھی سمجھ نہ آتی تھی کہ انسان کی زندگی میں دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں کو اگر زندگی بتانے کا ایک پیمانہ نہ سمجھا جائے تو ان چوبیس گھنٹوں میں سے زیادہ تر لوگ توبہ گئے دن اور رات کی فہم میں ہی بتا دیتے ہیں۔ باقی بچے بارہ گئے تو اس میں سے بھی چھ گئے تو دنیا داری کی

فکر، دھڑکن اور فکریوں یا کاروبار وغیرہ کے جھیلے میں گزر جاتے ہیں۔ باقی چھ گھنٹوں میں بھی آپ کھانے پینے اور کہیں آنے جانے کا دورانیہ شامل کر لیں تو زندگی کے مشکل دو یا تین گھنٹے ہی گزرتے ہیں جو ہم یا کوئی بھی انسان اپنے لیے چاہتا ہے۔ اب ان دو تین گھنٹوں کی زندگی کے لیے اس قدر ہرجہ جہد، اس قدر سہ ایمانی، اس قدر کھینچا تانی کی کیا ضرورت ہے۔ انسان اگر معیار کے حوالے سے پڑتا چاہے تو پھر معیار اور داخلی زندگی کی بھلا کیا حد ہو سکتی ہے۔ اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایک سے بڑھ کر ایک نفس بھری زندگی کی مثالیں ہمارے سامنے آ جا سکیں گی۔ لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب کے پاس ہوتے ہیں چوبیس گھنٹے ہی ہیں۔ سارا کھیل، انہی چوبیس گھنٹوں کو نالے کا ہے۔ چاہے بہترین سے بہترین ٹھکی بے وقتی میں کاٹ لیں، یا پھر جو کچھ میسر ہے اسی پر مبرا اور شکر کر کے بتا دیں دن بھر شوہ کرتے رہیں یا پھر بعدہ شکر میں بسر کر دیں۔ یہ چوبیس گھنٹے تو بہر حال گزر رہی جاتے ہیں۔

زندگی روز مجھے نئے نئے سبق سکھا رہی تھی۔ یا شاید نئی زندگی کی حقیقت کو سمجھنے لگا تھا۔ شاید مجھ سے لے کر ابھی کچھ زیادہ مشکل نفس ہوئی تھی کیونکہ میں اکیلا تھا۔ شاید رشتے ہی انسان کی سب سے بڑی مجبوری بن جاتے ہیں۔ رشتوں کے تقاضے انسان کو ہشکری اور خوب سے خوب تر کی ریس میں شامل ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ شاید دنیا میں اگر ہر آدمی اکیلا ہی ہوتا تو اسے زندگی اتنی کشن اور مشکل سمجھی نہ لیتی۔ میاں، بیوی، بچے، بھوک کے پیچھے۔۔۔ یہ سب رشتے ہیں۔ انسان کو اس دلدل میں دو ٹھیکل دیتے ہوں شاید؟

ایک بخت پورا ہو گیا تھا اور آج جمعرات کا دن تھا۔ آج میری شام کو چھٹی تھی۔ نہیں غصہ سے کوہنہ کر اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ یہ پورا ہفتہ میں نے باہر کی دنیا کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں اس شہر میں بالکل نیا ہوں۔ اسٹیشن سے ایک تانگے والے کو نہیں نے مولوی عظیم کے رُانے محلے چلے کو کہا۔ ہم زندگی میں روزانہ کی فیصلے کرتے ہیں کہ کل یہ کیا ہے، اگلے ہفتے وہاں جانا ہے، غلامی تاریخ کو ملاں کام کرتا ہے لیکن ان میں سے بہت کم فیصلے ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی تشکیل کا وقت قریب آتے ہی آپ کا دل ڈوبنا شروع کر دے۔

بس یہی حالت اس وقت میری بھی مولوی صاحب کے گھر کی طرف جاتے ہوئے ہو رہی تھی۔ لیکن نہیں سمجھتا تھا کہ شاید اب میں ان سے کئی زیادتی کی معافی مانگنے کے قابل نہ رہی۔۔۔ پر طلب کا رتو ہو سکتا تھا۔

تانگے نے مجھے رُانے محلے کے گیٹ پر اتار دیا۔ یہ عصر کا وقت تھا، ابھی کوئی شام پانچ ساڑھے پانچ بجے ہوں گے۔ نہیں دھڑکتے دل اور ہماری قدموں سے مولوی صاحب کی گلی کے کڑنک آ چہنچا۔ لیکن اب آگے بڑھنے کی ہمت جیسے ختم ہوتی جا رہی تھی۔ کچھ مولوی صاحب کا دوبارہ سامنا کرنے کی وجہ سے اور کچھ اس نازنین کے گھر کے اس قدر قریب پہنچ جانے کے خیال سے ہی جیسے میرے پیسے سے چھوٹ رہے تھے۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ قدم آگے بڑھا دیے۔ مولوی صاحب کی گلی میں تین چار ہی گھر تھے اور اس وقت گلی تقریباً انسان ہی پڑی تھی۔ بہت دیر تک نہیں مولوی صاحب کے مکان کے فکڑی کے دروازے کے قریب کھڑا اپنی سانسیں درست کرتا رہا۔ اندر سے ڈوسر کے بولنے کی مدد ہی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میرا دل پھر سے اچھلا۔ شاید یہ ایمان کی ہی آواز ہو۔ میں نے بلکے سے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک کے بعد کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور پھر کسی نے دروازے کے قریب آ کر پوچھا۔

”جی کون ہے۔۔۔؟“

یہ ایمان ہی کی آواز تھی۔ اس کی آواز کا جلتک میں بھلا کیسے بھول سکتا تھا۔ میرے لیے اس لمحے زمین اور آسمان کی گردش جیسے تھم ہی گئی تھی۔ جواب میں نہیں نہ جانے کیا کہنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے میرے منہ سے غوں غاں کی کیسی جھپ سی آواز نکلی کہ اسے دوبارہ میرا نام پوچھنا پڑا۔ اتنی دیر میں ایمان دروازے کے بائیں قریب کھنچ گئی تھی مولوی صاحب کے تمام ملے والوں کو شاید کسی کے گھر کے باہر تک دھپنے کے تمام آداب کا سخت لحاظ ہوتا ہوگا اور ایمان شاید مجھے بھی انہی مہذب لوگوں میں سے کوئی ایک سمجھ رہی تھی جو خشک دے کر دس قدم دور چا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اندر سے گرا کوئی نسوانی آواز سنائی دے تو باقاعدہ منہ ہی پچیر لیتے ہیں تاکہ بے پردگی نہ ہو۔ لیکن بھلا مجھ جیسے ہائل کو ان رداہی آداب کا کیا پتہ تھا۔ نہیں نے تو اس طرح سے کسی کے دروازے پر خشک بھی زندگی میں پہلی بار دی تھی۔ میرے تو تمام دوستوں، ارشد داروں اور جاننے والوں کے اُدھے اُدھے نچے نچے شامکانات تھے۔ جن کے گلوں پر بیٹھے دربان ہارن بجنے سے پہلے ہی گینت کھول دیتے تھے۔ اور میری سپرد رُس کارڈن سے اندر داخل ہو جاتی تھی۔

شاید ایمان یہی سمجھی کہ نہیں مولوی صاحب کا کوئی ایسا ہی تہذیب یافتہ مہمان ہوں جو دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد نسوانی آواز سن کر دروازے سے اٹنی دور جا کھڑا ہوا ہے کہ اس کی آواز بھی اندر اس تک ٹھیک نہیں پہنچ رہی تھی۔ اور شاید اسی لیے اس نے دروازے کے قریب کھنچ کر دروازے کو تھوڑا سا کھول کر پوچھنے کے لیے ایک جھری سی بنائی۔ میں گم سم سا ابھی تک دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ سب سے پہلے مجھے اس کی نازک اور خرد طبی الظفیاں دروازے کے سرے پر فطرۂ انیس اور پھر ایمان نے دوپٹے کا کلاب اوڑھے ہلکا سا دروازہ کھولا۔ اس کے دہم و گمان میں بھی نہیں ہوا کہ کوئی دروازے کے سامنے پاس ہی کھڑا ہوگا۔ نہیں نے گھبرا کر فطرۂ خضائی اور میری اور اس کی نظر ایک جھلکے کے لیے ٹکرائی۔ صرف ایک لمحے کے لیے اس کی ہر تکی جھری آکھوں میں وہی شدید حیرت لہرائی جو بس اس کی آنکھوں کا غاصد تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ ہٹا کچھ کہے تیزی سے دہاں پلٹ گئی۔ وہ اس قدر گھبرا گئی تھی کہ اس نے دروازہ بھی ٹھیک سے بند نہیں کیا تھا۔ نہیں بھی ابھی تک اس کی نظریں جھلکی سے جیسے آنکھیں چند صیا جانے کے بعد ٹھیک ہونے کا ایتھار ہی کرتا رہ گیا۔ کچھ دیر میں حیا دروازے پر مصدور ہوئی۔ پہلے اس نے کھلا دروازہ ٹھیک طرح سے بند کیا اور پھر دروازے کی تھوڑی سی کھلی جھری سے ہی اس نے مجھے سلام کیا۔ نہیں نے سلام کے جواب کے بعد اس سے کہا کہ نہیں مولوی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ حیا نے مجھے بتایا کہ ان کی طبیعت کچھ اچھی نہیں ہے اس لیے آج ان سے ملاقات ممکن نہیں ہوگی۔

”دیکھیں۔۔۔ میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔ نہیں ان کا زیادہ وقت نہیں ملے گا۔ بس چند لمحوں کے لیے۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔“

جواب میں حیا قریب ہی رہی لیکن ایمان جوں جوں جانے لگا کہ دروازے پر حیا کے ساتھ آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آواز ابھری۔

”دیکھیں آپ خدا کے لیے یہاں سے چلے جائیں۔۔۔۔۔ لہذا جان کی حالت بڑی مشکل سے کچھ سنبھلی ہے۔ وہ آپ کو یہاں دیکھیں گے تو۔۔۔۔۔ یہ میری آپ سے التجا ہے۔۔۔۔۔ آپ یہاں دوبارہ نہ آئیے گا۔“

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے دل کے صحنِ نق میں کوئی بڑا سا ٹھرا ٹھوپ دیا ہو۔ کسی نے ہماری چہرے سے اُسے چھل دیا ہو۔ لیکن اس

میں ان بے چاریوں کا بھی بھلا کیا تصور تھا؟۔۔۔ اپنے شریف باپ کی صحت کے لیے کوئی بھی بیٹی کچھ ایسی ہی ترکیب جو بڑ کرتی۔ چہرے تو مجھ سے جیسے کچھ بولای ہی نہیں گیا۔ پھر میں نے دوبارہ اپنی ہمت مجتمع کی۔

”دیکھیں۔۔۔ نہیں جانتا ہوں کہ ان کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ لیکن میرا یقین کیجئے۔ جو کچھ بھی ہوا وہ میرے دہم و گمان میں بھی نہیں تھا، ورنہ میں کبھی اپنے گھر والوں کے سامنے اس بات کا ذکر بھی نہ کرتا۔ جو کچھ بھی ہوا میری وجہ سے ہوا۔ تو ازالہ بھی مجھے ہی کرنا ہوگا۔ مجھ سے ان سے معافی مانگنے کا موقع مت چھینئے۔۔۔ نہیں آپ کی منت کرتا ہوں۔“

ایمان کی آواز فضا میں پھر سے گونجتی۔

”اب ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وقت خود ہی اپنے آپ ان کے زخم بھر دے گا۔ لیکن آپ یوں بار بار اگر ان کے سامنے آتے رہیں گے تو شاید وہ اس بات کو کبھی بھلا نہ پائیں۔ انہیں آپ سے اب کوئی گلہ نہیں ہے۔ آپ بھی اس بات کو بھول جائیں، جو جو اسو ہوا، اب کبیر پیٹے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

ایمان کی دلیل اپنی جگہ درست تھی، لیکن میرے لیے یہ تب درست ہوتی کہ اگر میرا مقصد آخری بار مولوی صاحب سے معافی مانگ کر واپس چلے جانے کا ہی ہوتا۔ اس صورت میں میں نہیں تو سالوں کا انتظار کر سکتا تھا کہ جب مولوی صاحب کے دل کے داغ پلکے پڑ جائیں گے تو سامنے آ کر معافی مانگ لوں گا۔

پر میرا مقصد تو اس سے کہیں بڑھ کر تھا۔ مجھے ان کا اعتماد اور پھر ان کے گھر میں چھپا وہ گدڑی کا اصل بیٹنا تھا، جس کی ایک فطر نے میری دنیا ہی پلٹ کر رکھ دی تھی۔ وہ دونوں دروازے کی اس طرف قونچ کر بیٹھ کر میرے جانے کا انتظار کر رہی تھیں اور میں اس طرف کھڑا اپنے ذہن میں کوئی نئی تاویل گھڑتے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اگر میں آج اس در سے چلت گیا تو شاید وہ بارہ کبھی یہاں تک نہ پہنچے پاؤں۔ میں نے آخری بار دست جمع کر کے جیسے ہی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ اندر برآمدے کی طرف سے مولوی صاحب کی آواز ابھری۔

”کون ہے بھئی دروازے پر وہاں۔۔۔؟“

اندرا ایک طویل سی خاموشی طاری ہو گئی۔ اسے جس ایک اور بات عمل پذیر ہوئی۔ عبداللہ گلی کے ٹکڑے سے شیعہ گھماتا گلی میں داخل ہوا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ کچھ ٹھک سا گیا۔ پھر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔

”آپ۔۔۔ یہاں۔“

”جی۔۔۔ نہیں مولوی صاحب سے ملنے کے لیے آیا تھا۔“

عبداللہ نے کچھ کاٹل کیا۔

”شاید ان سے آپ کا ملنا اس وقت کچھ بھرتہ ہو۔“

”آپ ان سے اندر جا کر میرا تذکرہ تو کریں۔ اگر انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا تو نہیں واپس چلا جاؤں گا۔“

عبداللہ چند لمبے کچھ سوچتا رہا۔ پھر سہلا کر اندر چلا گیا۔ یہ چند لمبے مجھ پر کیا قیامت کی صورت گز رہے۔۔۔۔۔ یہ بس میرا دل ہی چاہتا ہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں پچاسی کا کوئی قیدی ہوں اور مختلف پکڑا دوسری طرف کے متحول کے دروازے کے فیصلے کا انتظار کر رہا ہوں کہ آیا مجھے معاف کر دیا جائے گا یا پھر لیور کھینچ کر پچاسی دے دی جائے گی۔

صدیوں کے انتظار کے بعد دروازہ کھٹکھٹا اور عبداللہ برآمد ہوا۔ منیس نے امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ دروازے سے ایک طرف ہٹ کر بولا۔

”آئیے۔۔۔۔۔ اندر آ جائیے۔“

میری زکی ہوئی سانس پھر سے جیسے بحال ہو گئی۔ میری جان میں جان سی آگئی اور منیس عبداللہ کے پیچھے سر جھکائے پھر سے اس گھر میں داخل ہو گیا جہاں وہ رہتی تھی۔ ہم گمن سے ہوتے ہوئے اسی بیشک کی طرف بڑھ گئے جو ککڑی کی جالیوں سے پار برآمدے سے ملتی تھی۔ عبداللہ مجھے ہٹا کر اندر چلا گیا۔ چند لمبوں کے لیے ایک ٹانا سا طاری رہا۔ کوئی آواز، کوئی آہٹ نہ تھی۔ منیس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ سب کچھ ویسے ہی پڑا تھا۔ ہر ترتیب ویسے ہی تھی جیسی میرے یہاں پہلی آہ کے وقت تھی، لیکن تب کے اور اس وقت کے میرے استقبال میں کس قدر فرق تھا۔ وقت کی بازی ایسے اچھوں کو پلٹ کر رکھ دیتی ہے۔ کچھ دیر میں دروازے پر مولوی صاحب کے کھانسنے کی ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ منیس جلدی سے متنبہ کر بیٹھا گیا۔

مولوی صاحب چھتری کے سہارے کھینچتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس وقت وہ شکل سے برسوں کے بیمار معلوم ہو رہے تھے۔ منیس ان کے استقبال کے لیے احتیاطاً کھڑا ہو گیا۔ وہ آ کر کچھ چاٹ پائے اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔ میرے سلام کا انہوں نے دھیرے سے جواب دیا۔ کچھ دیر ماحول پر جمبیر سے خاموشی طاری رہی۔ میرے تو سارے لفظ جیسے پہلے ہی کھو گئے تھے، خود مولوی صاحب بھی گم سم سے تھے، پھر منیس نے ہی خاموشی توڑی۔

”کیسی طبیعت ہے اب آپ کی۔“

”بھلا ہوں اب۔۔۔۔۔ شکر ہے مالک کا۔“

”کیا آج منیس آپ سے معافی کی امید کر سکتا ہوں۔“

”جو ہیئت چکا اس کا بار بار ذکر کیوں کرتے ہو؟“ معاف کرنے والا میں کون ہوتا ہوں۔ معافی دینے والی صرف اس کی ذات ہے۔ میں سب کچھ بھلا چکا ہوں۔ تم بھی بھول جاؤ میاں۔ یہ بڑے لوگوں کے یاد رکھنے کی باتیں نہیں ہیں۔ ہم چھوٹے لوگوں کو ہمارے حال پر چھوڑ دو۔“

ان کا لہجہ آخر میں خاصا سخت ہو گیا تھا۔ یہ بھی انہی کا ظرف تھا کہ وہ میرے وجود کو اس وقت خاموشی سے اپنے ہی گھر میں برداشت کر رہے تھے، کوئی اور ہوتا تو شاید مجھ سے دھکے دے کر دروازے سے ہی واپس لوٹا دیتا۔

”جو کچھ میرے گھر والوں نے آپ سے کیا وہ ان کی کم ظرفی اور ناقابل عطائی گناہ ہے۔ لیکن آپ سب لوگوں سے خفا کیوں ہیں؟“

مولوی صاحب کے لہجے میں مزید تنگی ابھر آئی۔

”جائے دو میاں۔۔۔ یہ سب کھیل تھا شاہے بڑے لوگوں کا۔۔۔ اور تم جیسے امیر زادوں کے لیے روز کا کھیل۔ پر ہم سفید پوشوں کی عمر بھر کی کمائی چند بھرم ہی تو ہوتے ہیں۔ تم لوگ ہم جیسوں کے پاس ان کا وہ بھرم بھی باقی نہیں چھوڑنا چاہیے۔“

”کیا میرا سب سے بڑا قصور آپ کی نظر میں بس یہی ہے کہ میں ایک امیر زادہ ہوں۔۔۔ امیر گھرانے میں پیدا ہوا ہوں۔ کیا کسی کا امیر ہونا اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کی نہت پر کوئی ہمیشہ کے لیے اپنا اعتبار ہی کھو دے۔ تو پھر مجھے بتائیے کہ اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے مجھے کس امتحان کس آزمائش سے گزرنا پڑے گا۔ میں آپ کا اعتبار پانے کے لیے آگ کے کسی بھی دریا سے گزرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔۔۔ اور پھر آپ میری جس امارت سے تھا ہیں وہ تو خود میری اپنی بھی نہیں ہے۔ دوسروں کی عطا کردہ ہے۔ آپ نے تو خود کہا تھا اس دن کہ میری اپنی کوئی شناخت نہیں ہے۔ پھر دوسروں کی وی ہوئی اس شناخت کی سزا مجھے کیوں دے رہے ہیں۔“

میں کچھ جذباتی ہو گیا تھا اور اپنی روش جانے کیا کچھ بول گیا۔ مولوی صاحب کچھ دیر تک سر جھکا کر بیٹھے رہے۔ جیسے میری باتوں پر غور کر رہے ہوں۔ پھر انہوں نے سر اٹھایا۔

”تم اگر واقعی معافی کے طلب گار ہو اور چاہتے ہو کہ میرے دل سے تمہارے گمراہیوں کی کبھی ہوئی باتوں کا بوجھ ہٹ جائے تو تمہیں بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ آج کے بعد تمہیں مجھے اس گھر کے راستے کو اس گھر کو اور اس میں بسنے والے سبھی لوگوں کو ان کی عزت اور دھار کی خاطر ہمیشہ کے لیے بھلانا ہوگا۔ میں نے تمہاری بات غلطی سے سن لی ہے اور تمہاری معذرت کو بھی تسلیم کر لیا ہے۔ اب تمہیں بھی یہ ثابت کرنا ہوگا کہ تم واقعی اپنے اپنے اور اپنے گمراہوں کے طرز عمل پر شرمندہ ہو۔ بولو دے سکتے ہو مجھے یہ وعدہ۔۔۔؟ پانا چاہتے ہو اپنا پٹا انا بھرم واپس؟“

مجھے لگا کہ میں اس جواب سا ہو گیا ہوں۔ ضرور شاہ کرنے اس ایک بیٹے میں مولوی صاحب سے بڑے لطفوں میں میری مرضی کا کچھ نہ کچھ تذکرہ ضرور کیا ہوگا۔ تبھی انہیں اپنی پیش بندی کے لیے اتنی لمبی تمہید باندھنے کی ضرورت پیش آنی تھی۔ گویا وہ جانتے تھے کہ وہ میرا مقصد اس معافی سے سوا کچھ نہیں ہے۔۔۔ کچھ اور ہے۔

میں نے اپنی ہمت بھر سے جمع کی۔

”دیکھیں۔۔۔ اس دن آپ نے کہا تھا کہ میری اپنی کوئی شناخت نہیں ہے۔ میں جو بھی ہوں دوسروں کے ٹل بوتے پر دلور اس گھر کی شان و شوکت کی وجہ سے ہوں۔ میں نے اگلے دن ہی وہ گھر چھوڑ دیا تھا۔ اب نہیں یہاں اپنی ایک الگ شناخت کے ساتھ آیا ہوں۔ میرا اس گھر کی دولت اور شان و شوکت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اس وقت ایک معمولی مزدور ہوں۔ چل چاکھا ہوں۔ خود وہ وقت کی روٹی کما سکتا ہوں۔ ہر قسم کی ضمانت دے سکتا ہوں، دلوا سکتا ہوں۔ جو صرف اور صرف میری ذات کے ٹل بوتے پر ہوگی۔ اس میں میری ماضی کی شناخت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔ اور اپنی ان ہی نئی شناخت کے ٹل پر میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔“

مولوی صاحب کی توجہ پر منہ سے کے ٹل نمودار ہوئے لیکن انہوں نے بڑی مشکل سے خود کو قابو میں رکھا۔

”کوئی بھی بات دہرانے سے پہلے اس بات کا خیال ضرور رکھنا کہ میرے کچھ بھرم ابھی باقی ہیں۔ کہیں تمہاری درخواست ان آگئیوں کو

بھی پار و پار نہ کر دے۔ جو تم سوچ رہے ہو۔ وہ ناممکن ہے۔“

میں جب مولوی صاحب کے گھر کے لیے انٹیشن سے چلا تھا تو میں نے ایسا بالکل بھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے آج ہی اس سلسلے میں حتمی بات کرنی پڑے گی۔ لیکن مولوی صاحب کے حتمی انداز سے خود بخود بات کو اس کا حتمی رخ دے دیا تھا۔

کچھ دیر ہم دونوں ہی خاموش رہے۔ پھر میں نے ہی یہ کفر توڑا۔

”میں نے سوچا تھا کہ کسی حتمی بات کے لیے کسی بزرگ کو آپ کی طرف بھیجوں گا۔ میرے گھرانے کے علاوہ بھی کچھ لوگ اور ہیں جو میری اصلاح آپ تک پہنچا سکتے تھے۔ لیکن آپ نے شاید پہلے ہی آخری فیصلہ کر لیا ہے۔ صرف مجھے اتنا بتادیں کہ مجھ میں کیا کمی ہے۔ اپنی دولت اور امیری کی بدنامی کا طوق تو میں پہلے ہی اپنے گلے سے اتار چکا ہوں۔ اس کے علاوہ اور کوئی کمی کوئی خالی ہے تو میں اسے بھی زور کرنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے دھمکانے کی کوئی وجہ تو بتادیں۔“

مولوی صاحب کا مضطرب جواب دے چکا تھا۔ وہ زور سے فیسے میں چلائے اور کھڑے ہو گئے۔

”نہیں۔۔۔۔۔ بہت ہو گیا۔ کیوں ہم لوگوں کو بدنام کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ لوگ کیا کہیں گے؟ مولوی سلیم جس گھرانے میں بچے کو درس دینے جاتے تھے۔ اسی گھرانے میں اپنی بیٹی بیواہ دی۔ تم چاہتے ہو کہ سارا زمانہ ہم پر انگلیاں اٹھائے۔ جو اتنا تمہارے گمراہوں نے مجھ پر اور میری خندیں پر لگایا ہے، اسے ہم اپنے ہاتھوں سے بچ کر دکھائیں۔ نہ میاں نہ۔۔۔۔۔ ہمارے حال پر کچھ تو رحم کرو۔“

”تو کو کیا آپ کو صرف لوگوں کی باتوں کا ڈر ہے۔ اگر میرے گمراہ لے آکر آپ سے بدتمیزی نہ کرتے اور میری خوشی کے لیے بددشت لے کر آ بھی جاتے تو آپ اسے قبول نہ کرتے۔“

”کبھی نہیں۔۔۔۔۔ ہمارا اور تمہارا کوئی میل نہیں ہے۔ تمہاری قربیت کچھ اور ہے۔ تم جن غلو بات کو بھرا اور محبت کا نام دیتے ہو ہمارے ہاں اسے گناہ سمجھا جاتا ہے۔ صرف گناہ، میں پہلے ہی بہت گناہ گار ہوں مجھے مزید گناہ گار مت کرو۔ ہماری بیٹیاں ایسے لادین گھرانوں میں نہیں بچا ہی ہا تمہیں جہاں سالوں سال کسی نے نماز تک نہ پڑھی ہو۔ جس گھر کے نو جوانوں کو پہلے یا بمشکل دوسرے کلمے کے بعد کے کلموں کا علم تک نہ ہو۔ جہاں قرآن کو صرف سجا کر طاق میں رکھنے کی ایک کتاب سمجھا جاتا ہو۔ جہاں عورت مرد بے لجا بانہ، ملنے ہوں۔ تمہاری قربیت بھی تو ایک ایسے ہی گھر کی ہے۔ صرف گھر چھوڑ دینے سے انسان کا ضمیر نہیں بدل جاتا۔ میں اپنے آنے والی نسلوں کو تباہ نہیں کرنا چاہتا۔ میری نماز کا وقت دور ہا ہے۔ مجھے اب اجازت دو۔“

مولوی صاحب فیسے میں میری کوئی بات سننے بغیر ہی کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی عبداللہ اندر آ گیا اس کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی۔ میں نے جانے کا بند کر دیا لیکن اس نے پھر بھی جلدی سے چائے کپ میں انڈیل دی تھی۔ میں نے دو گھونٹ زہر مار کئے۔ عبداللہ مجھے چھوڑنے باہر لگی تک آیا اور جاتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کر کے بولا۔

”بچا جان کی باتوں کا نہ امت مٹا دے گا۔ اس وقت وہ اپنے آپ میں نہیں تھے۔ میں نے ہی آپ کو منع کیا تھا کہ آپ اب ان سے



دو بار نہ ہی ملیں تو بہتر ہوگا۔ بہر حال جو وہ اسے بھول جائے۔ شا کر چچا نے اس دن بتا دیا تھا کہ آپ نے گھر چھوڑ دیا ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ واپس اپنے گھر چلے جائیں۔ ماں باپ کا بڑا مقام ہوتا ہے، ان سے اتنی ناراضگی اچھی نہیں مغرب کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں۔ عبد اللہ مجھے محلے سے باہر چھوڑ کر مسجد کی طرف بڑھ گیا۔

میرے دماغ میں آدھریاں ہی چل رہی تھیں۔ میں تو ٹھیک طرح سے عبد اللہ کو خدا حافظ بھی نہیں کہہ سکا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ میں پیدل ہی کس جانب روانہ ہوں۔ مولوی صاحب کے چھلے میرے کانوں میں گھٹکے ہوئے سیسے کی طرح بہہ بہہ کر داخل ہو رہے تھے۔ کیا واقعی محبت بھی ایک گناہ ہے۔۔۔؟ اگر محبت کرنا گناہ ہے تو پھر یہ کیسا گناہ ہے جو مجھے بے چینی کے بجائے غشی اور سکون دے رہا تھا؟

میں تو سمجھ رہا تھا کہ مولوی صاحب کے انکار کی وجہ صرف طبقاتی فرق ہوگا میری غریبی کا فرق۔۔۔۔ لیکن یہاں تو جنگ مذہب اور محبت کے درمیان تھی۔ مذہب محبت کو دھکا دے رہا تھا۔ میں اس وقت سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اگر میں پورے چھلے یاد کر لیتا اور میں بھی مولوی صاحب جیسا شرعی لباس پہن کر اگر کسی مسجد کے متولی کی حیثیت سے ان کی بنی کار شہر لینے جاتا تو میں کیوں ان کے لیے قابل قبول ہو جاتا۔۔۔۔؟

اگر میں مذہب سے ڈرتا تو اس میں میرا کیا قصور تھا۔ ایمان کے لیے میری محبت تو اسی طرح اپنی جگہ قائم تھی۔ اتنی ہی پاک تھی جتنی کسی مذہب کی شمولیت کے ساتھ ہو سکتی تھی۔ ٹھیک ہے میں اپنی تربیت کی وجہ سے کچھ خاص اچھا مسلمان نہیں تھا۔ لیکن اس بات کا میری محبت سے کیا تعلق تھا۔ مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ میں کب ریلوے اسٹیشن آ پہنچا تھا۔ رات ہو چکی تھی اور آخری میل بھی نکل چکی تھی۔ پینٹ فارم میرے دل کی طرح

دیران پڑا تھا۔ گاؤں کا کینن ابھی تک کھلے ہوئے تھے۔ میں کم سم آ کر ایک خالی بیچ پر بیٹھ گیا میں نہیں جانتا تھا کہ میری مذہب سے ان باتوں کی دوری آج مجھے اور میری محبت کو اس قدر حقیر بنا دی۔ مجھے اپنا آپ بہت چھوٹا لگ رہا تھا۔ مولوی علیم کی باتوں نے مجھ سے پہلے میں مجھ سے میری ذات کا۔۔۔ میری محبت کا غرور جھین لیا تھا۔ آج مجھ سے زیادہ تمہا شخص اس دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔۔۔ کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆☆

## قضہ نصف صدی کا

لاکھوں دلوں کی دھڑکن **محی الدین نواب** کے جاؤ قلم سے ایک خوبصورت ناول "تقسیم ہند" (قیام پاکستان) اور پاکستان کے حالات و واقعات کے تناظر میں لکھی گئی ایک پراثر تحریر۔۔۔ آزادی پاکستان سے شروع ہو کر آج تک کا سفر طے کرتی ہوئی داستان۔۔۔ جہاں حالات اور مسائل ویسے ہی ہیں جیسے نصف صدی پہلے تھے۔ **کتاب گھر** کے ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

## محبت کے تین پہر

میری اس دن کی یونیورسٹی ہال میں کی گئی تقریر نے مجھے خاصا مقبول کر دیا تھا، کہتے ہیں متنازعہ ہونا بھی مقبول ہونے کی ایک بہت بڑی نشانی ہوتا ہے۔ سب میں مقبول زیادہ تھا یا متنازعہ۔۔۔؟ اس کا فیصلہ ہونا ابھی باقی تھا۔

اگلے دن جو میگزینک کی کلاس میں سر آ کرک نے ہم سب کو محبت پر بحث کرنے کی دعوت دی، وہ بیکانے کہا محبت کا معنی کی طرح ہوتی ہے، جب تک ختم نہ ہو جائے، پیٹے جانا چاہیے۔ ہم نے کہا کہ محبت جسم ہے جسے پائے بنایا جس میں مٹ سکتی۔ بنانے کہا محبت وارڈروب میں لٹکے کپڑوں کی طرح ہے۔ روز بدل کر پہننے کو دل کرتا ہے۔ سارہ نے کہا محبت اور کچھ نہیں، بس جسم میں ہارمونز کی تبدیلی کا دوسرا نام ہے۔ اور شہ علی بھی وہ جو غیر مستقل ہوتی ہے۔ ہارمونز جیسے ہی وہ اپنی مستقل جگہ پر واپس آئے نہیں کہ محبت ختم۔

کسی مٹا چلنے پیچھے سے گرد لگائی کہ لیکن جب تک محبت کے ہارمونز واپس اپنی جگہ لینے کے لیے آتے ہیں، جب تک ان دو پریوں کی شادی ہو چکی ہوتی ہے۔ اس بات پر ساری کلاس ہی لٹک لٹک کر ہنس دی۔ پھر سر آ کرک میری طرف متوجہ ہوئے۔

”اور حاتم۔۔۔۔۔ تمہارا محبت کے بارے میں کیا خیال ہے۔“

”سر۔۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ محبت بھی انسان پر کسی دن کے پیروں کی طرح وار دہوتی ہے۔“

”او ر نیلی۔۔۔۔۔؟ کیا آپ کلاس کے سامنے محبت کے ان پیروں کو بیان کرنا پسند کریں گے؟“

”محبت کا پہلا پہر ہمیشہ تجھن، تنگی اور شہید پیاس لے کر آتا ہے۔ یہ دور دور ہوتا ہے جب آپ کا محبوب آپ سے دور ہوتا ہے۔ آپ کے جذبے آپ ہی تک محدود ہوتے ہیں اور ایک طرف محبت کی یہ تڑپ آپ کو ہر لمحہ کانٹوں پر چلنے کا احساس دلاتی ہے۔۔۔۔۔

پھر اٹھارہ ہو جاتا ہے اور خوش قسمتی سے اگر اٹھارہ قبولیت کا شرف بھی پالے تو محبت کا دوسرا پہر شروع ہوتا ہے۔ تب محبت کی اصل شہنشاہی چھانوں کا اور ابدی سکون کا احساس ہوتا ہے، جب تپتی دھوپ میں بھی ٹھنڈک ملتی ہے اور جتنا محرومی محنتان بن جاتا ہے۔ ایسا انگلستان جس کا سائیکس رکا ہوا پانی بھی کسی ٹھنڈے اور صاف پتے جھرنے کی طرح محسوس ہوتا ہے۔“

مجھے ہر بیک کی آواز کہیں زور سے آتی محسوس ہوئی۔ حالانکہ وہ میرے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

”اور محبت کا تیسرا پہر۔۔۔ اس میں کیا ہوتا ہے؟“

”بہت کم خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جو محبت کے ان دو پیروں کو تکمیل کر محبت کے تیسرے دورا خری ہر رنگ پہنچ جاتے ہیں۔ محبت کے تیسرے پہر میں پہلے پہر سے بھی زیادہ شہید تنگی شدید تیز پیاس اور بے چینی ہوتی ہے۔ لیکن یہ تنگی، یہ پیاس پالینے کی پیاس ہوتی ہے۔“

سارہ کے منہ سے حیرت میں نکلا: "ووہو کچھ ضرور بچھڑائی ہوگی۔"

"پالینے کی پیاس۔۔۔؟ یہ کیسی پیاس ہوتی ہے؟"

ہاں۔۔۔ پالینے کی پیاس۔۔۔ جب آپ حیات کا دریا سامنے بہہ رہا ہو تو کون ہوگا جو صرف ایک آدھ گھونٹ پر اکتفا کرے گا

؟۔۔۔ پالینے کی پیاس، جھانکی کی پیاس سے کہیں زیادہ شدید ہوتی ہے۔۔۔ اور اگر یہ پیاس لگ جائے تو ٹخن جھانکی سے زیادہ اذیت ناک بن جاتا ہے۔ لیکن افسوس ہماری محدود زندگی کبھی ہمیں اس دریا سے پوری طرح سیراب نہیں ہونے دیتی۔ ہم ابھی چند گھونٹ ہی حلق سے اُتار پاتے ہیں کہ جانے کا وقت آ جاتا ہے۔"

ساری کلاس پر اک ساٹا سا چھایا ہوا تھا۔ جم کو شاید کلاس کی وہ محنت پسند نہیں آئی۔ وہ میری باتوں کا اثر ذہن کر کے انہی سے طریقہ لے لے کر بھاگ رہا تھا۔

"بہت خوب۔۔۔ اب یہ بھی بتاتے جاؤ کہ محبت کے تیسرے پہرے گزرنے کے بعد انجام کیا ہوتا ہے۔۔۔؟"

میں نے مسکرا کر جم کی طرف دیکھا۔

"انجام وہی ہوتا ہے جو کسی بھی بحر پروردن کا نتیجہ ہو۔ گزرنے کے بعد ہو سکتا ہے۔۔۔ یعنی شام۔۔۔ عین پہروں کے بعد محبت کی

بھی شام ہو جاتی ہے۔۔۔ خاموش۔۔۔ غمیری ہوئی اور سادگی، اک خوبصورت شام۔۔۔ محبت کی شام۔۔۔ تسکین خاموش ہو گیا۔ کلاس نے تالیاں بجا بجا کر اور ڈبیک بٹخ کر آہان سر پر اٹھایا اور ان میں سب سے سرفہرست ریکا تھی۔ سارہ خاموشی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

اس دن کے بعد سے میں نے غمیں کیا کہ میرے اور کلاس کے باقی طلباء کے درمیان جو ایک عجیب سی جھلک تھی وہ ایک دم ہی ختم ہو گئی

تھی۔ اب آتے جاتے گزرنے لڑکیاں مجھے بھی اسی طرح چٹچ چٹا کر پوری گردنوں سے خوش آمدید اور اوداع کہتے تھے جیسے باقی سب آپس میں دُش (Wish) کرتے تھے۔

کامران میری اس کامیابی پر بہت خوش تھا۔ اُس نے تو باقاعدہ پوری ایک شام اس خوشی میں ہی ستائی اور مجھے زبردستی سنٹرل لندن کے

ایک بہت بڑے سینما بھی لے کر گیا جس میں ایک ہی عمارت میں کئی ہال تھے۔ اور ہر حال میں الگ فلم لگی ہوئی تھی۔ کوئی عجیب سی کاؤ بوائے فلم تھی اور

پھر اس پر دوسری مصیبت کامران کی کہ پوری فلم میں مسلسل رواں کنٹری۔ وہ شاید پہلے بھی یہ فلم دس مرتبہ دیکھ چکا تھا لہذا اُسے مکالمے تک نہ دبانے پڑے۔

وہ ہر منظر سے پہلے ہی مجھے اس کا پورا خلاصہ بتا دیتا تھا۔ ٹھگ آ کر جب میں نے اُسے سینما ہال سے نکال دیا تو وہ مسکرائی۔ جب جا کر وہ بمشکل پیپ

ہوا لیکن تب تک فلم ہی قطع ہو چکی تھی۔ وہ بچپن سے ہی ایسا تھا۔ جب اسکول کے دور میں ہم کلاس سے بھاگ کر کونسل کے مشہور رنگین سینما میں سب کا

شو دیکھنے جاتے تھے تب بھی ہال میں گھس گھس کر چنا کہ کامران صاحب پہلے بھی کسی نہ کسی طرح انتقام کر کے یہ ٹارزن یا سندرہا کے کارناموں سے

بھر پور فلم دیکھ چکے ہیں اور آج مجھے اور ہمارے ساتھ بھاگنے والے دوسرے ٹینک کو صرف یاد کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ جب ہم نے اس مسئلے

کا حل یہ نکالا کہ ہم اپنے ساتھ سفید رنگ کی بڑی کپڑے کی سر جنیکل ٹیپ کی ریل لے کر جاتے اور جہاں کامران کی ٹیس ٹیس شروع ہوتی ہم سب فک

اُس کے منہ پر یہ چوڑی شپ کا پورا رول پلینٹ دیتے۔۔۔۔۔

اُس رات بھی ہال سے نکل کر گھر جاتے ہوئے میں اور کامران بچپن کی ان حسین یادوں کو یاد کر کے ہنستے رہے۔ سڑکوں پر سے برف ہٹانے والی مشین نے سڑکوں کے کناروں پر برف کے چھوٹے چھوٹے سڑجرج کر دیے تھے، جن میں سے ہلکا ہلکا سا دھواں اُٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ بھنگی بھنگیلی سڑک پر رات کی وجہ سے اس کا دکھا گایاں بھاپ اُڑاتی گزروں کی تھیں اور فٹ پاتھ پر لیٹ نائمٹ شو سے نکلنے والے جوڑے ایک دوسرے کی بانہوں میں ہاتھیں ڈالے، ایک دوسرے سے چپکے سرگوشیاں کرتے اپنے گھر والوں کو دہانیں جا رہے تھے۔

اسے میں ایک گاڑی نے ہمیں کراں کیا اور پھر آ کے جا کر رک گئی۔۔۔ پھر فوراً ہی پرورش میں جاری طرف پڑھی اور قریب آ کر رک گئی۔۔۔ اندر سے دیکھنے پر لکڑی اور زور سے ہاتھ ہلا کر چلائی۔

”بے میڈی۔۔۔۔۔ کتنا حسین اتفاق ہے، آؤ ہمیں جواں کرلو۔“

دیکھا کے ساتھ گاڑی میں میرے دو اور کلاس فیلو بھی تھے جن میں سے ایک ربیکا کا کزن بھی تھا۔ یہ انکشاف بھی مجھ پر اسی رات ہوا تھا۔ میں نے ربیکا کا شکر یاد کیا کہ ہم آج پیدل ملاقات کے موڑ میں ہیں۔ کامران نے جلدی سے گھر کر مجھے کہنی ماری۔ اس کی لُخت میں کسی بھی خوبصورت لڑکی کی کوئی بھی پیش کش ٹھکرانے کا سوال ہی تک تھا۔ اوپر سے ربیکا کی ضد، دم دونوں کو ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنا ہی پڑا۔ ربیکا کے کزن نے تھوڑی دور جا کر سڑک کے کنارے بنے ایک اوپن ایرر ریسٹورنٹ کے پاس گاڑی روک دی۔ اس ریسٹورنٹ کی کچھلی جانب سے کچھ دور پہنچے دو یائے میز کے جھگڑاتے پائوں کا ٹکس اور سرسراہٹیں صاف سُنی جاسکتی تھیں۔ انہوں نے کافی کا آرڈر دے دیا۔ کامران ربیکا کے کزن اور میرے دوسرے ہم جماعت کو ربیکا سمیت ہاتھ دیکھنے کے گرو اور ہاتھ کی لکیروں کے بارے میں بتانے لگا۔ میں جانتا تھا کہ دو لڑکوں کا ہاتھ وہ اس امید پر دیکھ رہا ہے کہ اس کے بعد آخر کار اُسے ربیکا کا ہاتھ تھامنے کا موقع بھی ملے گا۔ یہ اس کا بہت بُرا طریقہ واردات تھا اور سچ ہے کہ وہ اس طریقے سے بہت مرتبہ کامیاب بھی ہوا تھا۔ دو بیٹیوں نہایت انہماک سے کامران کو اپنے ہاتھ دکھا رہے تھے۔ میں اُلٹ کر سیٹ کے فرش کے آخری حصے میں نصب اوپے کس ڈشنگ کی طرف چلا آیا جس کے پارڈوبک گہرائی تھی اور یہیں سے دو یائے میز پر بنا دوہلیں اور اس کے نیچے سے گزرتے استبراد چھوٹے بکری جہاز اندھیرے میں جھپٹتے جھکڑوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ میں دیر تک دُور پہنچے پانی میں ان جھلملاتی روشنیوں کا ٹکس دیکھتا رہا۔ پھر آہٹ محسوس ہونے پر محاذ آور دیکھو محسوس سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”نہیں جب بھی تم سے ملتی ہوں، مجھے ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں پھر سے ایک نئے انسان سے مل رہی ہوں۔“

”ہر انسان کی بہت سی جہیں ہوتی ہیں۔ پیاز کی طرح، اُسے جتنا چھیلو، اتنی ہی مرتبہ ایک نئی تہہ اُبھرتی ہے۔ اب یہ پھیلنے والے پرخصر ہے کہ وہ دوسرے کی کتنی کھوج کر سکتا ہے۔“

”نہیں۔۔۔ تمہاری کھوج اس عام کھوج سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس دن جب تم کلاس میں محبت کے مختلف پہر بیان کر رہے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ محبت کو جانا ہے اور ایک مجھ پر ہی کیا منحصر ہے اس دن کے بعد ساری کلاس ہی محبت کے ان نئے

پہلوؤں کو کھوجتے میں لگی ہوئی ہے۔ تم نے ہم سب کو محبت کا ایک نیا چہرہ دکھا دیا ہے۔"

"چہرہ بنائیں ہے، بس اس سے پہلے ذرا اوچھل تھا، محبت ایک نظریہ ہی تو ہے اور ہم سب اس نظریے کو اپنی اپنی عینک سے دیکھتے ہیں۔ وہ غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"سنو۔۔۔ کیا تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟"

پھر خود ہی اس نے فوراً اپنے ہی سوال کو بھٹکا دیا۔

"نہیں نہیں۔۔۔ یہ سوال تو تم سے پوچھنا ہی فضول ہے۔ جو انسان محبت کو اتنا زیادہ پہچانتا ہو، وہ خود ضرور اس تجربے سے گزرا ہوگا۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے محبت کو کیسا پایا؟"

"محبت میرے لیے اس رنگ زدہ گلوٹین کی طرح ثابت ہوئی جس کے چپے رکھا سرٹ تو جاتا ہے لیکن پوری طرح دھڑے سے علیحدہ نہیں ہو پاتا۔ جسم بڑھتا رہتا ہے۔ جان دھیرے دھیرے اور نلکتے نلکتے نکلتی ہے۔ خون کے چھینٹے مرتے مرتے بھی آس پاس کی دیواروں کو محبت کی کشائی کے طور پر رنگ جاتے ہیں۔"

ربیکا نے اذیت سے آنکھیں دھڑ سے بند کر لیں۔

"اف۔۔۔ اتنی اذیت ناک محبت۔۔۔ میڈی۔۔۔ پھر تم اب تک زندہ کیسے ہو۔"

"محبت کی تو کلراذیت کا ڈر کیسا مس رہی۔"

میں نے مسکرا کر ربیکا کو اس نام سے پکارا جس سے تمام کلاس اسے پکارتی تھی۔ ربیکا کا کچھ دیر تک مجھے غور سے دیکھتی رہی۔

"میں نے کہا تھا۔۔۔ تمہارا ہر روپ نیا ہے، جانتے ہو میں اپنے سارے بُرائے دوستوں اور سارے کوناراش کر کے تمہارے ساتھ ڈیبک پر کیوں آ بیٹھی تھی۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس لیے کہ جس دن بلیک بورڈ پر وہ بے ہودہ غرے لکھے دیکھے تھے تب میں بہت دیر پہلے سے قسیدے دیکھ رہی تھی۔ تم نے جس اطمینان سے ان کے نتیجے کو قبول کیا اور تمہاری آنکھوں میں جو ایک عزم تھا ایسا عزم صرف ان لوگوں کے چہرے پر دکھتا ہے جو دنیا سے کھرا جانے کی ہمت رکھتے ہوں اور مجھے بچپن سے ہی بہادر اور پُر عزم لوگ اچھے لگتے ہیں۔ تم مجھے پوری کلاس میں سب سے مختلف دکھائی دیے۔ اس لیے میں نے تمہارے ساتھ ہی بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ہرگز رتا دن میرے اس فیصلے کو صحیح ثابت کر رہا ہے۔"

اسنے میں کامران جو بہت دیر سے ربیکا کو میرے پاس کھڑے دیکھ کر ڈر سے بُرے بُرے سے منہ بتا رہا تھا، اس کا صبر جواب دے گیا اور اس نے باقاعدہ آواز میں دے کر امیں بلا شروع کر دیا۔ لیکن تمہارے بیک صریح بھی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن میں اپنی باتوں کا سلسلہ یہیں ختم کرنا چاہتا تھا اور ہم دونوں سمجھ پر پڑی اپنی کافی کو صریح غصہ اہو نے سے پہانے کے لیے اس کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

## محبت اور خدا

اس دن مولوی صاحب کی باتوں سے میرا اندر ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے تو سمجھا تھا کہ اپنی محبت کو پانے کے لیے مجھے جس شناخت کی ضرورت تھی وہ نہیں نے حاصل کر لی ہے لیکن اس دن پتہ چلا کہ مجھ سے تو میری پہچانی شناخت بھی چھن گئی ہے۔

بچہ میں ایک آدمہ ہار شا کر سے پرانی حویلی جا کر مل آتا تھا۔ اسی سے پتہ چلا رہتا تھا کہ گھر میں کیا ہوتا رہتا ہے۔ ان لوگوں نے شاید میری غیر موجودگی سے سمجھوٹ کر لیا تھا۔ بافیوں کو چھٹی چلادی لوگوں کے دل و دماغ سے پیچھے نکالا جائے۔ اتنا ہی بہتر ہوتا ہے ورنہ ان کی بغاوت کے خراشیم دوسروں کے ذہنوں کو بھی متاثر کرنے لگتے ہیں۔ اور یہ بات بھلا کشن صاحب سے بہتر اور کون جان پاسکتا تھا۔ سوانہوں نے گھر میں میرا نام لینے پر بھی پابندی لگا دی تھی۔ کشن صاحب کا خیال تھا کہ میں کامران کے پاس لائنوں جا چکا ہوں۔ کیونکہ ایک مہینہ ہونے کو آتا تھا اور میرا کچھ لپٹ پتہ نہیں تھا گھر والوں کو۔ کوئی کوئی اتنا بڑا شیر بھی نہیں تھا جہاں میں اتنا عرصہ کسی دوست کے گھر ان سے چھپ کر ٹھہر سکا۔۔۔ شاید عباد کو بھی یہی سوچ کر سکرمل مل گیا اور ورنہ مجھے ہر جگہ تلاش تو کر ہی چکا تھا۔ ان میں سے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو چکا کہ میں بھی یہیں اسی شہر کے ریلوے اسٹیشن پر پچھلے چار ہفتوں سے مزدوری کر رہا تھا۔

نگہت سے بھی شا کر کے ہاں ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن میں اس سے کچھ بچہ ہی نہیں پایا۔ جب میں شا کر سے رخصت ہو کر جانے لگا جب اُس نے اسکیل ہاتے دیکھ کر مجھے چیخے سے آواز دی تھی۔ میں ٹھہر گیا۔ نگہت چپ چاپ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اور پھر اپنا کبھی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”یا آپ نے کیا حالت بنائی ہے اپنی بھینا۔ اس محبت نے تو آپ کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ سب میری غلطی ہے۔ بس۔۔۔ نہیں آپ کو اس سے ملانی نہ۔۔۔“ آسروں سے لگی کی آواز نہ دہی گئی۔ میری آنکھیں بھی بھرا آئیں۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو کنٹرول کیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر میں اس وقت اس کے سامنے رو پڑتا تو وہ دھڑکیں مار مار کر روئے لگتی۔ میں نے خود کو قابو پا لیا۔ ہونے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اُسے چھپتے پایا۔

”گئی ایک بات بتاؤں؟“

گئی پُپ ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ ”جی“

”تم آج بھی بچپن کی طرح روئے ہوئے بہت بُری لگتی ہو۔“

چند لمبے تو وہ حیرت سے مجھے دیکھتی رہی اور پھر جب اُسے میری اس کو پُپ کر دینے کی چال سمجھ میں آئی تو روئے روتے ہنس دی۔ گئی نے مجھے بتایا کہ وہ میرے مولوی صاحب سے ملنے کے بعد دو مرتبہ ایمان کے گھر جا چکی ہے۔ مولوی صاحب اب کافی بہتر ہیں۔

تجربہ نے اُسے میرے گھر چھوڑنے اور یوں در بدر بھٹکنے کی تمام دراستان سنا لی تھی۔ نگہت کی باتیں سن کر ایمان تو چپ چپشی حسب معمول اپنے پاؤں کے ناخن سے زمین پر بچھا قالین کر بیٹھتی رہی البتہ حیا سے صبر نہیں ہوا اور وہ رد پڑتی تھی۔ ایمان نے نگہت سے صرف اتنا کہا کہ اگر میں کبھی نگہت سے ملوں تو وہ مجھ سے کہے کہ میں اپنی یہ ضد چھوڑ کر اپنی اپنے گھر چلا جاؤں۔

یہ تھا انہی صدیوں کے بعد اس دلہا کا میرے لیے ایک پیغام صرف یہی چند لفظ۔۔۔ کون جیتا ہے تیری ژلف کے سر ہونے تک۔۔۔۔۔

لیکن یہ لفظ بھی میرے لیے بہت تھے، چلو کسی بہانے ہی سہی۔۔۔ میرا ذکر تو اس کے لبوں پر آیا، یہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ نگہت میرے ہاتھوں کے چھالے منجھو کر دیکھتی رہی اور اس کی آنکھیں بھینکتی رہیں۔ مجھے نگہت کو بتانا پڑا کہ میں ریلوے اسٹیشن پر غلطی کی رہی کا حندہ کرتا ہوں۔ لیکن اس سے یہ وعدہ بھی لیا کہ وہ اس بات کے بارے میں اپنے یا میرے گرو والوں کو نہیں بتائے گی۔ شاکر نے کبھی میرا چہرہ کر کے میرا پتہ لگانے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جب میں مناسب سمجھوں گا خود اسے بتا دوں گا۔

میں نے اپنی جیب سے وہ درود موتی نکالے جناب تک ایمان کی غیر موجودگی میں مجھے اس کے ہونے کا احساس دلاتے رہے تھے۔ وہی درخشاں موتی جو چوہلی کی سٹری میں ایمان سے ملاقات والے دن اس کے جانے کے بعد ملے تھے۔ اب تک مجھے جب کبھی اپنی تنہائی میں سخت تنہاؤ میں، دن بھر کی مشقت کے بعد ٹوٹنے بدن کے ساتھ وینٹک روم کی کسی سخت آرام کرسی پر گر کر گریزے ہوتے، جب کبھی بھی میرا دل بہت ادا ہوتا یا ایمان کی بہت یاد آتی تو میں ان درود موتیوں کو اپنی پلکیں بند کر کے اپنی آنکھوں پر رکھ لیتا تھا، مگر میں ان کی ٹھنڈک میرے بند پٹوں سے ہوتی ہوئی میری زوج کی گہرائیوں تک کو چھو لیتی۔ میرے تصور میں ایمان اتر آئی، انہی چمکی چمکی، گھبرائی ہوئی نظروں کے ساتھ، پھر وہ یونہی میرے سامنے بیٹھی رفتی اوٹیں گھنٹوں اس سے اپنے من کی باتیں کرتا رہتا۔ اور میری ساری رات انہی اپنوں میں گزر جاتی۔

یہ تصور اور خواب بھی کبھی فوت ہوتے ہیں۔ انسان سے اگر شاندار تصورات اور خواب دیکھنے کی صلاحیت چھین لی جائے تو وہ زیادہ عرصہ جی نہیں پائے گا۔ خواہشوں کی گھنٹیں اس کا گھاد بجا کر اُسے مار ڈالے گی۔ ہم اپنی فوے فیصد خواہشات اور آرزوؤں کو اپنے تصورات اور اپنے خوابوں کے ذریعے ہی تو پاتے ہیں۔

نگہت نے حیرت سے ان درود موتیوں کو دیکھا نہیں نے اُسے ان مولی گواہ کی پوری کہانی سنا لی اور وہ دونوں موتی نگہت کی آتشلی پر رکھ دیے۔  
”یہ موتی اُسے راہیں دے دیئے۔ اور اُس سے کہتا کہ اگر میری تقدیر میں آجاتا تو ایک دن وہ خود مجھے یہ موتی راہیں لا کر دے گی۔ اب جنگ میری اور زمانے کی نہیں ہے۔۔۔ اب لڑائی تقدیر سے ہے۔۔۔ دیکھیں جیت کس کی ہوتی ہے۔“

میں نگہت کو پلکی آنکھوں کے ساتھ وہیں کھڑی چھوڑ کر وہاں سے نکل آیا۔ زندگی میں ہم سب پر کبھی مذہبی ایسا وقت ضرور آئے گا کہ جب ہم کسی سے ملنا کسی سے بات کرنا نہیں چاہتے۔ حتیٰ کہ اس وقت ہمیں اپنی اس خاموش تنہائی کی اپنے آپ باتیں کرنا بھی نہیں ہوتا۔ بس ہمیں اک سکوت کی تلاش ہوتی ہے، جی چاہتا ہے ہم کچھ دیر کے لیے زمانے بھر کے سامنے ہوتے ہوئے بھی ان کی آنکھوں سے اوچھل ہو جائیں کوئی ہم سے

کچھ نہ بچ گئے، کوئی بات نہ کرے۔

اس دن گہت سے مل کر آنے کے بعد بھی مجھ پر کچھ ایسی ہی کیفیت طاری تھی شاید جسے کا دل تھا۔ ابھی ابھی کونسا یکپہرہ بس چھوٹی تھی اور اسٹیشن سے بھیر رتہ رتہ چھٹ رہی تھی۔ میں چپ چاپ پاپٹ فارم کے ایک سرے سے شہوت کے گھٹنے سے درشت کے چپے بچے لکڑی کے بیچ پر بیٹھا ہوا اس کے پڑانے تختے پر ویٹرنر ریلوے کے کھڑے ہوئے اتفاقاً کونور سے دیکھ رہا تھا، اور سوچ رہا تھا کہ ہماری اور گرو کی نصب ہوئی کئی چیزوں نے جانے کتنے مہ سال دیکھ رکھے ہوتے ہیں، ہانے کیسے کیسے زمانے ان پر سے دارو ہو کر گر چکے ہوتے ہیں۔ مثلاً اب ہی لکڑی کے بیچ کو ہی لے لیں۔ تقریباً سو سال سے انگریز کے دور سے یہ اب تک یہی نصب تھا، جانے کتنی دھوپیں، ہانے کتنے سائے، جانے کتنی بارشیں اور برف باریاں اور جانے کتنی آندھیاں اسی ہوں گی اس تجرباتی نے۔۔۔۔ اور جب مجھ جیسے کئی اور کم ظرف انسان اس پر بیٹھ کر بڑی بڑی ٹہنیوں بکھارتے ہوں گے تو یہ سب چیزیں آپس میں اشارے کر کر کے ہم کو دروازائی انسانوں کا کتنا مذاق اڑاتی ہوں گی۔ کچ ہے انسان کی حیثیت ہی کیا ہے ملی بھی تو خیر نہیں اُسے اپنی۔۔۔ پھر یہ سمجھنا کس بات کا۔۔۔

میں انہی خیالات کی پلٹار لیے جیٹا جانے کیا کیا سوچ رہا تھا کہ پاپٹ کسی کے کلکار نے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پاپٹ کر دیکھا تو لیکس نو رانی سے چہرے والے بزرگ جو شاید سامنے لگے لٹل سے مضمر کے آئے تھے، کھڑے مجھے غور سے دیکھ رہے تھے میرے متوجہ ہونے پر مسکرائے۔

”معاف کرنا میاں۔۔۔۔ تم شاید کسی گہری سوچ میں گم تھے، میں نے تمہیں چونکا دیا۔“

مجھ تو یہی ہے کہ اس وقت مجھے ان کی یہ دعا غلط ہے حدنگار گزری تھی لیکن بہر حال ان کی عمر کا تھنا سا بھی تھا کہ اپنی تلخی ظاہر نہ کی جائے۔ ہم انسان بھی کبھی کبھی روایات کی زنجیروں سے بندھے رہتے ہیں، اب کچھ سانس بھی اپنی مرضی کی مل نہیں پاتیں۔

”جی فرما چپے۔۔۔ کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی۔“

بزرگ مسکرائے۔ ”اے خدمت و خدمت کچھ نہیں میاں۔ جسے کا وقت ہے، سوچا آپ کو یاد دلا دوں کہ نماز کا وقت ہونے لگا والا ہے، وہو سکتا ہے آپ نے کچھ چاری کرنی ہو۔“

”جی شکریہ۔ آپ چلے۔۔۔ میں بھی کچھ دیر میں حاضر ہو جاؤں گا، مسجد اس طرف ہے۔“

میں نے جان چھڑائی جاتی، لیکن وہ بزرگ بھی حلق کا نیاں ہی لٹکے۔۔۔۔

”میاں مسجد کا راستہ یوں نہیں دکھاتے، مسافر کو مسجد کے دروازے تک چھوڑ کر آنا چاہیے۔“

مجھے فسوس تو بہت آئی لیکن میں پھر مضبوط کر گیا۔

”الٹوس۔۔۔ میں آپ کے ساتھ ضرور چلا لیکن اس وقت میں اپنی کچھ الجھنوں میں پھنسا بیٹھا کچھ سوچ رہا ہوں۔ آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن آپ کسی اور کے ساتھ چلے جائے نہیں معذرت خواہ ہوں۔“

بزرگ نے خندہ پیشانی سے کہا۔



”کوئی بات نہیں۔۔۔ میں خود ہی چلا جاؤں گا۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں بھی کچھ دیر اس بیچ پر سستا لوں گا۔ ابھی آدمہ گفتہ ہے خطبہ شروع ہونے میں۔“

ایک بار قوتی میں آیا کہ کچھ دنوں کے لیے پورا پلیٹ فارم خالی پڑا ہے۔ کہیں بھی جا کر سٹانے کا شوق پورا کر لیجے۔۔۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید یہ بھی میری طرح تنہائی کا مارا کوئی انسان ہوگا۔ دو گھنٹہ بیٹھ جائے گا تو میرا کیا جائے گا۔ میں اور میری تنہائی تو صدیوں کے ساتھی ہیں، اور ہمارا ساتھ تو اب تک کا ہے، ہم دونوں بیکر کچی مل لیں گے۔

میں نے ایک طرف ہو کر تھکے پر اس بزرگ کی پیٹنے کی جگہ بنائی۔ وہ اپنے کانٹے پر پڑی چادر سے اپنا ہاتھ منہ پر چھپتے ہوئے آکر بیٹھ گئے۔ ”میرا نام رحمت اللہ ہے، لاہور جا رہا ہوں۔ وچیں کانٹے والے ہوں یہاں پر کچھ پرکس اور کچھ پیشنگ کا خمیر لے رکھا ہے۔ اس لیے دو تین ماہ میں ہفتہ دس دن کے لیے آنا پڑتا ہے۔“

جواب میں انہوں نے میری طرف اس اُمید سے دیکھا کہ اب میں اپنا تجربہ نسب ان کے سامنے بیان کروں، میں نے جھک کر بتایا۔ ”میرا نام حماد ہے۔ یہاں پر قچی ہوں۔“

”باشا اللہ۔۔۔ باشا اللہ۔۔۔ محنت میں ہی عظمت ہے، تمہاری تنہائی میں غل ہونے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ دراصل بہت دیر سے تمہیں یہاں بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ تمہاری پیشانی کی اس خاص چمک نے تم سے محالہ ہونے پر مجبور کر دیا۔“

”جیسے آپ میری پیشانی کی خاص چمک سمجھ رہے ہیں، وہ میرے بھٹوں کی سیاہی ہے۔ اور کالک اور سیاہی جب حد سے زیادہ ہو جائے تو اس میں بھی ایک خاص چمک پیدا ہوتی ہے۔“

بزرگ حیرت سے میری طرف دیکھتے رہے۔

”بھان اللہ۔۔۔ میاں۔۔۔ کیا خوب بات کہی تم نے۔۔۔ سیاہی کی چمک۔۔۔ وہ۔۔۔ بہت خوب۔۔۔ پڑھے لکھے لگتے ہو۔“

جی کچھ سٹے سیاہ کیے ہیں۔ لیکن سب رائیگاں چلا گیا۔“

”علم کسی رائیگاں نہیں جاتا، نماز وغیرہ سے کچھ خاص شخص نہیں رکھتے شاید۔“

”میں اسے دل کا معاملہ سمجھتا ہوں، دل چاہے تو پڑھ لیتا ہوں کبھی کبھی۔۔۔ ورنہ نہیں۔“

”حق تو یہ ہے میاں کہ میں بھی بس حاضری لگانے کے لیے ہی پڑھتا ہوں۔ دل تو کہیں اور ہی اٹکا ہوتا ہے۔ کسی اور جوڑ توڑ میں،

وسندہ کی کسی کبھی کوں لکھانے میں۔“

”تو پھر ایسی حاضری کا فائدہ کیا۔۔۔ اس سے تو میری غیر حاضری ہی بھلی۔“

”میاں حاضری تو لگانے ہی پڑتی ہے۔ ورنہ اگلے امتحان میں بیٹھنے ہی نہیں دیا جائے گا۔ جانتے ہوتا، حاضری کی بنیاد پر ہی امتحانی داخلہ ملتا ہے۔ کئی کئی حاضری پوری ہوگی تو امتحان کے لیے بلائے گا۔ ورنہ امتحان لینے ہی لٹل کر دیا جائے گا۔ ایک دفعہ اس ٹوٹی پھوٹی حاضری کی بنیاد پر اگلے جہاں کے امتحان تک تو پہنچ جائیں۔ پھر وہاں محنت کے آگے رو دو کہ کسی نہ کسی طرح صرف پاس ہونے تک کے 33 نمبر لینے کی کوشش

کروں گا۔ ایک آدھ مضمون میں پہلی یا کمپارٹ آ بھی گئی تو کیا ہے۔ کس کس کرکل ہی جائیں گے آخراً اس لیے حاضری ضروری ہے۔ بنیادی شرط ہے، یہی حاضری ہو یا پہلی، دل کی گہرائی اور غلوں دل سے ہو یا دکھاوے اور منافقت بھری۔ لیکن یہی حاضری آگے پیش ہونے کا کام دے گی۔ حاضری پوری ہی نہ ہوتی تو فیاضی کا موقعہ یہ نہیں ملے گا اور غشی اور سونہلی کا موقع ہی نہ ملتا تو ہم تو مٹنے کا کام نہ سنا۔“

میں ہجرت سے رحمت اللہ صاحب کی تقریر سن رہا ہوں۔ بہت بڑی بات انہوں نے بہت کھل زبان میں کہہ دی تھی۔ واقعی تالائق سے تالائق تر، کوڑھ مغر سے کوڑھ مغر ترین اور شر سے شر تر طالب علم کو بھی امتحان میں بیٹھنے کا موقع مل ہی جاتا تھا بشرطیکہ اس کی حاضریاں امتحانی معیار کے مطابق پوری ہوں۔ اب پاس نکل ہونا اس کی قسمت اور اعمال پر تھا۔ جو سکتا ہے کہ پرے چپک کرنے والا رحم کما کر 33 نمبر دے دیے۔ لیکن جس طالب علم کی حاضری ہی پوری نہ ہو اسے تو امتحان لیے بنیادی طور پر کیا جاتا ہے۔

”فہمک کہا آپ نے۔ اس حساب سے تو حاضری بڑی ضروری ہوئی۔“ رحمت اللہ صاحب مسکرائے۔

”نماز کی حاضری کچھ آسان کام نہیں ہے۔ بڑا کٹھن ہوتا ہے پانچ وقت کی سیدہ زانہ حاضری کا نئی۔ شروع شروع میں تو میں بڑا جھک ہوتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح خود کو ہائے نماز پر کھڑا کر لیتا لیکن یہاں جیت، باغدی اور وہیں ایک تیزی اور دنیا بھر کی جلدی کی ایک ایسی بے چینی سر پر سوار ہو جاتی تھی کہ جسے اگر وہ نماز پڑھنے میں نہیں لے ڈرا بھر مزید دیر لگا دی تو جانے کتنے لاکھ کا کھانا ہو جائے گا۔ اسی تیزی میں جلد از جلد الٹی سیدھی رکعتیں پڑھ کر بس سلام پھیرنے کی کرکرت تھا۔ جانے پوری پڑھتا بھی تھا یا آدھی کا مکمل پڑھ کر ہی ختم کر دیتا تھا۔ اور ادھر سلام پھیرا اور ادھر وہ تیزی وہ بے چینی فخر۔ لگتا تھا جیسے خون میں جو اہل آر با تھا وہ بس اس نماز کی وجہ سے ہی تھا۔ پھر چاہے گھنٹوں وہیں بیٹھا رہوں، کچھ نہ کروں تب بھی ویسی جلدی اور بے چینی پینہ نہ ہوتی وہاں البتہ جیسے ہی دوسری نماز کے لیے کھڑا ہوا وہیں وہ دھماکے بھاگ شروع۔

اور اس چند لمبے کی جلت اور بے چینی بھری نماز کے دوران بھی ہر لمحہ کسی عورت، کسی دھندے کسی کمائی کا سودا ہی ذہن میں سلہا رہتا۔ کبھی کبھی تو دل اس زور سے دھڑکتا تھا جیسے گرتیں نے فوراً اہل میں نماز پڑھ کر سلام نہ پھیرا تو یہ کم بخت دل سینے سے ہی باہر نکل آ کرے گا۔“

میں ہجرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ عام طور پر لوگ ایسی باتیں ہی کہتے ہیں کہ ان کے دل ہب پر لوگ شک نہ کرنے لگیں۔ لیکن یہ بزرگ تو بڑے مزے سے اپنی جھوٹی گئی نمازوں کی داستان سناتے جا رہے تھے۔

”تمہیں ایک مزے کی بات بتاؤں۔۔۔ جس مسجد میں میں نماز پڑھنے جاتا تھا اس کے سامنے کی کڑی کی باہر بازار کی طرف کھلتی تھی۔ میں اگر خوش قسمتی سے کبھی پہلی صف تک پہنچ بھی جاتا تو پوری نماز کے دوران میری نظریں باہر بازار کی گلی میں بھٹکتی رہتی تھیں۔ دراصل شروع شروع میں نماز میرے لیے بڑا آسٹا دینے والا کام تھا۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے ”بورنگ“ (Boring) ”ہاں۔۔۔ بڑا بورنگ کام تھا۔ اس لیے میری نظر خود بخود کڑی سے باہر اٹھ جاتی تھی۔ اور جی تاؤں رمضان میں کبھی دوست سمجھتے کھاچ کر تروانے کے لیے لے جاتے تو جب یہ کڑیاں میرے بڑے کام آتی تھیں تروانے کی لمبی لمبی رکعتیں بڑے مزے سے گزر جاتیں۔“

رحمت اللہ صاحب یہ بتاتے ہوئے فہم پڑے۔ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی تھی نے دلچسپی سے ان کی طرف دیکھا۔

”اور اب۔۔۔؟۔۔۔ اب کیا محسوس ہوتا ہے۔“

”اب لگتا ہے کہ رفتہ رفتہ کچھ صبر آؤ آ جا رہا ہے۔ لیکن ہم کیا اور کیا ہماری نمازیں میاں۔۔۔۔۔ سب رکھا دیا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ  
”آہ کو چاہیے اک عرثر ہونے تک۔۔۔۔۔“

”مذہب میں کاملیت کروڑوں میں سے کسی ایک کو نصیب ہوتی ہے۔ ہم جیسے تو بوجہی زلزلہ کرکے اپنی نیت کے طفیل ہی یہ دریا پار کر لیتے ہیں۔ پھر کسی کی دی ہوئی کوئی دعا کام آ جاتی ہے۔ منزل نہ ہی، کوئی سنگ میل ہی سہی۔۔۔۔۔ منزل سب کے نصیب میں کہاں ہوتی ہے، ہم تو ذہن میں پہلا پڑاؤ پہلا سنگ میل رکھ کر ہی چلتے ہیں۔ جانے اس تک بھی اس مختصر زندگی میں پہنچ پائیں گے یا نہیں۔ اپنا فرض تو بس قدم بڑھانا ہی ہے۔“  
”میں رحمت اللہ صاحب کی باتیں بڑے غور لیکن دلچسپی کے ساتھ سن رہا تھا۔ میں آج تک مذہب کو بہت مشکل اور بڑا سنگین کام سمجھتا تھا۔ لیکن رحمت اللہ کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ یہ تو بہت سہل ہے۔ بس نیت کا مکمل ہے۔

اسنے میں جتنے کی اذان شروع ہوگئی۔ میں بے اختیار ہی میں ہی رحمت اللہ صاحب کے ساتھ باتیں کرتا ہوا مسجد تک جا پہنچا۔ اب یوں گیٹ سے چلتا مجھے کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ رحمت اللہ نے وہ بارہ سال تک مجھ سے نرا زپڑے کا ذکر تک بھی نہیں کیا تھا۔ میں بھی دوسرے نمازیوں کے ساتھ وضو کر کے نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔

شاید اس دن وہ میری زندگی کا پہلا عہد تھا جو نہیں نے ہمارے خوف اور کسی جلدی، ہمارے بے زاری اور ہمارے کسی مطلب اور لاچ کے ادا کیا تھا۔ اس دن مجھے پہلی بار مذہب سے ڈر نہیں لگا۔ کوئی خوف محسوس نہیں ہوا۔ اس لیے میرے اس پہلے عہدے میں بڑا اطمینان تھا خاصیت تھی اور سکون تھا۔

میں نماز پڑھ کر اسٹیشن سے ملحق مسجد کے باہر ہی کھڑا رحمت اللہ صاحب کا انتظار کرتا رہا۔ جلد ہی وہ بھی نکل آئے اور ہم دونوں واپس چلیٹ فارم پر آ گئے۔ وہاں بتیکر پڑاؤ صاف اور ہی تھی کرا اور جانے والی گاڑی کسی فنی فراہمی کی وجہ سے تین گھنٹے دیر سے جانے لگی۔ رحمت اللہ صاحب مسکرائے۔  
”کو بھی۔۔۔۔۔ شاید قدرت کو میرا تمھارا ساتھ کچھ دیر کے لیے مزید منظور تھا۔ تم اگر نہ ہاتھوں میں میں تمھارے پسندیدہ شیخ پر اپنی گاڑی کا انتظار کروں۔“

میں شرمندہ سا ہو گیا، شاید انہیں نماز سے پہلے والا میرا لہجہ اور رویہ یاد تھا۔ میں نے انا سے اپنے پچھلے سلوک کی معذرت چاہی۔ وہ مسکرایے۔  
”ارے میاں معذرت کیسی۔۔۔۔۔ ہر بندے کا اپنی گنہگار پر نکل اختیار اور مکمل حق ہوتا ہے۔ معذرت تو مجھے بخش کرنی چاہیے۔۔۔۔۔ بہر حال ہمیں جیسا ہو یا نہ ہو۔ پر مجھے تو شدید بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ پیٹ پوجا ہونی چاہیے۔“

انہوں نے اپنے سامان میں سے ایک ٹوہکا کو خوبصورت سا چھوٹا ٹھنڈا کیر پیر ٹھکانا اور ہیرے لاکھ منع کرنے کے باوجود انہوں نے مجھے بھی کھانے میں شریک رکھا۔ سادہ سی آلو ساگ کی سبزی، تھوڑا سا اچار اور چند پراٹھے۔ انہوں نے بڑے شوق سے کھانا کھایا، پانی پیا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ مجھے ہر شے سے نوالے لٹکتے دیکھ کر انہوں نے مجھے نصیحت کی۔

”دیکھو تم میاں۔۔۔۔۔ چاہے جتنے بھی مصروف کیوں نہ ہو، کھانا کھانے کے لیے وقت ضرور نکالا کرو۔ ہم اپنی زندگی کی ساری جدوجہد کس لیے کرتے ہیں۔ اسی دو وقت کی روٹی کے لیے یا۔۔۔۔۔ یہ روٹی کا پکھڑا نہ دینا تو کبھی ہر وقت مسجدوں میں سمجھ کے میں ہی نہ پڑے رہے۔ لیکن

میں رزق تلاش کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور چاہے چند نوالے ہی کھاؤ لیکن عبادت کی طرح خلوص سے کھاؤ اور اس حقیقت سے کماؤ کہ اس کے بعد تم خدا کا شکر ادا کر سکو گے۔ بلکہ صرف کھانے پر ہی کیا منحصر ہے۔ زندگی میں اس کی دی ہوئی ہر نعمت کو اس طرح نہ کہ یہ اس مالک کا احسان ہے اور اس نعمت سے اس نعمت کا فائدہ اٹھاؤ کہ یہ اس مالک کے شکر ادا کرنے کا ایک اور بہانہ ہے جو اس نے تمہیں فراہم کیا ہے۔“

مجھے اس نورانی چہرے والے پوڑھے کی باتیں سن کر حیرت ہو رہی تھی۔ میں نے تو زندگی کبھی اس زاویے سے نہیں گزاری تھی۔ میں اپنے استعمال کی ہر چیز کھانے پینے، سواری، آرام اور قیاش کی چیزوں اور لمحات کو اپنا وراثی منت کا حق سمجھا تھا۔ اپنے بڑوں کی دین سمجھتا تھا۔ بڑوں کی کمائی سمجھتا تھا۔ نعمت اور شکر کا تصور میرے دل میں نہیں دوڑا تھا۔

میں نے کچھ دے سے مجھے میں رحمت اللہ صاحب سے پوچھا۔

”کیا آپ تبلیغی ہیں۔۔۔؟“

وہ میری بات سن کر زور سے فہم پڑے۔

”غیب۔۔۔ تو تم اتنی دیر سے میری باتوں کو تبلیغ سمجھ رہے ہو۔۔۔۔۔ بڑے بھولے ہو میاں۔۔۔۔۔ میں کہاں اور تبلیغ کہاں۔ میں تو ایک وقت کی بھوک بھی برداشت نہیں کر سکتا، تبلیغ کے لیے تو پورا اپنا آپ مارنا پڑتا ہے۔ جب جا کر کہیں آپ کو یہ حق ملتا ہے کہ آپ دوسروں کو کچھ نصیحت کریں، کچھ سکھائیں، کیونکہ کبھی شرط یہ ہے کہ آپ خود وہ کریں جو دوسروں کو کہتے ہیں اور یہ بڑا مشکل کام ہے۔“

اسے میں رحمت اللہ صاحب کی گاڑی کا وقت ہو چلا تھا۔ فرین پلٹ فارم پر لگ چکی تھی اور اب اس کا سائزن بھی وقفے وقفے سے بجنا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے ان کا سامان سمیٹنے میں ان کی مدد کی اور ان کے لاکھ متع کرنے کے باوجود ان کا سوٹ کپس اٹھا کر انہیں ڈبے تک چھوڑنے آیا۔ وہ سیٹ پر بیٹھ گئے جو کھڑکی کے ساتھ ہی تھی تو میں آخر کر پلٹ فارم پر ان کی کھڑکی کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ فرین نے ہلکا سا جھٹکا لیا۔ انہوں نے سر ہار نکال کر میرے ماتھے کا الوداعی بوسہ لیا اور بولے۔

”مجھے لگتا ہے کہ تمہیں کسی چیز کی تلاش ہے۔ وہ طلب اور اس چیز کی شدت کی چاہت تمہاری آنکھوں سے ہر لمحہ چلتی ہے۔ لیکن کہیں نہ کہیں تم یہ سمجھ رہے ہو کہ مذہب تمہارے راستے کی رکاوٹ ہے۔ لیکن یاد رکھو اماں۔۔۔۔۔ مذہب جب تک ہی رکاوٹ لگتا ہے اور اس سے خوف محسوس ہوتا ہے جب تک آپ اس سے دور رہتے ہیں۔ قریب جانے پر مظلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت بے ضرر اور بہت دوست نما کوئی چیز ہے۔ مذہب سے دُور نہ رہنا۔۔۔ اسے اپنا دوست بنا لینا۔۔۔۔۔ جیتے رہو۔۔۔ آ پاور ہو۔“

فرین نے دھیرے دھیرے پلٹ فارم سے کھسکنا شروع کر دیا تھا، میں اس کے ساتھ ساتھ پلٹ فارم کی آخری حد تک پہنچا رہا۔ مدفن رفتہ رفتہ وہ غیب نورانی بزرگ ہاتھ جلاتے جلاتے فرین سمیت میری نظروں سے اوجھل ہوتا گیا۔ جو جاتے جاتے مجھے زندگی کے بہت سے زاویے بس ایک ہی لحاظ سے نظر آ رہے تھے۔

☆☆☆

## ہالوکاسٹ

آخر کی باتوں کی کوشش کے بعد مجھے جوزف سے تنہائی میں اس موضوع پر بات کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ نہیں نے اس سے پوچھا کہ یہ ہالوکاسٹ کا نظریہ کیا ہے۔ جوزف میری بات سننے ہی ایک دم خوف زدہ سا ہو گیا جیسے میں نے کوئی بہت ہی اہموی چیز پوچھ لی ہو۔ دوسرے گوشے میں بیٹھ کر دیکھتا ہوں کہ وہاں شہر کے آس پاس ڈیڑھ دو سو سالوں کے عمارتوں اور کوئی نہیں تھا۔

”اس جگہ ایسی کوئی بات کسی سے پوچھنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ یہ موضوع یہاں پر ممنوعہ ہے۔“

میں نے حیرت سے جوزف کے اس بڑے اصرار اور انداز کی طرف دیکھا۔

”کیوں۔۔۔ ایسی کیا بات ہے اس موضوع میں۔۔۔ اور پھر سارے دن اس نظریے کے حق میں اپنی تقریر کے دوران اس نے زیادہ دلائل بھی تو دیے تھے۔ پھر یہ سب ممنوعہ کیسے ہو گیا۔“

سارے ایک بیرونی لڑکی ہے اور اس کے تمام دلائل ہالوکاسٹ کے حق میں تھے۔ میں اس نظریے کے مخالف دلائل کے بارے میں کبھی نہ ہوں۔ کیونکہ میں جیسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم اس نظریے کی حقیقت جان کر اس پر دوسروں سے بحث ضرور کرو گے جو میں ہرگز نہیں چاہتا۔“

”کیوں۔۔۔ کیا تم بھی اس نظریے کے مخالف ہو۔“

”ہاں۔۔۔ میں کیا ایک دنیا اس مفروضے کی حقیقت سے انکاری ہے۔ لیکن ان یہودیوں کے لیے یہ اس قدر متعذر نظر یہ ہے کہ وہ کسی کا اس کے خلاف بولنا تو دور مچھتا بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ اور ایسی کوئی بھی بات کرنے والوں کی زبان بند کرنا انہیں خوب آتا ہے۔ اسے یا تو پابند سلاسل کر دیا جاتا ہے یا پھر ملک بدر اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو ہیٹلر کے لیے خاموش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ بلکہ اب تو انہوں نے باقاعدہ ایک قانون بنالیا ہے جس کے ذریعے انہوں نے اس موضوع کی مخالفت پر پابندی لگا دی ہے باقاعدہ طور پر۔“

میں نے حیرت سے جوزف کی طرف دیکھا۔

”اس حد یہ دور میں یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کسی کی سوچ، کسی کی زبان پر ہرے لگا دیں۔۔۔؟ اور پھر یہ لوگ تو آزادی اظہار رائے کا اتحاد حاصل کر چکے ہیں۔ یہ آزادی رائے اس وقت کیوں یاد نہیں آتی انہیں جب یہ لوگ ایسا کوئی جبری قانون بنا رہے تھے۔“

جوزف نے جلدی سے اپنے ہونٹوں پر ہانگی رکھ کر مجھے آواز دہمی دیکھنے کا مشورہ دیا۔ ”یہ تمام ڈھنڈورے دوسری قوموں کے خلاف استعمال کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ شاید تم یہ نہیں جانتے کہ تمہاری اس دن ہال میں کی گئی تقریر نے جانے کتنوں کی تینہ آڑا دی ہوگی۔ یہ اس پر بندوبست کے ایک سو تیس سالہ تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ کوئی شخص پر آکر باقاعدہ انہیں سچے انصاف کے تازیانے لگا کر چلا گیا ہے۔ یہ لوگ ایسی جرات کوہمو لیتے نہیں۔۔۔ باقی پسند کرتے ہیں۔“

میں نے حملہ کر لیا۔

”یہ لوگ۔۔۔ یہ لوگ۔۔۔ آخر یہ لوگ ہیں کون۔۔۔؟ اگر ان میں اتنی ہمت ہے تو سامنے آ کر بات کیوں نہیں کرتے۔۔۔ آخر یہ ہالوکاسٹ ہے کیا بلا۔۔۔؟“

جوزف نے ایک لمبی سانس لی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کچھ جانے بغیر یہاں سے نکلنے والا نہیں ہوں۔ وہ دہلی دی ہی آواز میں مجھے بتانے لگا۔

”یہودیوں نے اپنے لوہے ہوئے واسے؟ ہم ہالوکاسٹ کو سب سے زیادہ جرمی سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلے جرمنوں پر 1298ء میں جرمن ہائٹ ریڈ فلیش کی سرکردگی میں جرمی میں موجود ایک سو چھیالیس یہودی بستیوں میں قتل عام کا اہرام لگایا گیا۔ پھر 1336ء میں دوسری یہودی بستیوں کو چننے کے کام پر دیکھ دیا گیا۔ لیکن سب الزاموں سے بڑھ کر الزام یہودی لیڈر ریڈوین گورین نے دوسری جنگ عظیم کے بعد نظر پڑ لیا کہ اس نے دوسری جنگ عظیم کے دوران پچاس لاکھ سے زائد یہودیوں کو گیس چیمبرز میں ڈال کر ختم کروایا تھا۔ کچھ لوگ یہ تعداد 60 لاکھ تک بتاتے ہیں۔ اور یہودی اسی عظیم الشان اموات کے نظریہ کو ہالوکاسٹ کہتے ہیں۔“

میں نے حیرت سے جوزف کی طرف دیکھا۔

”لیکن اتنی بڑی تعداد میں اگر یہودی مارے گئے ہوں گے تو ان کی موت کا کوئی ثبوت بھی تو ہوگا۔ دوسری جنگ عظیم اور ہالوکاسٹ کا دور تو ابھی کل ہی کی بات ہے۔“

”کوئی ثبوت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ثبوت دعوے نے والوں اور اس نظریے کے خلاف جانے والوں کو سزا میں دی جاتی ہیں۔ ابھی پچھلے سال ہی آسٹریا کی ایک عدالت نے تاریخ کے ایک استاد پر دھیسڑ ڈیا اور وہ گتھن سال کی سزائے قید سنائی ہے۔ صرف اس جرم میں کہ اس نے ہالوکاسٹ کے دوران یہودیوں کے قتل عام کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔“

”حیرت ہے لیکن یہودی اس پر دیکھنے کے ذریعے کون سے مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔“

”اپنی قوم اور اپنی نسل کے لیے ایک انگ اور آزاد سلطنت، برطانیہ اور امریکہ نے یہودی رہنماؤں کو دوسری جنگ عظیم کے دوران یقین دلایا تھا کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ایک آزاد یہودی سلطنت قائم کر دی جائے گی اور یہ راست فلسطین کی مقدس سرزمین پر قائم ہوگی۔ روس نے بھی اس معاملے میں یہودیوں کا پورا پورا ساتھ دیا۔“

جوزف نے مجھے رچرڈ ہارڈوڈ (Richard Harward) کی کتاب ”کیا واقعی 60 لاکھ یہودی مارے گئے۔“ فخرچ رائٹر پائل راسی نیر کی کتاب ”یورپی یہودیوں کا ڈراما“ امریکی مصنف ڈیوڈ ہگن کی تصنیف ”مسلط شدہ جنگ“ اور ایسی بہت سی دوسری کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیا۔ میرے لیے واقعی یہ ایک بہت ہی حیرت انگیز بات تھی۔ میں نے اسی دن شہر کی مختلف گتھن لائبریریوں سے یہ تمام کتابیں منگوا لیں کیونکہ شہر کی بڑی لائبریریوں میں ان کتابوں کا نام دکان بھی نہیں تھا۔ جیسے جیسے میں ان کتابوں کو پڑھتا گیا۔ دست سے راست میرے اندر داہوتے چلے گئے۔ پتہ یہ چلا کہ ہالوکاسٹ کا یہ پروپیگنڈا تو پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی شروع کر دیا گیا تھا۔ جرمی سے تمام اتحادی افواج خاک تک تھیں، یہودیوں نے جو اس وقت جرمی میں اسلحہ سازی کی صنعت پر چھائے ہوئے تھے، اتحادی افواج اور امریکہ کا درپردہ ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا اس شرط پر کہ جنگ عظیم دوئم کے

بعد انہیں آزار اور پاست بنانے کی اجازت دے دی جائے۔

جرمن یہودی سازشوں کی وجہ سے دوسری جنگ عظیم بار گئی، ہالوکاسٹ کے واقعات سے یہودیوں نے پورا قاتلہ اٹھایا اور قسطنطنیہ تک ان کی بستیوں کی رسائی میں اتحادی ملکوں نے پوری مدد کی۔ اور رفتہ رفتہ ہالوکاسٹ کے موضوع کو ہی مقدس گائے بنا دیا گیا تاکہ کوئی اس کے بارے میں کچھ نہ بولے اور نہ ہی تحقیق کی نوبت آئے۔ مجھے ان سب کتابوں سے بس ایک ہی حقیقت کا واضح اشارہ ملا کہ۔۔۔ ”یہودیوں کا دوسرا نام ہے۔“  
اب مجھے کسی ایسے موقع کا انتظار تھا جب میں ان یہودیوں کے اس غرور کو توڑ سکوں۔ کامران نے میرے آگے بہت ہاتھ پاؤں جوڑے کہ میں ان چکروں میں نہ پڑوں۔ اسے مجھ سے زیادہ سارہ کی فکر تھی کہ وہ میرے دوست کامران کے بارے میں کیا سوچے گی جب کہ ابھی تک سارہ کامران کے نام اور شکل سے بھی واقف نہیں تھی۔

اور پھر ایک ہی ہفتے کے دوران مجھے دو موقع مل ہی گیا۔ یہ میئرنگ کی کلاس میں سر آڑک نے ہم سب کو مختلف موضوعات پر ٹرم پیپر لکھنے کے لیے کہا موضوع کی کوئی قید نہیں تھی لیکن موضوع پہلے بتانا ضروری تھا کیونکہ اسے طالب علم کے نام کے ساتھ نوٹس بورڈ پر چپکانا ضروری تھا۔ جس دن نوٹس بورڈ پر وہ فہرست لگائی گئی جس کے اندر موضوعات بھی واضح کیے گئے تھے اس دن سب لوگ میرے نام کے سامنے مضمون کی فہرست میں ”ہالوکاسٹ“ کا عنوان دیکھ کر ہی سراپیمہ ہو گئے۔ چند لمحوں میں ہی پوری بیوروکریسی میں سرگوشیوں اور چپ میگزینوں کا ایک ریلا سا سہ پہلہ لگا۔ میں لاہوری کے نکل رہا تھا کہ پریشان رہی کہ کیا اپنے کئے بال بھلائی جانے کہاں سے آ نکلی اور بنا کچھ کہے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی مجھے راہداری کے ایک سنان گوشے کی طرف لے گئی۔

”میڈی۔۔۔ تم اپنے ہوش دھواں میں تو ہو۔۔۔“

”کیوں۔۔۔ میں نے ایسا کیا کام کیا ہے کہ تمہیں یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔“

”تم نے ہالوکاسٹ پر ٹرم پیپر لکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ بیوروکریسی یہودیوں کی ہے اور اس کی تمام انتظامیہ یہودی ہے۔ پلیز میڈی۔۔۔ اپنا یہ فیصلہ واپس لے لو۔۔۔ دیکھو نہیں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“

اُس نے واقعی اپنے گورے گورے سے ہاتھ میرے آگے جوڑ دیے۔ مجھے اس کے اعزاز پر ہنسی آ گئی۔

”کہہ نہیں ہو چکا تم اپنی پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ اگر یہ لوگ دوسری قوموں اور مذاہب کا مذاق اڑاتے ہیں اور انہیں خود سے کم تر سمجھتے ہیں تو انہیں بھی آئینہ دکھانے والا کوئی تو ہونا چاہیے۔“

”اوہ میڈی۔۔۔ تم نہیں جانتے نہیں تمہارے لیے کتنی پریشان ہوں۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو۔۔۔ وہ بولتے بولتے پمپ ہو گئی۔ میں نے چونک کر اس بظاہر لاٹہالی سی لڑکی کو دیکھا۔ اس لمحے اس کے چہرے پر بہت سے رنگ آ کر گزر گئے۔ مجھے لگا کہ وہ کہیں پھر سے محبت کی رات جہنمی پر پہنچا رہی ہے۔۔۔۔“

☆☆☆

## سنگ دل

میں بنیادی طور پر مذہب کو انسان کا بے حدود ذاتی فعل سمجھتا تھا۔ اس دن ترین والے بزرگ رحمت اللہ سے ہوئی ایک ملاقات نے میرے اندر سے مذہب کا بہت سارا خوف نکال دیا تھا۔ مجھے لگنے لگا کہ مذہب کو دوسروں کے ساتھ فکس بھی کیا جاسکتا ہے اور اس پر بحث بھی ہو سکتی ہے اور اس میں کوئی رائی بھی نہیں ہے۔

جانے انہیں کیسے پتہ چل گیا تھا کہ میں اپنی چاہت کے راستے میں اپنے مذہب کو حائل سمجھتا ہوں۔ یہ کیسا عجیب بزرگ تھا جو چل بھر میں میری روح تک کنگال کر اسے جھجھوڑ گیا تھا۔ بہر حال اب مجھے میرا راستہ نظر آنے لگا تھا۔

درمیان میں ایک دفعہ شا کر کی طرف گیا تو پتہ چلا کہ وہ کچنر صاحب کو لے کر اسلام آباد گیا ہوا ہے۔ انکیشن قریب آ رہے تھے اور اب بابا کی بڑے گھروں کی پتازا بھی بڑھنے لگی ہوگی۔ نگہت نے بتایا کہ وہ دونوں موٹی ایمان کو لے آئی تھی۔ اُس نے بتایا کہ ایمان بہت دیر تک وہ دونوں موٹی باتھوں میں لیے کم سمی بیٹھی رہی تھی۔ اس نے نگہت سے پھر یہی درخواست کی تھی کہ وہ مجھے سمجھائے کہ میری ضد کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا لہذا نہیں یہ تیاگ ترک کر کے واپس اپنے گھر چلا جاؤں۔ نگہت اس سے اُلجھ پڑی تھی کہ جب اسے میری کوئی ٹکری نہیں ہے تو پھر میری در بدری اور میری خواری کا خیال بھی اپنے ذہن سے جھٹک دے۔ اسے خواہ مخواہ خود کو مجرم سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جو بھی کر رہا ہوں اپنی خوشی اور اپنی مرضی سے کر رہا ہوں، ایمان کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نگہت کی یہ سخت جوابی سن کر وہ جہرہ جہیں ایمان کس قدر آزرہ ہوئی ہوگی۔ میں یہ سوچ کر دکھی ہو گیا۔ لیکن نگہت نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اگر وہ چپ بھی واقعی تب بھی حیا ضرور اپنی لیکن اسے اُلجھ پڑتی۔ نگہت کو خود بھی اس بات پر حیرت تھی کہ جانے کیوں حیا کو مجھ پر اور میری ایمان سے محبت پر بے انتہا یقین تھا۔ اور وہ مجھے ایمان کے معاملے میں ذرا بھی قصور وار نہیں سمجھتی تھی۔ مجھے اس انجانی لڑکی پر اس لمحے سے حد پڑا یا۔ چلو۔۔۔ کوئی تو تھا اس گھر میں جو کھلے عام مذہبی ٹھپ کر ہی اس نازنین کے سامنے تھا کی میں میری دکالٹ کرتا تھا، کیجئے ہیں مستقل طور پر اگر پانی کا ایک قطرہ بھی کسی سنگ سخت پر پڑتا رہے تو وہ بھی پتھر میں سوراخ کر دیتا ہے۔ دیکھتے ہیں۔۔۔ اس پتھر کو دل کب پتھلتا ہے۔

میں جانتا تھا کہ ایمان کا شمار ان لڑکیوں میں ہوتا ہے جن لڑکیوں کے دلوں کے ہر کواڑ کی چابی ان کے ماں باپ کے پاس ہوتی ہے۔ ان کی ہر پسند ناپسند اپنے بزرگوں کی پسند سے مشروط ہوتی ہے۔ ان کے دلوں کا ہر راستہ ان کے باپ کی بیٹھک سے ہو کر گزرتا ہے۔ وہ بیٹھک جہاں سے آگے بڑھنے کی اجازت ملے پر ہی وہ اپنے دل کا دروازہ کسی انجینی کے لیے کھولتی ہیں۔ ورنہ یہ دروازے یہ کواڑ ساری مر بندی پرچے ہیں۔ آپ لاکھ ہرچیں، ماتھے کو گرانا کھرا کر لہو بہان کر لیں پر وہ بہری بنی پٹلی رہتی ہیں۔ ان تک رسائی ناممکن ہوتی ہے۔ پرستان کی ان پریوں کی شہزادی کی طرح



کہ جس کے گل کے روزانے پر کوئی اور صاف کوئی دیو یا کوئی جنم پہرہ دینے کے لیے ہر وقت موجود ہی رہتا ہے۔

لیکن مجھے ہانے کیوں اپنی محبت کی طاقت پر کبھی شک نہیں رہا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ میرے پاس اب جینے کے لیے اس محبت اور اس کی طاقت پر بھروسہ کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ یہ بھرم بھی ٹوٹ جاتا تو شاید میں اسی پل خود بھی مر جاتا۔ اب میری زندگی کا مقصد ہی اس بھرم کی دیوار سے باہر نکل کر آنا تھا۔ ہنسا کسی قیشے اور اواز کے صرف اپنے خالی فاقوں اور کمزور ناشنوں کی مدد سے اس پہاڑ کو اوچل کر ایک نہر کھودنا تھا۔ میرے ناخن تو پہلے ہی ٹوٹ چکے تھے، جھل چکے تھے، ہاتھ ابولہاں تھے اور پتھر کا پہاڑ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اپنی جگہ ویسے ہی قائم تھا۔ لیکن میرا حوصلہ ابھی جوان تھا۔ میری ہمت میرے ساتھ تھی۔ سوئیں بھی اپنی رفتار کے ساتھ کسی نہ کسی صورت مشقت جاری رکھے ہوا تھا۔ بس شرط ماسٹوں کی تھی۔۔۔۔۔ وہ جب تک ساتھ دیتیں۔۔۔۔۔ میں ڈکنے والا نہیں تھا۔

اتفاق کی بات یہ ہے کہ اس راستے میں مجھے جو بھی لوگ ملتے گئے انہوں نے کسی نہ کسی طعہ میری مدد ہی کی تھی۔ میرا راستہ بھل ہی گیا تھا۔ شا کر نگہت، صدیقی صاحب، غفور اور اب یہ صوفی رحمت اللہ۔۔۔۔۔ کبھی نے میری ہمت کسی نہ کسی طرح سے بڑھائی ہی تھی۔

رحمت اللہ صاحب نے تو ایک نیا ہی راستہ دکھا دیا تھا۔ اور میں نے اب اسی راستے پر چلنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اگر مولوی صاحب کی فطریں مذہب ہی میری کی اور میری غمازی تھی تو میں نے اب تک اس کی کو اس غمازی کو فرو کرنے کی کوشش بھی تو نہیں کی تھی۔ لوگ مذہب سے محبت کی وجہ سے مذہب کی طرف جاتے ہیں تو کیا ہوا اگر میں اپنی محبت کی وجہ سے مذہب کی طرف قدم بڑھانوں۔۔۔۔۔ رحمت اللہ صاحب نے کہا تھا کہ لاکھوں کروڑوں میں کوئی ایک کامل دین ہوتا ہے۔ تو پھر میں بھی اگر ان ہزاروں کو دیکھوں کہ ساتھ مل جائیں تو اس میں کیا نہ ملتی ہے؟ مانا کہ یہ سب نہیں اس وقت ایمان کو پانے کے لیے ہی کرتا لیکن اپنی محبت کو ہار دینے اور ہتھیار ڈال دینے سے تو بھر بھی یہ کہیں بہتر تھا۔ دل میں کوئی تلخ تو نہیں باقی رہتی کہ کاش یہ بھی کر کے دیکھ لیتے۔

وہ جاتی کریموں کے دن تھے اور تھر کا مہیت اور نر اس سر پر تھی۔ میں نے اسٹیشن کے چائے والے لڑکے کو کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے صبح ساڑھے چار بجے جگا دے۔ ویرات کی شفٹ میں اسٹیشن پر پیمیری لگا کر ایک مخصوص نوپے کے پتھر میں شیشے کے گلاس پھنسا کے ان پر ایک نوپے کی پتلی گھما کر آواز نکال کر چائے پیتا تھا۔ اور مجھ سے خاصی دقتی ہو گئی تھی اس کی۔ باہر عام فاس کا باہر نے مجھے ٹھیک ساڑھے چار بجے۔ "چائے گرم" کے نعرے کے ساتھ ہی اٹھا دیا۔ بہت جوں سے میں نے بیڈلی نہیں پی تھی۔ سو اس نے آج یہ خواہش بھی پوری کر دی۔ البتہ یہ بیڈلی نہیں بلکہ بیڈلی تھی کیونکہ وہ پیٹنگ روم میں چڑے وہ گلز کے تختے ہی اب میرا ہسٹہ تھے۔ چائے پی کر میں جلدی سے اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلا اور باہر نکلنے نکلنے اسٹیشن کے گل سے منہ پر پانی کے دو چار پھینکے بھی مار لیے۔ باہر اکا دکا تانگے موجود تھے جو ٹی کے ٹیل والی بڑی بڑی لائٹنیں اپنے جاکوں پر لٹکائے صبح کی تیاروں میں مصروف تھے۔ میں نے وہیں سے خبر دنگے والے کو آواز نکالی۔ خبر دنگہ ہانکا ہوا قریب آ گیا۔

"خیر تو ہے باؤنمبر 137۔۔۔۔۔ اتنی صبح سویرے کہاں کا ارادہ ہے۔"

نہ کہہا۔ اس نے جھپٹا کر اپنے گھٹے دیا۔ سڑکیں سنسن پڑی تھیں۔ کوئٹہ سو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم ضلعی سڑک سے ہوتے ہوئے پُرانے محلے کے گیت

کے قریب پہنچ گئے۔ مسجد کے قریب پہنچ کر میں نے خیر و کوہو میں دکنے کا اشارہ کیا۔ خیر و نے تاگہ ایک طرف لگا پا اور حسب معمول اپنے تاگہ کے ساتھ لٹکے ہوئے ہڈے کے منگلی بیٹے کے ریل پو کے ساتھ پچھڑ چھاڑ میں مصروف ہو گیا۔ کبھی کبھی مجھے ان تاگہ والے رکشہ والوں اور نجی چلانے والوں کی اس مخصوص عادت پر بہت حیرت ہوتی تھی۔ کچھ بھی ہو جائے، زمانہ ادھر کا ادھر ہو جائے پر یہ لوگ خیر میں ضرور سٹنے اور بعد میں آپس میں بیٹہ کر اس پر تہرے کرتے جیسے وہ کوئی تاگہ یا رکشہ اسٹینڈ پر نہ بیٹھے ہوں بلکہ جیسے کسی اسمبلی کے رکن ہوں اور اگر وہ تہرہ نہ کریں یا خیر میں نہ سٹیں گے تو جیسے ملک کا بے حد بڑا نقصان ہو جائے گا۔ اور اس کے برعکس عام طور پر اسمبلیوں تک پہنچنے والے اسمبلی میں اس روپے کا مظاہرہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے جس کی توقع ہم ان تاگہ ہانوں سے کر سکتے تھے۔

میں خیر و کوہو میں خیر و کی تلاش میں ریل پو کی سولی سمنا تا چھوڑ کر مسجد میں داخل ہو گیا۔ مسجد ابھی تقریباً خالی ہی تھی، اکا کا نمازی آنے لگے اور پھر جماعت کے وقت مولوی عظیم مسجد میں داخل ہوئے اور سیدھے امام کی جگہ پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ دو رکعت نماز پڑھا کر انہوں نے سلام پھیرا اور پھر دُعا کے لیے منتظر ہوں کی طرف پلٹے۔ جیسے ہی انہوں نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ مجھے بھر کے لیے تو وہ جیسے سن ہی ہو کر رہ گئے۔ پھر انہیں جیسے کچھ خیال آیا اور انہوں نے دُعا ختم کی۔ سب نمازی ایک ایک کر کے مسجد سے نکل آئے۔ میں بھی مولوی عظیم سے بنا کسی بات کے باہر آیا اور خیر و کوہو اس اسٹیشن چلنے کے لیے کہا۔ خیر و نے حیرت سے مجھ سے دیکھا۔

”کیا بات ہے بالہ۔۔۔۔۔۔ صرف خارج پڑھنے اتنی ذور تک آئے تھے۔۔۔ کیا کوئی منت وغیرہ مانی ہے۔“

”مجھے سمجھ لو۔“

خیر و نے تاگہ آ کر بڑھادیا۔ سچ ہے محبت بھی تو ایک منت کی طرح ہی ہوتی ہے۔ بلکہ محبت سے بڑی منت اور بھلا کوئی دوسری منت کیا ہوگی۔ اس دن کے بعد سے میں نے اپنا یہ معمول بنالیا کہ میں ہر روز صبح فجر اور پھر عشاء کی نماز کے لیے اسی مسجد میں جاتا جہاں مولوی صاحب جماعت کروا رہے تھے۔ صبح میں کھیر، عصر اور مغرب کا وقت اسٹیشن پر ڈیوٹی کے دوران ہو جاتا تھا لہذا یہ نمازیں مجھے اسٹیشن پر ہی ادا کرنی پڑتی تھیں۔ میں نماز پڑھنے کو ہمیشہ سے ایک بے حد ذاتی فضل سمجھتا رہا ہوں۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ جیسے اپنی خواہنا کسی کے سامنے پڑھنے سے اس کی حرمت اور اس کی عظمت متاثر ہوتی تھی۔ جیسے کچھ دکھاوے کا پہلو نمایاں ہو رہا ہو شاید اسی لیے اسٹیشن پر کبھی کسی نے مجھے نماز پڑھنے سے روک نہیں دیکھا ہوگا۔ عشاء اللہ نے مجھے بھی فجر اور عشاء کی نمازوں پر وہاں آتے جاتے دیکھا لیکن وہ کبھی ایک عجیب جوان رحا تھا۔ جب بھی مجھ سے ملا، بڑی خند و چہرانی سے ملا۔ میں نے کبھی اس کے چہرے پر کسی قسم کا رنج، غصہ یا تھکاؤ نہیں دیکھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ میں ہوں اس مسجد میں آ کر مولوی صاحب سے روزانہ ایک سو جنگ لڑ رہا ہوں۔ جس کی کڑواہٹ روز بروز مولوی صاحب کے چہرے پر بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

عشاء کے بعد مولوی صاحب کا معمول تھا کہ وہ کسی بھی مسئلے یا حدیث کو لے کر چند روز منت کا ایک درس دیتے تھے جسے سنتے کے لیے چند نمازی چپکے رک جاتے تھے۔ جن میں اب میں بھی باقاعدگی سے شامل ہوتا تھا۔ عبد اللہ بھی ضرور اس درس میں شامل ہوتا تھا بلکہ حدیث یا تفسیر کی کتاب طاق پر سے اٹھا کر لائے اور وہاں رکھنے کی ڈیوٹی بھی عبد اللہ کی ہی تھی۔

لیکن شائد مولوی صاحب نے بھی یہ طے ہی کر لیا تھا کہ وہ اپنے طور پر مجھ سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ نہیں سلام کرتا تو جواب دیتے اور پھر وہی لافلتی۔۔۔ ان جیسے شریف اور وضع دار شخص سے کچھ ایسی ہی توقع کی جا سکتی تھی۔ میری فخر اور نراذ عشاء کا یہ سزا جاری تھا۔ کبھی کبھار کوئی نمازی درس کے دوران کوئی مسئلہ کوئی سوال بھی پوچھ لیتا تھا جس کا مولوی صاحب کبھی تفصیل اور کبھی مختصر کے ساتھ جواب دیتے تھے۔ ایک دن ایسے ہی ایک نمازی نے مولوی صاحب سے چھ کلمے سنانے کی اور انھیں یاد کرانے کی فرمائش کی۔ مولوی صاحب نے پہلے اس سے پوچھا کہ راستے اس وقت کتنے کلمے زبانی یاد ہیں۔ اس شخص نے کہا دو۔ مولوی صاحب نے وہ دو کلمے اس سے سنے اور پھر تیسرا کلمہ اے یاد کروایا۔ میں بھی وہیں بیٹھا دل ہی دل میں وہ تیسرا کلمہ یاد کرتا رہا۔ پھر اسی طرح اگلے دن انہوں نے وہی نمازی سے عشاء کے بعد تین کلمے سنے اور پوچھا یاد کروایا۔ میں بھی ساتھ ساتھ دہرات اور دل ہی دل میں اسے پکا تا رہا۔ اسی ترتیب سے پانچویں دن پانچواں اور چھٹے دن چھٹا کلمہ انہوں نے اسے ازبر کر وا دیا۔ ساتویں دن درس کے بعد مولوی صاحب نے خود اس نمازی سے چھ کلمے سنانے کی فرمائش کی۔ اس نے نائنٹ چھ کے چھ کلمے سنا دیے۔ مولوی صاحب نے خوش ہو کر اس نمازی کی بیٹہ چٹکی۔ میں نے آہستہ سے کھاکر کر کہا۔

”میں نے بھی یہ چھ کلمے یاد کر لیے ہیں جناب۔۔۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی صحیح کے لیے ایک مرتبہ بنا دوں۔“

مولوی صاحب نے چونک کر مجھے دیکھا۔ عبد اللہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جسے اس نے فوراً ہی چھپا لیا۔ مولوی صاحب نے منہ سے تو کچھ نہیں کہا البتہ سر ہلا کر اجازت دے دی۔ میں نے بھی چھ کے چھ کلمے مولوی صاحب کو سنا دیے۔ ایک آدھ جگہ میں انکا تو مولوی صاحب نے ہی صحیح بھی کر دی، میں نے چھ کلمے ختم کیا تو مولوی صاحب نے دھیرے سے کہا: ”ہذا اک اللہ۔“

ان کے فوراً بعد عبد اللہ کے منہ سے بھی یہی دُعا نکلی۔ اب یہ ہمارا معمول ہو گیا تھا جو نمازی بھی مولوی صاحب سے کچھ بتاتا یا سیکھنے کی فرمائش کرتا میں بھی اپنے آپ ہی ان کے ساتھ ساتھ وہ سب ازبر کرتا جاتا تھا۔ مثلاً ایمان، مصل، ایمان، مجمل، ذُعا، قنوت، مختلف مسنون دُعا میں وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب کچھ مجھے بھی بچپن میں مولوی صاحب ہی کی طرح کے ایک مولانا نے سکھایا تھا۔ جیسے ہر گھر میں مسلمان بچوں کو سکھانے کے لیے کوئی نہ کوئی اللہ کا نیک بندہ آتا ہی تھا۔ لیکن پھر وہ میرے دھیرے دھیرے جوانی کی حدوں میں قدم رکھنے کے ساتھ ساتھ میں یہ دُعا نہیں بھولی گئیں اور ان کی جگہ میرے ذہن میں انگلیش گانے اور ان کے سنگرز کے نام بھرتے چلے گئے۔ ان چند دنوں میں مجھے پھر سے وہ سب کچھ ازبر ہو گیا تھا جسے میں کئی سالوں سے ضد حرا نے کی وجہ سے بھلا بیٹھا تھا۔

مولوی صاحب نے بھی اب جیسے میری موجودگی سے اک سمجھوتہ ہی کر لیا تھا کیونکہ وہ جان گئے تھے کہ میں نے کبھی کسی مقدمہ کے لیے بھی براہ راست ان سے بات کرنے کی یا پھر ان کے راستے میں آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

کبھی کبھی جب مولوی صاحب کسی وجہ سے جماعت کروانے کے لیے نہیں آ پاتے تھے تب عبد اللہ یہ فریضہ سر انجام دیا کرتا تھا۔ اس دن البتہ نہیں عبد اللہ سے ضرور براہ راست کوئی سوال کر لیا کرتا تھا۔ جو پچھلے کچھ دنوں سے میرے ذہن میں موجود ہوتا لیکن مولوی صاحب کی موجودگی

کی وجہ سے زبان پر نہیں آ پاتا تھا۔ عہد اللہ بھی بڑے مسئلہ دل سے میرے سوال سناتا اور بہت تفصیل سے ان کے جواب دینے کی کوشش کرتا تھا۔ یوں چاہے میری محبت کی وجہ سے ہی کبھی پر دھیرے دھیرے مجھ پر میرا مذہب کھٹنے لگا تھا۔

عہد اللہ نے کبھی اس دوران جہانئ میں بھی مجھ سے کسی ذاتی مسئلے پر گفتگو نہیں کی تھی۔ البتہ اس دوران عہد اللہ اور مولوی صاحب کی زبانی بہت سی باتیں جو پہلے میری نظر سے اوجھل تھیں مجھے اب ان کی سمجھ آنے لگی تھی۔ خیر و نیک والے نے تو اب یہ روز کا معمول بنالیا تھا کہ وہ فجر اور مشاء کے وقت کوئی اور سواری اٹھاتا ہی نہیں تھا۔ اور میرے اسٹیشن سے نکلنے سے پہلے ہی وہ ان اوقات پر اپنا تانگہ سب سے آگے بڑھا کر کھڑا میرا انتظار کرتا رہتا تھا۔ اُسے مجھ سے میری "منت" کی وجہ سے عقیدت ہی ہو گئی تھی اور اس کی بدولت سارے ریلوے اسٹیشن کو یہ بات پتہ چل گئی تھی کہ عہد اللہ باؤ کی منت کے سلسلے میں روزانہ کنیں جاتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان کنیں نے مجھ سے ہلکا کوئی بات کہے بغیر خود ہی یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ ضرور یہ منت کسی محبت کے سلسلے کی ہی ہوگی۔ شاید میری عمر ہی ایسی تھی۔ یا شاید محبت خود عاشق کے روم روم سے نکلتی ہے۔ اس کی آنکھیں، اس کی چال و حال اس کا چہرہ چیخ چیخ کر لوگوں کو بتا رہا ہوتا ہے کہ دیکھو۔۔۔ یہ جا رہا ہے وہ شخص جس نے محبت کرنے کا جرم کیا ہے۔ کبھی ہے وہ گناہ گار جو سنگسار کیے جانے کا حق دار ہے۔

بہر حال ان دنوں اسٹیشن پر میری اور میری "منت" کی بڑی دھوم تھی۔ صدیقی صاحب بھی کبھی کبھی دفتر چھوڑ کر ڈرائی وەرٹ کے گھوڑا موں کی طرف چلے آتے اور مجھے کہیں تنہا بیٹھا دیکھ کر مسکرا کر میرے ہال ہاتھ بڑھا کر بکھیر دیتے اور ہلکا کچھ کہے واپس چلے جاتے۔ عجیب سی شفقت تھی ان کے انداز میں۔ جیسے کہہ رہے ہوں، کیے جاؤ یہ محبت کا جرم۔۔۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں گھبرا نا نہیں۔۔۔

شاکر سے گاہے بگاہے ملاقات ہو جاتی تھی۔۔۔ عہد اللہ نے شاید اُسے مسجد میں میری روزانہ کی حاضری کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ وہ مجھ سے مل کر کچھ نہ بولا۔۔۔ بس مجھے لگے گا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا وہ محبت شاید پیدا ہی سب کو نزلانے کے لیے ہوتی ہے۔ واپسی پر نگہت سوچی آنکھوں کے ساتھ برآمدے کی اوٹ سے باہر نکلی اور اس نے میرے ہاتھ پر کوئی امام فاضل باندھ دیا۔ لونی۔۔۔ یہ تو خیر وہی منت والی بات بھی سچ ہی ہوگی۔ مجھے نگہت سے اس ناز واد کی حالت پوچھنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ پہلے ہی اس کے آنسو مجھے دیکھ کر حتم نہیں پاتے تھے۔ کچھ پوچھ بیٹھا تو اسے سنبھالنا واقعی مشکل ہو جاتا۔ امام فاضل باندھ کر اس نے بوے پیار سے میرے ہال سنوارے اور سر پر ہاتھ رکھ کر یوں دعا دی جیسے وہ میری بڑی بہن ہو۔ اس ایک محبت نے مجھے کتنے لوگوں کی نظروں میں مقرب بنا دیا تھا۔ مجھے اس دن احساس ہوا کہ محبت بیک وقت ہمیں کئی نظروں میں مقرب کر دیتی ہے اور کئی نظروں میں محترم بنا دیتی ہے۔ محبت ایک ہی وقت میں زہر اور دوا ہی لمحے میں تریاق کا کام دیتی ہے۔

☆☆☆

## شرم پیپر

جس دن سے میں نے ”ہالوکاسٹ“ پر اپنا تحقیقی پرچہ لکھنے کا اعلان کیا تھا اسی دن سے سراسر عذک بھی مجھ سے کچھ کچھ کہنے سے رہنے لگے تھے۔ جو زلف سے ملاقات ہوئی تو اس نے میرے کانڈھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”میں جانتا تھا کہ تمہیں روکنا بہت مشکل ہوگا۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“

ریکا جانے کا اس میں ذریعہ کیا کچھ پڑھتی رہتی اور مجھ پر آتے جاتے پھوگئیں مارتی رہتی۔ سارا دہشت پر سکون تھی لیکن اس کا ٹینگ مجھے کھانے والی نظروں سے گھورتا رہتا تھا۔ اور پھر اس دن وہی ہوا جس کا کامران بہت دنوں سے غصہ ظاہر کر رہا تھا۔

اس دن یونیورسٹی جلدی خالی ہو گئی تھی کیونکہ شہر میں کسی جلسے کی وجہ سے آس پاس کی سڑکوں کو بند کر کے متبادل راستوں سے ٹریفک گزارنے کا اعلان کیا گیا تھا۔

انتظامیہ نے اسٹوڈنٹس کی سہولت کے لیے ایک لیجر پہلے ہی یونیورسٹی کی بسیں چلانے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں اس دن کامران کی گاڑی سے نکرا آیا تھا۔ میں اور ریکا مرکزی عمارت سے نکل ہی رہے تھے کہ کہیں سے جم، ڈیوڈ اور ڈینا نمودار ہو گئے۔ جم حسب معمول میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”کیا جانتے ہو۔۔۔ میرا راستہ کیوں روک رکھا ہے تم نے۔“

”میں جانتا ہوں کہ تم اس یونیورسٹی سے فوراً دفع ہو جاؤ۔ اور دوبارہ پلٹ کر اس طرف کا رخ بھی نہ کرنا۔“

”اور اگر میں ایسا نہ کروں تو۔۔۔؟“

ڈیوڈ دو قدم آگے بڑھا آیا۔

”تو پھر ہم تمہارا بندہ دست کرنا بھی خوب جانتے ہیں۔“

جم نے میرا کرپان پکڑ لیا، دیکھا زور سے چلائی۔

”ہے جم۔۔۔ چھوڑ دو میڈی کو۔۔۔ تم وحشی ہو۔“

لیکن جم نے میرا کرپان نہیں چھوڑا۔

”میرا کرپان چھوڑ دو جم۔۔۔ جیسے مجبور مت کرو کہ میں۔۔۔۔۔“

اسے میں سارا جانے کس جانب سے دوڑتی ہوئی وہاں آ پہنچی اور میری بات اُدھری رہ گئی۔ سارہ نے آتے ہی ایک جھٹکے سے میرا

گس کرپان جم کے ہاتھوں سے چھڑوا دیا اور چلا کر بولی۔

”کیا پاگل پن ہے، جہم گلی کے خنڈوں جیسا رہتاؤ کرو گے۔۔۔ تم سے یقین نہیں تھا مجھے۔“  
 جم سارہ کو دیکھ کر کچھ خنڈا ہڑ گیا۔ نہیں، ریکا کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ سارہ مجھے آواز میں دیتی ہوئی پیچھے چلی آئی۔  
 ”جہم کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتی ہوں جانے اُسے کیا ہو گیا ہے۔“  
 میں نے فور سے سارہ کی طرف دیکھا۔

”شاید وہ کچھ کورواشت نہیں کر پارہا۔ کچھ قسم کروا واقعی ایک مشکل کام ہے۔“ میں نے سارہ کو یونیورسٹی میں گھر آ جھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ ریکا نے راستے بھر جم کو دل کھول کر موٹی موٹی گالیاں دیں۔ میں ہانڈ پارک کے علاقے میں واقع اس کے پارٹنٹ تک اُسے چھوڑنے کے لیے جا رہا تھا۔ پکاڈلی کی مرکزی سڑک سے دائیں مڑے ہی وہ بچوں کی طرح چلائے لگی۔ سڑک کے کنارے ایک کینڈی فلاس پیچھے والا جو کروں کے لباس میں کلاؤن بنا کھڑا تھا اور آتے جاتے بچوں کو مختلف اوٹ چٹاگ حرکتیں کر کے ہنسا رہا تھا اور انہیں لمبوں والی منگائی خریدتے پر مجبور کر رہا تھا۔ ہاں۔۔۔۔۔ بچپن میں ہم اسے لمبوں والی منگائی ہی تو کہتے تھے۔ ہمارے گھر کے باہر گلیوں میں ایک بوڑھا سا بابا شیشے کے بڑے سے مرجان میں بہت سی روٹی کے کالوں جیسی سفید اور گلابی منگائی کے گولے لے کر آتا اور ان کو پھر ایک موٹے سے ٹکے کے گرد خوب اچھی طرح گھما کر لپٹ کر ہمیں بہت سے گولے تھا دیتا۔ یہاں پر انہی روٹی کے کولوں کو کینڈی فلاس کہا جاتا تھا۔

ریکا کی چیخ و پکار سے مجبور ہو کر مجھے بھی گاڑی سڑک کے کنارے لگائی پڑی۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر گاڑی سے اتر کر بھاگ کر کلاؤن کے پاس پہنچ گئی اور پھر وہاں روٹی کے دو بہت بڑے سے پیٹلے اور گلابی گولے خوا کر مجھے بھی ہار آنے کا اشارہ کرنے لگی۔ واقعی اس لڑکی کو ایک کروٹ بھی جین نہیں تھا۔ مجبوراً مجھے بھی پیچھے اترنا پڑا۔ جہم بہت دیر تک وہیں سڑک کنارے بیٹھ کر لمبی سی سہل پر بیٹھے کلاؤن کی بکری کو راتے رہے۔ ہمارا بچپن بڑھاپے تک ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ اندر کہیں دیک کر بیٹھا رہتا ہے اور موقع ملے ہی جسم سے باہر نکل آتا ہے۔ ہمیں بیویوں میں کچھ اور اخروٹ ٹھمرنے پر آگستا ہے۔ تمہا سڑک پر زور سے سیٹی مارنے پر مجبور کرتا ہے۔ رو اچلتے ٹھیلے والے سے برف کے گولے پر شربت ڈلو کر مزے سے چوستے پر مائل کرتا ہے۔ کھٹی میٹھی گولیاں اور جڈن گروالوں سے چھپ کر منڈ میں بھرنے پر شاباش دیتا ہے۔ وہی بچپن آج ریکا کے اندر سے بھی چھلک رہا تھا۔ اور اس لڑکی کے بہانے میں نے چند پل اپنے بچپن کے پھر سے جا لیے۔

لیکن اس وقت ہم دونوں ہی نہیں جانتے تھے کہ کل کا سورج کیا لے کر آئے والا ہے۔ اس گلی دن یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی مجھے سب سے پہلی جو شربتی وہ یہ تھی کہ میری اور جہم کی وضاحت طلب کی گئی تھی۔ ہمارا جرم تھا یونیورسٹی کے ماحول اور ڈسپلن کو خراب کرنا اور اس کی کینڈیشن (Explanation) کا جواب ہمیں آج دہانی اور تین دن کے اندر جہم کی طور پر جہم کروانا تھا۔ ریکا اس بات پر بے حد متحفظ تھی۔ ”یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ ساری یونیورسٹی جانتی ہے کہ سارا قصور جہم کا تھا۔ اُسی نے تمہارا راستہ روکا تھا اور تم نے تو جواب میں اسے کچھ کہا بھی نہیں۔ میں خود سراسر آٹھک سے بات کروں گی۔۔۔ میں سمجھتی ہوں تمہارے خلاف کوئی کیسے ایکشن لیتا ہے۔“

وہ اپنے آپ ہی شدید غصے میں بڑبڑائے جا رہی تھی اور جانے کب سے لان میں ادھر ادھر ٹھہر رہی تھی۔ جیسے زور زور سے زمین پر پاؤں مار کر اپنا غصہ نکال رہی ہو۔ مجھے اس کے اس ناراض سے انداز پر غصی آ گئی۔

”تم بیٹھ کر بھی اپنا غصہ نکال سکتی ہو، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

اُس نے مجھے بھی غصے سے دیکھا اور اپنی چٹائل قدمی اور بڑبڑاہٹ ویسے ہی جاری رکھی۔

”مجھے سارہ سے یہ امید ہرگز نہیں تھی۔ وہ تو خود اس تمام واقعے کی چشم دید گواہ ہے۔ آخر اس نے سر آنکھ کو کیوں نہیں بتایا کہ تم بالکل

اسے میں اتیکر پر میرا اور جسم کا نام پکارا جانے لگا کہ ہم پانچ منٹ کے اندر یونیورسٹی کے ڈین یعنی سر آئزک کے کمرے میں کھینچ کے آجائیں۔ میں نے اٹھ کر درہکا کو کاندھوں سے پکڑ کر اپنی جگہ بٹھا دیا۔

[illegible]

”جی مسٹر حوا۔۔۔۔۔ آپ اپنی صفائی میں کچھ گہرا چاہتے ہیں۔“

”میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ مجھ پر یہ الزام سراسر غلط ہے۔ میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس سے یہ یو یو ایف کا کوئی بھی قانون ٹوٹا ہو۔ میرا راستہ جمہوریت کا تھا لیکن بات وہ جس ختم ہو گئی تھی۔“

”لیکن جم کے بیان کے مطابق تم اس پر حملہ آور ہوئے تھے اور بات بہت اُسے تک بڑھ چکی تھی۔“

مجھے جم کے بہان پر کوئی حیرت نہیں ہوئی، میں نے سکون سے جواب دیا۔

”میرا بیان اب بھی یہی ہے کہ بات معمولی سی تھی اور اسی لئے قسم ہو گئی تھی۔ اگر انتظامیہ چاہے تو اپنے طور پر بھی اس واقعے کی تحقیق کر سکتی ہے۔ کیونکہ اس وقت اچھے خاصے اسٹوڈنٹس وہاں موجود تھے جنہوں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ سارا واقعہ ہوتے دیکھا ہے۔ انہی میں ایک نام مس سارہ آنرک کا بھی ہے جو غروہاں واقعے کی چشم دید گواہ ہیں۔“

سارہ کے نام پر سڑا نرگھ نے چونک کر میری طرف دیکھا جسے انہیں میری زبان سے سارہ کا نام بطور کواڈی سننے کی آگاہی مل چکی تھی نہ ہو۔ یہی حال ہارپرک کا ہوا جب میں نے اُسے کمرے سے نکل کر بتایا کہ میں نے بطور گواہ سارہ کا نام انکو انٹرویو کئے ہوئے دیا ہے۔ سارہ نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ”آف میڈی۔۔۔۔۔ یہ کیا غضب کر دیا تم نے۔۔۔۔۔ اب تمہیں پوچھو رٹی سے ریسٹی گیٹ Restigata ہونے سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔ میں بھی نہیں۔

☆☆☆

## پھر وہی نظر

میں اُسی باقاعدگی سے مولوی عظیم کی مسجد میں دن کی دو نمازیں پڑھتا رہا تھا۔ اس دوران ایک اور واقعہ درخشاں آ گیا۔ کوئٹہ سے کراچی کے لیے سہ ہر چار بجے تک قریب بولان میل نامی ایک گاڑی روڈ انڈانگلی ہے۔ جس کا کوئٹہ سے نکلنے کے بعد تیسرا انٹیشن مجھ ٹائی شہر پر تا ہے۔ شہر کیا ہے ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کی وجہ شہرت یہاں انگریز سرکار کی بنائی ہوئی ایک بہت بڑی جیل ہے جو ”مجھ جیل“ کے نام سے ہی مشہور ہے۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں جہاز افغان بھائیوں کے کالافانی جیل کی جو شہرت تھی وہی اس مجھ جیل کی بھی تھی۔ اس قصبے کے درمیان طبعی کے لوگ کھجور کراچی سے آتی ہوئی اسی بولان میل کی پہلی گاڑی سے کوئٹہ آ جاتے تھے جو کچھ آٹھ بجے کے قریب کراچی سے مجھ پہنچتی تھی۔ دن بھر اپنے کام چٹا کروہ شام کو اسی میل کی ڈاکٹرانیکس پریس سے چار بجے دو بارہ بجے کے لیے روانہ ہو جاتے تھے۔ جو انہیں ڈیڑھ گھنٹے میں مجھ پہنچا دیتی تھی۔

اس دن صدیقی صاحب کے کوئی دوست جوان دنوں مجھ ریلوے اسٹیشن پر اسٹیشن ماسٹر تعینات تھے اپنے گھر والوں کے ساتھ صدیقی صاحب کی دعوت پر کوئٹہ آئے ہوئے تھے۔ شام کی گاڑی سے واپس مجھ جا رہے تھے۔ پیوی بچوں نے شاید کوئٹہ کے ہزاروں سے کبھی چیزوں کا ایک آدمی صوفیہ ضرور خریدنا تھا سچی ان کے ساتھ سامان کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ٹرین چھوٹنے کا وقت تھا ابنا صدیقی صاحب ابھر اُھر سے قلیوں کو بلوا کر جلدی جلدی ان کا سامان گاڑی کی بوکی میں رکھوا رہے تھے۔ میں نے دور سے دیکھا تو میں بھی مدد کے لیے چلا آیا۔ غور سے کو ایک طرف ہٹا کر میں نے اس سے اور ایک دوسرے بوڑھے ملنے ملنے سے سوٹ کیس کے لیے لور گاڑی کی طرف پلٹا، نظر اٹھائی تو عبداللہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ عبداللہ مجھے یوں قلیوں کے لباس میں سوٹ کیسوں اور بکسوں کے بوجھ سے تندرہ پھندا دیکھ کر چند لمحوں کے لیے گنگ سا کھڑا رہ گیا۔ میں نے مسکرا کر اس سے پوچھا کیوں عبداللہ میاں۔۔۔ اگلی چاہیے تو بولو لیکن مزدوری۔۔۔ اچانک جیسے میری زبان پر کسی نے کوئی جملہ ہوا کوئٹہ کہ چھوڑا ہو۔ عبداللہ کے بالکل پیچھے کچھ لاسٹلے پر کالے برقعے میں لباسی وہ گھڑی تھی۔۔۔

ہاں ہاں۔۔۔ وہ وہی تھی۔۔۔ میں اس کی اُن قائل لگا ہوں کو بھلا کیسے بھول سکتا تھا۔ پھر یہ چلا کہ اس کے پیچھے حیا اور ایک بوڑھی خاتون بھی تھیں جو سنید شمل کا کہہ رقتے میں ملیں تھیں۔ شانہ وہ ایمان کی اماں ہی تھیں اور یہ سب لوگ عبداللہ کے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ سچی مجھے پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیے۔ میرے دونوں ہاتھوں سے سوٹ کیس گرتے گرتے پیچھے نہیں نے سامان نیچے رکھا۔ عبداللہ نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا لیکن میں اپنے حواس میں تھا ہی کہاں، پتہ نہیں میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا تھا۔ میں نے جتنی مرجہ بھی ایمان کو اپنے رو برو پایا تھا، میں اپنا آپ کو بڑھا تھا۔ مجھے اس کے بعد ہمیشہ خود پر بے حد غصہ آتا تھا اور میں حسرت سے سوچتا تھا کہ جتنی گھڑیاں بھی وہ میرے سامنے موجود رہی تھی، میں نے اک ایک ہٹا، کوئی لمحہ ضائع کیے اسے دیکھا کیوں نہیں۔۔۔ کیوں میری نظر ایک رتی بھر ہلنے کے لیے بھی ادھر ادھر ہوئی۔۔۔؟



کیوں اس وقت میں کسی اور بات میں الجھتا رہا۔۔۔؟ کچھ ایسی کیفیت اس وقت بھی مہری ہو رہی تھی۔ جاتے عبد اللہ تے کیا کہا؟ جانے نہیں نے اُسے کیا جواب دیا؟ غصہ اور دوسرے قلیوں نے دیکھا کہ میں اپنے کسی جاننے والے سے بات کر رہا ہوں تو وہ خود ہی میرے آس پاس بکھرا صدیقی صاحب کے مہانوں کا سامان اٹھا کر چل دیے۔ حیا ایک تک مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ اس نے بزرگ خاتون کو بھی میرے بارے میں کچھ بتایا۔ ایمان حسب معمول سر جھکائے کھڑی تھی۔ پر نہیں نے محسوس کیا کہ جس بل اس کی بے خبری میں پہلی بار یہاں پلیٹ فارم پر مجھ سے نظر چار ہوئی تھی، جب سے اس کا وجود رزدار ہاتھ۔ میں نے عبد اللہ کے ہاتھ سے ٹکٹ لے لیے تاکہ ان کی ان کے ٹپے تک رخصتی کر سکوں۔ سامان لینے کی کوشش لیکن عبد اللہ نے سامان کو مجھے ہاتھ نہیں لگانے دیا۔

ان کا ڈپا بس دو دو گیاں چھوڑ کر ہی تھا۔ عبد اللہ عود قوں کو اندر اٹھا کر خود باہر میرے پاس آ گیا۔ کچھ دیر تک ہم خاموش کھڑے رہے۔ شاید ہم دونوں کو کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات کریں۔ دفعتاً عبد اللہ نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور انہیں اپنی آنکھوں سے دکھایا۔ اس کی ہلکی پلکیں محسوس کرتے ہی میں نے تڑپ کر اپنے ہاتھ سمجھنے لیے اور اسے کندھے پر چھبکی دی۔ کبھی کبھی لفظ ہمارا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسے میں دوسرا سہارا آنکھیں ہوتی ہیں جو ہمارے جذبات دوسروں تک منتقل کر سکتی ہیں۔ پر اگر اس لمحے آنکھیں بھی چمک رہی ہوں تو پھر ہمارے پاس ہاتھ ہی رہ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ہاتھ پکڑ کر کبھی کمر سہلا کر کبھی ہچکلی دے کر اور کبھی دوسرے کو گلے لگا کر اسے یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم اس کے ساتھ ہیں۔ اس کے حال میں شریک ہیں۔ نہیں بھی اس وقت عبد اللہ تک بس یہی باتوں کی بولی ہی پہنچا سکا۔ نہیں نے اس لمحے محسوس کیا کہ حیا کی آنکھیں بھی ہلک گئی تھیں جنہیں اس نے فوراً ہر قے کا پانڈا کر چھپا لیا۔ حیا اور ایمان کھڑکی کے قریب ہی اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ عبد اللہ نے جاتے جاتے بتایا کہ وہ لوگ بھی ”چھٹے“ ہی جا رہے ہیں۔ جہاں مولوی صاحب کی سکن ذاتی تھیں، شاید کسی تقریب کے سلسلے میں۔ عجیب بات تھی کہ میری ایمان سے ان دو تین ٹوٹی پھوٹی ماقاتوں کے علاوہ آج تک کبھی سامنا بھی نہیں ہوا تھا لیکن پتہ نہیں اس کے کونڈے سے باہر جانے کی خبر سن کر مجھے ایسے محسوس ہوا کہ سارا شہر ہی ہمیشہ کے لیے سناں ہونے والا ہے۔ مجھے لگا کہ جیسے یہ ٹرین مجھ سے میرا دل، میرا سب کچھ چھین کر لے جانے والی ہے۔ ایک دم ہی سے جانے لگتی ہے چچیاں میرے دگ وپے میں میرے ہی گئی تھیں۔ ٹرین وہاں رول دے پھٹی تھی، عبد اللہ نے مجھے گلے لگایا اور پلیٹ کر ٹرین میں چڑھنے کے لیے بوگی کے دروازے کی طرف بولے گیا۔ میری نظر بے اختیار اڑے میں بیٹھی ایمان کی طرف اٹھ گئی۔ ایک لمحے کے لیے جیسے یہ ٹرین، یہ پلیٹ فارم، یہ آس پاس کے عمارت بھانٹ کی بولیاں بولتے لوگ، یہ شور، یہ دھن، یہ آسمان۔۔۔ سب میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ صرف ایمان اور اس کی دو آنکھیں اس کائنات میں باقی رہ گئیں۔۔۔ لیکن میری اس بدحواسی کی صرف اتنی ہی وجہ نہیں تھی! ایمان میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ جی ہاں۔۔۔ میری طرف۔۔۔۔۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے مجھ پر کوئی دوسری نظر ڈالی تھی۔ دوسری نظر، اور وہ بھی اپنی مرضی سے۔ جیسے ہی میری اس سے نظر ملی۔ اک جیسے کو اس کی آنکھوں میں فی ایک چمک سی لہرائی۔ اور پھر اس نے گھبرا کر نظر جھکا لی۔ مجھے لگا کہ میری زندگی کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ اب میری سانسیں ختم ہانی چاہئیں، مزید زندگی بے کار ہے۔

مجھے اپنے نصیب پر اتنا رشک پہلے کبھی نہیں آیا۔ جتنا اس لمحے آیا تھا۔ ٹرین نے ہلکا سا جھلکایا۔ ٹی ٹی نے تیسری اور آخری سینی بھائی۔

گامی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ عبداللہ بھی آکر دوسری جانب اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ غیر اختیاری طور پر میرا ہاتھ عبداللہ کو الوداع کہنے کے لیے اوپر اٹھ گیا۔ عبداللہ نے بھی ہاتھ ہلایا۔ میں اضطراری طور پر ٹرین کے ساتھ ساتھ چلتے لگا، جیسے کوئی پچاسپنے کسی عزیز از جان کھلونے کو کسی اور کے ہاتھوں میں سوپ تو دے پر جب وہ ہالے لگتا ہے تو وہ بھی ساتھ ہی چل پڑتا ہے۔ گاڑی کی رفتار تیز ہوتی جاتی اور ساتھ ہی میرے قدموں کی بھی۔۔۔۔۔

جانے مجھے کس چیز کی آس تھی کون سی تہمتا میرے دل کو اس وقت چیر رہی تھی، کاش دہی تھی۔ میری نظریں مستقل اندر مٹی کی سر جھیکا کے کا مٹی ہوئی ایمان پر تھیں۔۔۔۔۔ پلیٹ فارم کا آخری کنارہ قریب آتا جا رہا تھا۔ جانے میرے قدم راستے میں پڑی چیزوں اور سامان سے کتنی ٹھوکریں کھا چکے تھے، لیکن جب بھی میں لڑکھڑاتے ہوئے ڈھکی قدموں سے ٹرین کی رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش کرتا رہا۔ شاید غصہ نے کچھ چٹا کر رکھا تھا۔ شاید کچھ چٹکی میری طرف بڑھے بھی تھے تاکہ مجھے روک سکیں تاکہ نہیں پلیٹ فارم کے سرے سے گر کر ٹرین کے نیچے ہی نہ آ جاؤں۔ پر مجھے اس لمحے ہوش ہی کہاں تھا۔

جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ اس بار ایمان میری نظروں سے اوجھل ہوئی تو پھر شاید میں اُسے وہ بار بھی نہ دیکھ پاؤں گا۔ نہیں نظریں اندر ڈٹے میں گاڑھی آگے بڑھتا رہا اور پھر جیسے قدرت کو میری حالت پر دم آئی گیا۔ بہری بے چارگی میری لا چاری نے غرض پر جتنے ماتھے ٹکے تھے، شاید آسمان پر وہ سارے بچے قبول ہو گئے تھے۔ ایمان نے ایک لمحے کے لیے سر اٹھایا اور باہر مجھ پر نظر ڈالی۔ چند لمحے وہ مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی ایک نظر میں جانے کتنے سوال، کتنی التجائیں اور کتنی بے بسی تھی۔ دوسرے لمحے ٹرین تیزی سے پلیٹ فارم سے نکل چکی تھی۔ مجھے جانے کس کے بازوؤں نے تھام لیا۔ نہیں اپنی سمدھ بدھ کھو چکا تھا۔ بس ٹرین کے تیز پھیلنے کی گڑگڑاہٹ میری ہاتھوں کو چیر رہی تھی۔ آنسوؤں سے میرا چہرہ دھل رہا تھا۔ نہیں وہیں زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھا اور جاتی ٹرین کو دیکھتا رہا۔ میرے آس پاس میرے ساتھی تھی، غمور احمد جی صاحب اور جانے کون کون مجھے تھپی دینے کے لیے تھپک رہا تھا۔ سہارا ہاتھ اپنے ساتھ سمجھ رہا تھا، لگے لگا رہا تھا لیکن مجھے کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ دنیا میرے لیے بے ہوش تھی۔

جانے ایمان کی نظریں کیا تھا؟ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتی تھی؟ شاید میں کہیں یہ پاگل بن اور پیدیا لگی چوڑو دوں، کہیں نہ کہیں تو میرے سینے کی یہ آگ اور میرے سینے سے اٹھتا یہ دھواں اس کا اُجاوا امن بھی تو میلا کر رہا تھا۔ یا شاید یہی بات تھی۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ پھر اس کی آنکھوں میں یہ بے بسی کبھی تھی۔۔۔۔۔؟ یہ سوال کیسے تھے۔۔۔۔۔؟ میرا وہی چادر ہاتھ کہیں اس چیز پر چلتا ہاؤں، چلتا ہاؤں۔۔۔۔۔ وہاں تک، جہاں وہ ٹرین ایمان کو لے کر گئی تھی۔ اُسے جا کر اس انجانے جیسے میں سے کہیں ڈھونڈ نکالوں اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر نہیں اس نازنین سے پوچھوں کہ اُس کی آنکھوں میں وہ کیا سوال تھا؟ وہ ایک بار پوچھ کر تو دیکھتی۔۔۔۔۔ نہیں اپنی روح کا آخری دھماکا سمجھ کر بھی اس کے سوال کا جواب ڈھونڈ ہی لاتا۔

شام دھل چکی تھی اور اسٹیشن دھیرے دھیرے ویران ہوتا جا رہا تھا۔ نہیں پلیٹ فارم کے ایک کونے میں جلائے جانے والے لکڑی کے ماحٹوں اور دیگر بے کار اشیاء کے چلتے لاؤ کے گرد بیٹھا ہوا تھا۔ آگ میں لکڑی کے تختے جلتے رہے تھے۔ غصہ نے میرے کانڈھے پر ہاتھ رکھا اور میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

”باؤ۔۔۔۔۔ میرے اندر تو بڑی آگ ہے۔۔۔۔۔ سب ہی کچھ اندر رکھے گا تو اندر ہی اندر جھلس جائے گا۔ اور غمور تو سمجھتا تھا کہ آج تک صرف اُسی نے عشق کیا ہے۔ آج پتہ چلا کہ اپنے کو تو عشق کے عین کا بھی نہیں پتہ۔۔۔۔۔ کہاں سے لایا ہے اُجالا وا۔۔۔۔۔ اتنی نار۔۔۔۔۔ ایک

جسک نے ہی سارا انشیشن جاکر رکھ کر دیا۔ ایسے نہ کرنا باجوہ۔۔۔ ہم غریبوں پر کچھ رحم کھا۔۔۔ جہاد تو کون ہے؟۔۔۔ کیوں ہم گناہ گاروں سے اور گناہ کروار باہے۔۔۔ تو تو کسی سلطنت کا شہزادہ ہے۔ ان مزدوروں میں کیا کر رہا ہے۔۔۔؟

میرے پاس غفورے کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کیا بتا تاہیں اُسے؟ میں کچھ نہ بولا بس اس کا ہاتھ زور سے تمام کیا۔ ہاتھوں کی بولی نے اُسے جانے کیا پیغام دیا کہ پھر اس نے بھی دوبارہ کوئی سوال نہیں کیا۔ بس چپ چاپ بیٹھا آگ تا چارہا۔ جلتی آگ چلتی رہی اور ہم دونوں کے چہروں کو سنہری اُہالے سے روشن کرتی رہی۔

نہ جاتے کیوں اس دن کے بعد سے میں جب بھی انشیشن کے کسی بھی حصے یا پاپٹ فارم سے گزرتا تو اُس پاس کام کرتے میرے ساتھی، انشیشن کا مذہب میرے افسر بھی رک کر مجھے دیکھنے لگتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سا احترام در آتا تھا۔ جیسے مجھے اس عشق کی ایک واردات نے ان سب کی نظروں میں بہت محترم کر دیا ہو۔ حالانکہ نہیں خود اپنی اس دن کی بے خودی پر بے حد شرمندہ تھا۔ دوسرے دن اور اس کے بعد مجھے سب کے سامنے جاتے ہوئے کسی قدر مشکل کس قدر شرمندگی ہوئی تھی یہ میرا دل ہی جانتا تھا۔

میں لگا ہزار روزانہ کراچی سے آنے والی ایکسپریس اور دیگر گاڑیوں پر ضرور چپک کرتا تھا کہ شاید ایمان واپس آگئی ہو۔ لیکن ہر روز مجھے مایوسی ہی ہوتی تھی۔ دو دن گزر گئے پھر تین پھر چار۔۔۔

میری قبر اور عشاء کی "منت" والی نمازوں میں بھی بے قاعدگی ہونے لگی تھی۔ بس ہر لمحہ ذہن و دل پر وہ دو آنکھیں ہی سوار رہتی تھیں۔ مجھے ہر وقت بتا رہا تھا کہ غفور ایک بار اصرار کر کے کسی ڈاکٹر کو کہیں سے پکڑ لایا۔ ڈاکٹر نے مجھ سے بیماری پوچھی تو غفور نے کہہ دیا ہے "اعتیاد رکھ گیا۔" "عشق کا بیمار ہے ڈاکٹر صاحب۔"

اور ڈاکٹر بھی میرے ساتھ ہی جنس پڑا۔ واقعی شاید یہ محبت کا ہی بخار تھا۔ یہ جڑ بے بھی کس قدر طاقتور ہوتے ہیں۔ ہمارے جسم کے اندر گھس کر خون کے بہاؤ میں شامل ہو کر ہماری نسوں سے، ہماری رگوں سے چھیل چھاڑ تک کر سکتے ہیں۔ ہمارے پورے جسم کا نظام ہکا بکا کر سکتے ہیں، انٹ پیسٹ کر سکتے ہیں۔ اب بھلا ایسی کسی بیماری کو وہ بے چارہ ڈاکٹر کیا کچل پاتا۔

اس رات بھی مجھے شدید بخار تھا، لیکن میں نے خیر و کوٹنگ لگانے کا کہا اُس نے میری طبیعت کے پیش نظر کچھ ریت واصل سے کام لیا تو نہیں دوسرے تانگے کی طرف بڑھ گیا۔ مجبوراً خیر و کوٹ ہی اپنا تانگہ آگے بڑھا تا پڑا۔ میں مسد کے قریب پہنچ کر اتر گیا۔ راستے میں خیر و کوٹ نے اپنی بڑی سی پٹاری شال مجھے ڈیر دیتی اوڑھادی تھی۔ میں اندر جا کر ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ مولوی عظیم حسب معمول اپنے وقت پر پہنچے اور نماز پڑھوائی۔ نماز کے بعد حسب معمول درس اور پھر سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ مولوی صاحب کی نظر بھر بھر کچھ جلی صاف میں بیٹھے ہوئے مجھ پر پڑی اور پھر وہ سوال کرنے والے نو جوان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نو جوان نے پوچھا۔

"مولوی صاحب۔۔۔ یہ بتائیے کہ ہمارے مذہب میں محبت کی شادی کی گنجائش ہے یا نہیں۔"

بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن انہوں نے مجھے دیکھے بھلا اس نو جوان کو جواب دیا۔

”محبت شادی کے بعد میاں بیوی میں اٹھو بھی چائو ہے۔ اس کے علاوہ دوسری قسم کی محبت چائو نہیں ہے۔“ نوجوان کی تسلی نہیں ہوئی۔

”لیکن مولوی صاحب ہمارے مذہب میں لڑکی سے سوال کرنے کی گنجائش تو ہے۔ ہمیں تو سننا ہے کہ شادی سے پہلے لڑکی لڑکے کے ایک دوسرے کی جھلک دیکھنے کی بھی اجازت دی گئی ہے۔ مطلب لڑکی اور لڑکے کی پسندیدگی ضروری ہے۔“

”مولوی صاحب نے سختی سے کہا۔“

”ہاں اگر ضرورت پڑے تو کسی حد تک اس کی اجازت ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں وہی شادیاں کامیاب ہوتی ہیں جو والدین کی مرضی سے طے پا جائیں۔ تاہذا فیصلہ ایک کزور، نا سمجھ اور نامعزز لڑکی پر چھوڑنا دانش مندی نہیں ہے۔ دنیا کے کوئی ماں باپ جان بوجھ کر اپنی معصوم بیٹی کو کسی غلط شخص کے ساتھ کیوں باندھنا چاہیں گے۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ یہ فیصلہ لڑکی کے ماں باپ یا اس کے بڑوں پر ہی چھوڑ دیا جائے۔“

مولوی صاحب نے بڑی تفصیل سے جواب دے دیا تھا تو جوان تو شاید مطمئن ہو ہی گیا ہو لیکن جانے اس ایک پل میں مجھے کیا ہوا۔ میں کئی ہفتوں سے یہاں آ رہا تھا اور اس عرصے میں کبھی نہیں نے مولوی صاحب کے سامنے زبان نہیں کھولی تھی لیکن اس روز نہ جانے میں کیوں بول پڑا۔ مولوی صاحب محفل سمیٹ کر اٹھنا ہی چاہو رہے تھے کہ میری آواز سن کر کبھی چونک کر رُک گئے۔

”مولوی صاحب کسی بھی لڑکی کے لیے اس کے ماں باپ کو رشتہ طے کرتے وقت لڑکے میں کن شرعی باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔“

کچھ دیر کے لیے مولوی صاحب چپ سے رہ گئے۔ لیکن باقی نمازیوں کی وجہ سے انہیں جواب دینا ہی پڑا تھا۔

”تمام شرعی باتوں کا مذہب بکھر نماز، روزہ، حسب نسب بھی کچھ۔“

”لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے مولوی صاحب کہ رشتہ مانگتے وقت کوئی اتنا ہی مذہبی ہو نہ کا ڈھونڈ کر باہر بھٹا لڑکی کے گھر والے اس سے توقع کرتے ہوں۔“

”ایسی صورت میں یہ دھوکا ہوگا۔۔۔ اور دھوکے کا مذاق اس شخص کو بگھٹنا ہوگا۔“

”میں پانچ وقت کا نمازی ہوں مولوی صاحب۔۔۔ چھ کلمے بھی مجھے یاد ہیں اور مذہب جو شرعاً نہ لگتا ہے کسی مسلمان لڑکی سے شادی کے لیے نہیں ان سب پر پورا اُترتا ہوں۔ دُعا کریں کہ میں جس گھر میں رشتہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہاں میرا رشتہ طے ہو جائے۔“

میری بات سن کر اس پاس بیٹھے نمازی زیر لب مسکرا دیے۔ مولوی صاحب نے باڈی ٹو اسٹریٹ سی سی، پڑھا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ دُعا ختم ہوئی اور لوگ اُٹھ کر وہاں سے چل دیے۔ میں اور مولوی صاحب پیچھے تیار رہ گئے۔ انہوں نے مجھ سے میری طرف دیکھا۔

”میں جاننا تھا کہ تم یہ سب کچھ کس رکھادے کے طور پر کر رہے ہو، تمہارا اصل مقصد کچھ اور ہے اور آخر کار آج تمہارے دل کی بات زبان پر آئی گئی۔“

”آپ کون ہوتے ہیں کسی کی عبادت کے بارے میں حتی فیصلہ دینے والے۔ یہ تو بندے کا اپنے خدا کے ساتھ براہ راست معاملہ ہوتا ہے۔ آپ یا نہیں یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ دکھا دے؟ اور آپ کو تو دوسروں کے دکھاوے کو بھی جتن مان کر ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ کون جانے

یہی دکھاوا کسی کو کسی دن سیدھی اور سچی راہ پر لاکھڑا کر دے۔"

مولوی صاحب کچھ لاجواب سے ہو گئے۔ انہوں نے بات کا رخ بدل دیا۔

"تم چاہتے کیا ہو۔ آخرا اس طرح سے بار بار میرے سامنے آنے کا تمہارا کیا مقصد ہے۔"

"آپ میرا مقصد جانتے ہیں، آپ نے اس دن مجھے میری لادنی کا احساس دلایا تھا۔ حالانکہ اس کم مذہبی میں بھی میرا اپنا سارا قصور نہیں تھا۔ مجھے بچپن کے بعد کسی نے ان باتوں کا احساس ہی نہیں دلایا۔ بہر حال۔۔۔ چاہے دیر سے ہی سہی۔ لیکن اب میں آپ کی مذہب کی لگائی ہوئی شرط پر بھی بہت حد تک پورا اترتا ہوں۔ اگرچہ کبھی روٹی ہے تو نہیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اسے بھی پورا کروں گا۔"

مولوی صاحب غصے سے پھٹ پڑے۔

"میاں تمہاری سمجھ میں جانے یہ بات کیوں نہیں آتی کہ ہمارا در تمہارا کوئی میل نہیں ہے۔ میں اپنی بیٹی کو اس گھر میں بٹانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"میرا اب اس گھر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ درخواست میں اپنی ذاتی حیثیت میں کر رہا ہوں۔"

مولوی صاحب کی آواز بھرا ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کی کوشش کی اور روتے ہوئے لمبے میں بولے۔

"کیوں میری برسوں کی کٹائی ہوئی عزت کے در پہلو۔ جب تھیں اس سہر میں یا اپنے محلے کے آس پاس بھی دیکھتا ہوں تو ساری ساری راست گھر سے مجھے نیند نہیں آتی۔ لوگوں کی زبان اگر ہل پڑے تو بھرا سے رو کر کتنا ناممکن ہوتا ہے۔ میری بچپن پر اگر کوئی تہمت لگ گئی تو ساری عمر میں باپ کی دلیر پر جتنی بھڑی ہو جائیگی۔ ہمارے غریبی پر کچھ دم کرو۔ یہ چھوٹا سا شعر ہے اور اس سے بھی چھوٹا ہمارا معاملہ ہے۔ یہاں بات پھیلنے دیر نہیں لگتی۔ پہلے ہی تمہارے گھر کے نوکروں نے اس دن طرح طرح کی چٹکونیوں کی تھیں۔۔۔ وہ تو بھلا ہوشا کر کا۔ جس نے ان کی زبان وہیں روک دی۔ ورنہ تمہاری ماں اور بھائی نے مجھے سو لی پرائیڈا کے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ بہر حال جو بوا سو ہوا۔ لیکن میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

"آپ یہ تصور بھی کیسے کر سکتے ہیں کہ میں بھی ان جانے میں بھی آپ کی کسی بھی طرح کی بدنامی کا باعث بن سکتا ہوں۔"

"تو پھر میں تم سے دو بارہ بھی اچھا کرتا ہوں کہ اس خیال کو اپنے دل سے نکال دو۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔"

مولوی عظیم کی آواز آنسوؤں کی لرزش سے لہر بھر کو کانچی اور ایک ہل سی میں وہ میرے گھٹنوں کے قریب دوڑا تو کر بیٹھ گئے اور روتے ہوئے انہوں نے میرے سامنے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔

میں چند لمحوں کے لیے ٹوٹن ہو کر رہ گیا۔ یہ انہوں نے کیا کر دیا۔ میں نے تڑپ کر ان کے بندھے ہاتھ اپنے گھٹنوں میں جکڑ لیے۔ مولوی عظیم کی اب باقاعدہ دردور کچھکچیاں بندھ گئی تھیں۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے مجھے حیدر گناہ گار اور شرمندہ نہ کریں۔ میرا مقصد ہرگز آپ کا دل دکھانا نہیں تھا۔ میں تو۔۔۔۔۔"

ان کی حالت دیکھ کر مجھے میں اپنے لفظ ہی کھو بیٹھا تھا۔ میری بات کاٹ کر بولے۔



## جیوری کا فیصلہ

میں نہیں جانتا کہ سارہ کو انکوائری کمیٹی نے گواہی کے لیے بلایا یا نہیں، لیکن میں دن کے اندر انکوائری کمیٹی نے اپنا فیصلہ نوٹس بورڈ پر چکا دیا۔ مجھے اور ہم (۱۲۱ آئی) دونوں کو ایک ایک سمسٹر کے لیے یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا تھا۔ ایک سمسٹر کا مطلب چھ مہینے کا تھا۔ ابدت ہمیں موقع دیا گیا تھا کہ ہم اس فیصلے کے خلاف یونیورسٹی انتظامیہ سے اپیل کر سکتے تھے۔ لیکن میں دن کے اندر اس کے بعد ہم یہ حق بھی کھودیتے۔

اس دوران میرا اور جم کا ایک آدھ بار یونیورسٹی کیمپس میں سامنا ہوا۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی حشر یہ مسکراہٹ ابھرا آئی تھی۔ جیسے اس کا مقصد پورا ہو گیا ہو۔ جم جیسے لڑکوں کے لیے چھ مہینے کی معطلی صرف ایک پلنگ تھی۔ اس کا مقصد کسی بھی طریقے سے مجھے یہاں سے باہر نکالنا تھا۔ مجھے تو اب یونیورسٹی انتظامیہ بھی اس کی سازش میں برابر کی شریک دکھائی دے رہی تھی۔ یہ گورے ہر کام بہت سوچ بچھ کر اور طریقے سے کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ یہاں کا قانون اس قدر سخت ہے کہ مجھے بغیر کسی انکوائری کے یونیورسٹی سے نکال دینے میں انہیں اس بات کا خدشہ ہوگا کہ میں کہیں عدالت کا دروازہ نہ کھٹکنا دوں۔ اس لیے انہوں نے پکا انتظام کیا تھا اور اپنی ایمان داری اور انصاف ظاہر کرنے کے لیے انہوں نے جم کو بھی قربانی دینے پر تیار کر لیا تھا۔

پہلی یونیورسٹی میں میرے واحد ٹیکسٹ صرف جوزف اور ریکارڈ تھے۔ ریکارڈ کے تو آسٹریائی نہیں رک پارہے تھے۔ میں اُسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا کہ ابھی حتیٰ فیصلہ ہوتا باقی ہے لیکن وہ ریکارڈ ہی کیا جو کسی کی بات مان لے۔

آج یونیورسٹی میں اپیل داخل کرانے کا آخری دن تھا، ورنہ کل سے مجھے یہ کیمپس چھوڑ دینا تھا۔ میں سیدھا لائن کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اندر کمیٹی کے چاروں ارکان موجود تھے۔ سر آنزک نے دوبارہ مجھے تمام رو داؤ پڑھ کر سنائی اور یہ بھی بتایا کہ یونیورسٹی انتظامیہ میرے تحریری جواب سے مطمئن نہیں ہو پائی لہذا میرے ایک سمسٹر کے لیے معطلی کا فیصلہ برقرار رکھا گیا ہے۔ میں نے براہ راست سر آنزک کی آنکھوں میں دیکھا لیکن وہ نظر پڑا گئے، میں ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”آج قطعاً کا دن ہے۔۔۔ اور میں جانتا ہوں کہ چیئر مین انکوائری کمیٹی مسٹر آنزک کے لیے یہ کس قدر مقدس دن ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ آج کے دن کوئی جانبدارانہ فیصلہ نہیں کریں گے۔“

ہفتہ بچوں کے لیے دیوانی مقدس دن ہوتا ہے، جیسا امارے لیے جمعہ، مسٹر آنزک میرے اس طرز کو سمجھ گئے اور غون کے کھونٹ پی کر رہ گئے۔ جیوری نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے مزید اپنی صفائی میں تو کچھ نہیں کہنا۔ میں نے انکار میں سر ہلایا۔ جیوری نے فیصلے پر دھچکا کے لیے اپنے اپنے قلم اٹھا لیے۔

پھر اچانک ہی دروازہ کھلا اور سارہ کسی آندھی کی طرح اندر داخل ہوئی۔ سر آڑک نے ناگواری سے اُسے دیکھا۔

”مس سارہ۔۔۔ کیا آپ نہیں جانتیں کہ آج ڈین آفس میں روزانہ کے معمولات نہیں نپٹائے جا رہے۔ آج یہاں ایک اہم انکوائری کا فیصلہ بنایا جا رہا ہے۔“ سارہ نے جلدی سے اپنی سانس درست کی۔

”میں بھی اسی انکوائری کے سلسلے میں جیوری کی مدد کرنے آئی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرا بیان کیمٹی کو صحیح نتائج اخذ کرنے میں مدد دے گا۔“ سر آڑک کا مس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سارہ کو کسی بھی طریقے سے کمرے سے باہر بھجوا دیں۔ لیکن بات چونکہ دوسرے ممبران پر بھی کھل چکی تھی لہذا انہیں مجبوراً سارہ کو برداشت کرنا پڑا۔ انہوں نے پھر بھی حتیٰ لچھے میں کہا اور اس بار ان کے لچھے میں شدید غصہ تھی۔

”میں نہیں سمجھتا مس سارہ کہ اس موقع پر کسی مزید بیان کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ مسٹر حاد خود اپنا قائل بیان دے چکے ہیں۔ اور ہم نے فیصلہ بھی سنایا ہے اس فیصلے پر حارے دستخط ہونا باقی ہیں۔“

سارہ شاید ان کے لچھے میں جھجکی دھمکی کو محسوس کر گئی۔ اُس نے بھی حتیٰ لچھے میں ہی کہا۔

”کوئی بھی فیصلہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک انصاف کے تمام تقاضے نہ پورے کیے جائیں۔ میں اس واقعے کی یقینی گواہ ہوں اور مجھے آج تک کیمٹی نے یہ بھی نہیں بتایا کہ مسٹر حاد نے میرا نام بالور گواہ کیمٹی کو پیش کیا تھا۔۔۔؟۔۔۔ بہر حال میں یہ بیان دینے آئی ہوں کہ اس تمام واقعے میں مسٹر حاد کو کوئی قصور نہیں ہے۔ ہم نے ہی جھگڑا شروع کیا تھا اور میرے سامنے حاد کو یونیورسٹی سے نکل جانے کے لیے کہا تھا۔ جواب میں حاد نے جم سے کچھ نہیں کہا۔“

سر آڑک کا مس چلنا تو اسی وقت سارہ کو وہاں سے غائب کر دیا۔

سارہ نے اپنے ہاتھ میں چوڑی کاغذ کی ایک لمبی سی فہرست لہرائی۔

”بیان چالیس طلباء کی فہرست ہے جن کے سامنے یہ سارا واقعہ اس دن پیش آیا تھا۔ یہ سب بھی اس وقت میرے ساتھ ہی آئے ہیں اور آپ کے آفس کے باہر اپنا بیان ریکارڈ کروانے کے جمع ہو چکے ہیں۔ اگر کیمٹی اجازت دے تو ان سب کا بیان بھی ریکارڈ کیا جاسکتا ہے۔“

گویا سارہ پورا انتظام کر کے آئی تھی۔ سر آڑک کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اپنی کیفیت پر قابو پایا۔

”نہیں۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں ہے، ان بدلے ہوئے حالات میں کیمٹی کو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنا ہوگی، جیوری ممبرز کی کاروائی ہے۔“ تمام جیوری کے ممبران نے یہ بات تسلیم کی کہ سارہ کے بیان کے بعد صورت حال بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ لہذا نظر ثانی کے لیے انہیں تین

دن کی مہلت دی جائے۔ سر آڑک کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ بازی ہار چکے ہیں۔ مجھے ہانے کی اجازت دے دی گئی اور جب مئیس ڈین کے کمرے سے باہر نکلا تو میری چوری کلاس اور یونیورسٹی کے اور بہت سے طلباء وہاں میرے انتظار میں اکٹھے تھے۔ سارہ نے جب انہیں بتایا کہ میرے خلاف فیصلہ واپس لے لیا گیا ہے تو سب سے پہلے چلانے اور نعرہ لگانے والی رہی تھی۔ پھر اس کے بعد تو وہ شور مچا کہ اندر سے سر آڑک کا



پہلے۔ گھبرا کر باہر نکل آیا اور سب کی منت کرنے لگا کہ ہم یہاں سے فوراً چلے جائیں کیونکہ سرانژک ناراض ہو رہے ہیں۔ دیر کاٹنے فوراً ہی پوری یونیورسٹی کو اسی وقت ایک بڑی فریٹ دینے کا اعلان کر دیا۔ بتول اس کے اس کے باپ کے اسٹرپٹین پاؤڈر کس دن کام آئیں گے۔ سب لوگ ہنسنے شور مچاتے کیونکہ میریا کی طرف چل پڑے لیکن سارہ خاموشی سے دوسری جانب چلے گئی۔ میری نظر اس پر تپ پڑی جب وہ مرکزی عمارت سے باہر جانے والی راہداری میں غور رہی تھی۔ نہیں فوراً اس کے پیچھے پکا۔ تب تک وہ کافی آگے جا چکی تھی۔

”سارہ۔۔۔۔۔ میری بات سلو۔۔۔۔۔ بلیچر رو۔“

وہ پھر گئی، نہیں اس کے قریب پہنچا۔

”شکر ہے۔“

”کس بات کا۔“

”میرا ساتھ دینے کا، آج اگر تم وقت پر نہ آتیں تو کس میرے خلاف پیار ہوتا۔“

”میں نے تمہارا انٹیم جگ کا ساتھ دیا ہے۔ اس میں شکر ہے کی کوئی بات نہیں۔“

”اس دن میں جگ کا ساتھ دینے والے کم ہی لوگ رہ گئے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم بھی ان میں سے ایک ہو۔“

سارہ ہلکے سے مسکرائی۔ ”تو پھر خدا کا شکر یہ ادا کر کہ اس نے ان تائب لوگوں میں سے ایک سے تمہاری ملاقات کروا دی۔“

”نہیں، ابھی اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔“

”تمہیک کہتی ہو۔ لیکن وہ شکر یہ نہیں اس سے اس کیلے میں کہہ دوں گا۔ فی الحال تمہارا شکر ہے۔“ نہیں پٹا اور داجس جانے لگا۔ سارہ نے کچھ سوچ کر مجھے آواز دی۔

”مجھے ایک بات کچھ نہیں آئی۔ تم نے انکو انری کے سامنے کو اسی کے لیے میرا نام کیوں دیا۔ نہیں تو خود ان میں سے ایک تھی جو تم سے جھگڑ رہے تھے۔“

”پتہ نہیں کیوں۔۔۔۔۔ مجھے تم ایک عجیب لگی ہو، سوچا کہ ایک بار اپنا یہ بھرم بھی آزمایا لوں۔“

سارہ ہنسی، پہلی مرتبہ مجھے پتہ چلا کہ ہنسنے سے اس کے گالوں میں دو نٹے سے گڑے پڑ جاتے ہیں۔

”واہ۔۔۔۔۔ بہت خوب۔۔۔۔۔ کیا موقع دھوڑا ہے جناب نے اپنے بھرم آزمائے۔ کا نہیں اگر وقت پر نہ پہنچی تو۔۔۔؟“

”میرا جگ پر سے تعین اٹھ جاتا۔“

سارہ نے غور سے میری طرف دیکھا۔

”کافی خطرہ تک لگتے ہو،“ وہس بومیسٹ آف لک۔ Wish you best of luck۔

سارہ ہنسی ہوئی وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ یہ ہماری دوستی کا پہلا دن تھا۔ بعد میں دیر کاٹنے مجھے بتایا کہ سارہ کو انکو انری کیسٹلی نے کو اسی کے

لیے طلب ہی نہیں کیا تھا۔ نہ ہی اس نے خود اس کی ضرورت محسوس کی تھی کیونکہ جم بہر حال اس کا بہت بڑا نا اور سب سے اچھا دوست تھا۔ لیکن جب ریکا تے سارہ کو یہ بتایا کہ خود نہیں نے انکو اعز کی کیمپنی کے سامنے سارہ کا نام بطور گواہ دیا ہے تو وہ چند لمحوں کے لیے تو سن ہو کر ہی رہ گئی تھی۔ اُسے بالکل بھی توقع نہیں تھی کہ میں اسی پر یہ سارا معاملہ ڈال دوں گا۔ ریکا کو اب تک اس بات پر حیرت تھی کہ سارہ میرے حق میں گواہی دینے پر کیسے راضی ہو گئی۔ نہ صرف خود بلکہ اس نے آدھی یونیورسٹی کو بھی اس بات کے لیے راضی کر لیا تھا۔ ریکا سے ہی مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ سارا عزتک سارہ سے اس بات پر اس قدر ناراض ہوئے کہ کئی دن انہوں نے اس سے بات ہی نہیں کی۔ جانے سارہ نے اس سارے معاملے کو کس طرح سے نپٹایا ہوگا۔ واقعی وہ ایک بہادر لڑکی تھی۔

تیسرے دن کیمپنی نے مجھے اور جم دونوں کو ڈین کے کمرے میں بلایا اور بتایا کہ میرے خلاف کوئی الزام ثابت نہیں ہو سکا لہذا مجھے بری کیا جا رہا ہے، جبکہ جم کو ایک سہمسٹر کے لیے یونیورسٹی چھوڑنی پڑے گی۔ اس کے بعد بھی یونیورسٹی انتظامیہ اُسے واپس لینے سے پہلے کیمپنی بٹھائے گی۔ جم کا چہرہ دلکھ گیا۔ نہیں نے ڈین سے کچھ کہنے کی درخواست کی۔ ڈین نے اجازت دے دی۔

”سر میری جم سے کوئی ذاتی جگہ نہیں ہے۔ اس دن میں شاید اس کی بات ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پایا جب کہ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ جم اور ڈیوڈ کا ایک سنجیدہ قسم کا مذاق تھا۔ لیکن رد عمل اس چیز سے ہوا کہ ہم میں سے کسی کو کبھی سٹیبلن کا موقع ہی نہیں ملا۔ نہیں جیوری سے درخواست کرتا چاہتا ہوں کہ اتنی معمولی بات کے لیے جم کو یونیورسٹی سے خارج نہ کیا جائے۔ ہم دونوں کو اس مذاق کے لیے بھاری جرمانہ نہ کر دیا جائے تو بھی اہم اسے انتظامیہ کی مہربانی سمجھیں گے۔“

جم حیرت سے میری طرف دیکھتا رہا۔ جیوری نے میرے ”بچ“ کی تعریف کی اور ہم دونوں کو ایک صبر سے بعد کلاس لینے کی اجازت دے دی گئی۔ جم کو کچھ کاغذوں پر دیکھنے کرنے کے لیے روک لیا گیا اور میں ڈین آفس سے نکل آیا۔

اگلے دن نہیں کلاس روم میں چٹھا ہوا تھا۔ فیسی میڈیم اکٹاس کس کا گچھرو دے رہی تھیں کہ جم کلاس میں داخل ہوا۔ وہ ویسے بھی کلاس میں آنے جانے کے لیے کبھی اجازت لینے کا کلف نہیں کرتا تھا۔ وہ سیدھا میری طرف بڑھا اور میرے ڈیسک کے قریب خاموش کھڑا ہو گیا۔ ساری کلاس کو سناپ سوگھ گیا۔ خوفی میڈیم کی آواز بھی حلق سے نکلی نکل پاری تھی۔ کچھ دیر وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر گھورتا رہا۔ کلاس پر سنا چھایا ہوا تھا۔ ریکا نے میرا ہاتھ دوسرے تمام رکھا تھا۔ پھر جم نے ہاتھ دیکھ کر کہا کہ اتنا میری طرف بڑھا کر پھینکا دیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ تمام لیا۔ جم نے مجھے سمجھنے کر گئے لگا لیا۔ ساری کلاس نے ڈیسک ہما ہما کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ ریکا تے جانے کہاں سے سینی مارنا سیکھ لی تھی۔ اُس کی بیٹیاں کلاس میں گونجتی رہیں۔ میری نظر سارہ پر پڑی وہ ڈور ٹیبل میسرارہی تھی میرے دل نے کہا۔ ”محبت تاج عالم۔۔۔“

☆☆☆

## بے خودی

جب مجھے ہوش آیا تو دن کا اجالا کیل چکا تھا۔ لیکن یہ جگہ تو میرے لیے کچھ غیر مانوس سی تھی۔ میں کچھ دیر تک گم سم سا لیٹا یا دکر نے کی کوشش کرتا رہا کہ میں کہاں ہوں۔ رات کو تو خیر مجھے تانگے میں لا دکر اسٹیشن کے لیے ہی لٹکا تھا۔ پھر یہ کشادہ سا کمرہ صاف سترا ہوا، اُچلے اُچلے سے پردے اور بڑے بڑے سے روشن دانوں اور کھڑکیوں والا ٹین کی سیون ٹائپ چھت والا کمرہ کس کا تھا؟

کچھ فاصلے سے ٹرین کا بھونپو بھا اور ٹی ٹی کی سیٹی سنائی دی۔ مطلب یہ جگہ اسٹیشن کے قریب ہی تھی۔ پر یہ کس کا کمرہ ہے؟ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن سر اٹھاتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میرے سر کی جگہ لوہے کا کوئی بھاری گولہ میرے کندھوں کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہو۔ میں ایک کمرہ کے ساتھ سر پکڑ کر دوبارہ ڈے سا گیا۔ میری آواز سن کر باہر کچھ آہٹ ہوئی اور پھر صدیقی صاحب ہاتھ میں کچھ گولیاں اور جوس کا گلاس لیے اندر داخل ہوئے۔ مجھے اٹھنے دیکھ کر انہوں نے جلدی سے مجھے کا ندھے سے پکڑ کر دوبارہ لٹا دیا۔

”لپٹے رہو۔۔۔ ابھی تمہاری حالت پوری طرح مستحکم نہیں ہے۔“

”لیکن سر میں۔۔۔ یہاں۔۔۔ کیسے؟“

”میاں تم خود تو کبھی کچھ بتاتے نہیں ہو۔۔۔ جانے سارا اور وہودی سینے کی یہ کیا خند ہے تمہاری۔ پر تمہارا ابھی قصور نہیں ہے۔ شاید یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔“ انہوں نے مسکرا کر دو گولیاں میرے منہ میں ڈال کر زبردستی آدھا گلاس پانی میرے قلعے سے نیچے اتار دیا۔ مجھے انہیں یوں اپنی خدمت کرتے دیکھ کر بڑی شرمندگی ہوئی۔ میں نے پھر اٹھنے کی کوشش کی۔

”سر میں اب ٹھیک ہوں۔ پر میں یہاں آیا کیسے؟“

انہوں نے تکیے میری پشت پر سیدھا کر کے مجھے ٹیٹھنے میں مدد دی۔

”خیر تو جیسے شدید بخار اور جذبات کی کیفیت میں تین دن پہلے رات کو یہاں اپنے تانگے پر ڈالے لایا تھا۔“

میں اچھل ہی تو پڑا۔

”تین دن پہلے۔۔۔ لیکن میں تو کل رات۔۔۔“

”ہاں میاں۔۔۔ تم تین دن تک تقریباً بے سدھ ہی بخار میں پڑے سڑتے رہے ہو۔ میں نے سو چار لٹے کے ہسپتال سے بھرتے کہ

یہیں گھر ہی تمہاری گنجائش کی جائے۔ ڈاکٹر روزانہ تین دفعہ آتا رہا ہے۔ شکر ہے کہ آج صبح سے بخار کچھ لوٹا ہے۔ لیکن ابھی تم کو آرام کی شدید ضرورت ہے۔ لہذا کسی بھی قسم کی ضد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جب تک ٹھیک نہ ہو جاؤ یہاں سے ہٹنے کی کوشش نہ کرنا۔“

یا خدا۔۔۔ میں تین دن سے اس بیماری کی حالت میں یہاں اس شریف انسان پر بوجھ بنا رہا ہوں۔ مجھے اپنی کیفیت پر قصداً آگیا۔ میں نے انہیں اتنی تکلیف پہلے ہی دے دی تھی۔ اب مزید نہیں۔

”سر آپ یقین کریں نہیں اب یا نکل لے لیک ہوں۔ پہلے ہی تین دن آپ اور آپ کے گھر والوں پر بوجھ بنا رہا ہوں۔ مجھے مزید غمزدہ نہ کریں۔“

”میاں پہلے تو یہ بوجھ والی بات دہاں لے لو۔ دوسری بات یہ کہ میں اس گھر میں آگیا ہی رہتا ہوں۔ بیوی سے حراج مل نہیں پایا لہذا وہ سال میں دس مہینے سیکے میں ہی گزارتی ہیں۔ اولاد کوئی ہے نہیں۔ بس میں ہوں اور گھر کے دو چار لوگ ہیں۔ خوب مزے میں کٹ رہی ہے۔“

وہ دھڑکے سے مسکرائے۔

”ویسے بھی آدی بھاشاوی کے تہار ہے تو اتنا مزہ نہیں آتا بھنا شادی کے بعد بیوی کے بچے جا کر بننے کی صورت میں تہائی میسر آنے کے بعد آتا ہے۔ یقین نہ آئے میری بات پر تو شادی کے بعد بیوی کو بچے بھیج کر کبھی تہار کرو دیکھنا۔“

میں بھی مسکرا دی۔

”آپ کی بڑی مہربانی ہے سر۔۔۔ لیکن میں اس طرح یہاں کیسے رہ سکتا ہوں۔ میں جانتا ہوں میں آپ کی تہائی میں نکل ہوتا رہا ہوں۔“

”اے یار تہائی تو اپنی ختم ختم کی ساقھی ہے۔“ وہ بھی میرے ساتھ رہتے رہتے کبھی کبھی آگے آتی جاتی ہے۔ اس کی تم ٹکر نہ کرو۔“

”میری لاکھ خدمت کے باوجود مصدیقی صاحب نے مجھے اس گھر سے تو کیا اس گھر سے بھی باہر نہیں نکلنے دیا۔ البتہ شام کو جب نوکرنے پر آدے میں چائے لگ جانے کی اطلاع دی تب وہ مجھے لیے برآمدے میں آ گئے۔

کوئٹہ میں ریڈیو اسٹیشن کے سامنے سے ہوتی ہوئی فیک ڈیلی سڑک آگے جا کر بائیں ہاتھ کو ایک مرکزی سڑک سے مل جاتی ہے۔ اسی سڑک سے ملی ہوئی ہے یہ خطی سڑک جسے عرف عام میں کالون روڈ کہتے ہیں۔ اسی خطی سڑک پر ریڈیو کے چنگے بنے ہوئے ہیں۔ صدیقی صاحب کا چوہا سا بگڑ بھی انجی میں سے ایک تھا۔ ریڈیو کی مخصوص برٹش دور کی طرز تعمیر والے سرخ فلن کی چھت والے یہ چنگے خاص طور پر کوئٹہ کے موسم کو مد نظر رکھتے ہوئے انگریزی ران میں تعمیر کیے گئے تھے۔ کمروں کے باہر برآمدہ جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر مخصوص لکڑی کے ہنر رنگ کیے ہوئے ستون، برآمدے کو کھاتے ہوئے تھوڑے برآمدے کے سامنے کشادہ سا پاٹھیج جس میں انارہ انگو، سیب اور ناشپاتی کے درخت اور بے تماشا پھول لگے ہوئے تھے۔ صدیقی صاحب کافی اعلیٰ ذوق معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے چائے کا کھونٹ لیتے ہوئے غور سے میری طرف دیکھا۔

”اپنی بے ہوشی کے جذبات میں تم بہت کچھ بولتے رہے ہو۔ لیکن اس میں سے زیادہ تر باتیں تم اردو میں نہیں بلکہ انگلش میں کر رہے تھے۔ شاید تم اپنے گھر میں زیادہ اردو نہیں بولتے تھے؟“

جس بات کا مجھے ذرا تھا صدیقی صاحب نے وہی بات آخر بوجھ لی۔ میں پہلے ہی یہ سن کر چونک گیا تھا کہ میں تین دن بے ہوشی کے عالم میں یہاں پڑا رہا ہوں جانے اپنے جذبات میں کیا کیا بک گیا تھا نہیں۔۔۔۔۔؟

میں چشمے پہنپ رہا صدیقی صاحب نے بات جاری رکھی۔



رہے انٹیشن کے پلیٹ فارم پر میرے پہنچنے ہی سب کو خبر ہو گئی اور وہ سب میرے آس پاس یوں جمع ہوتے گئے جیسے شہد کے جھنڈے پر کھیاں۔۔۔۔۔

سب ہی کو فردا فردا یقین دلانا پڑا کہ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ ان میں سے کئی تو مجھ سے یوں پر تپاک انداز میں گلے ملنے رہے جیسے میں کسی محاذ جنگ سے واپس لوٹا ہوں۔ پھر مجبوراً غفور سے کوہ اعلیٰ کرنا پڑی اور اس نے اپنی گرت وار آواز میں سب کو حکم دیا کہ باوجود ان کی طبیعت اب بھی مشکل سے سنبھلی ہے۔ اگر سب میرے گرد یوں ہی جمع رہے تو مجھے آرام کا موقع نہیں ملے گا لہذا فی الحال سب مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ غفور نے کا حکم مانا کسی کے بس کی بات نہیں تھی، لہذا ہمیں رفتہ رفتہ چھٹ ہی گئی۔ غفور نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے پیٹنے پر ہٹا دیا اور غور میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

”میں جانتا تھا ہاؤ۔۔۔۔۔ تم زیادہ دن صدیقی صاحب کے گھر نہیں آؤ گے۔ اور سیدھے نہیں واپس آؤ گے۔ تم اس گھر کا آرام اور سکھ زیادہ دن برداشت نہیں کر پاؤ گے، قصص اب بے آرمی اور بے سکونی میں ہی سکھتا ہے۔“

وہ شاید میرے صدیقی صاحب کے گھر سے واپس چلے آنے پر فضا تھا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”ماراض ہو؟“

”جائے دے ہاؤ۔۔۔ اپنی ٹامہ کسی کام کی۔ ٹوٹے غفور کے کچھی اپنا سمجھا ہی نہیں، اور نہ اس مولوی والی بات کو مجھ سے نہ چھپاتا۔“

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں ہاؤ۔۔۔ خیر داتا تھے دالے نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ اس دن جب تم بتاؤ میں اس مسجد میں اندر گئے اور پھر بہت دیر تک باہر نہیں نکلے تو خیر دگھبرا کر تمہارے پیچھے اندر مسجد میں گھس گیا تھا کہ کہیں تمہاری طبیعت زیادہ خراب نہ ہو گئی ہو۔ پر اندر جانے سے پہلے ہی اس نے تمہاری اور مولوی صاحب کی باتیں سن لی تھیں۔ پر خیر وہی یاروں کا پارہ ہے۔ اس نے یہ باتیں اور کسی کو نہیں بتائی ہیں۔ وہ قصص صدیقی صاحب کے گھر چھوڑ کر سید صاحب سے پاس آیا تھا۔ شاید وہ مجھے کچھی سمجھ نہ سکتا تھا۔ پردہ تیری حالت دیکھ کر بہت پریشان ہو گیا تھا کہ خدا غور سے کہیں تجھے کچھ ہو ہی نہ جائے۔ اگر ایک آدھ دن مزید تیری حالت نہ سدھرتی تو ہم سید سے تیرے گھر چلے جاتے بتاتے کے لیے۔“

میں پھر حیرت سے دھونکا۔

”میرے گھر۔۔۔؟“

”ہاں ہاؤ۔۔۔ خیر دے سن لیا تھا جو بھی اس مولوی نے کہا تھا۔ خوات صاحب کا بیٹا ہے، ہمیں سب پتہ چل گیا ہے۔“

شاید غفور اکشر صاحب کو ہی لاٹ صاحب کہہ رہا تھا۔ مولوی صاحب نے اس دن مجھ سے کہا تھا کہ تم جہاں بھی جاؤ گے اکشر کے بیٹے ہی کہلاؤ گے۔ مطلب میرا راز کھل چکا تھا۔ شاید اب یہاں سے بھی میری رخصت کا وقت ہوتی چلا تھا۔ آج نہیں چلا تھا۔ سب لوگ میری اصلیت جان جائیں گے۔ مجھے اب یہاں سے چلے جانا چاہیے تھا۔ غفور غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے جیسے میرے خیالات پڑھ لیے۔

”لیکن خبردار جو تو نے اب یہاں سے کہیں اور جانے کا سوچا بھی تو۔ قسم مولائی، میں تجھے دہائیوں سے باندھ دوں گا اور سب کو بتا دوں گا

کہ یہ کون سا شہزادہ اٹھائے دن سے ہمارے بیچ رو رہا ہے۔"

مجھے غفور سے کی بات پر ہنسی آ گئی۔ اس نے فوراً میرے ہاتھ پکڑ لیے اور وہ اپنا سامنا ہو کر بولا۔

"دیکھ باؤ۔۔۔ تجھے میری دوستی کا واسطہ۔۔۔ اب یہاں سے گھٹن نہ چاہا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تیری کوئی بھی بات باہر نہیں نکلے گی۔

پڑو اگر یہاں سے چلا گیا تو غفور زندگی بھر اپنا چہرہ جس دن دیکھ پائے گا۔"

"تمہیک ہے۔۔۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔۔۔ لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔ میں روزانہ کی طرح اپنا سارا کام خود ہی کروں گا۔ تم مجھ

سے دوستی میں یا میرے گھر کی حیثیت کی وجہ سے کوئی خاص سلوک نہیں کرو گے۔ ورنہ میں ایک دن بھی یہاں نہیں رہوں گا۔" غفور نے غصے سے

میرے ہاتھ چوم لیے۔ پھر اس کی آنکھوں میں نمی کی لہر دوڑ گئی۔

"تو واقعی اس دنیا کا نہیں ہے، پر تیری محبت کی قدر یہاں کون جانے گا۔۔۔؟" تو بولے تو میں خود جا کر اس مولوی کے بیروں میں گر

جاؤں گا۔ ساری زندگی اس کی غلامی کروں گا۔ بس تو ایک بار رحم کرو۔"

"نہیں۔۔۔۔۔ یہ معاملہ ختم کا نہیں ہے۔ عرض کا ہے۔۔۔ میں نے بھی اپنی عرض ڈالی ہوئی ہے۔ اب سوائے انتظار کے اور کوئی چارہ

نہیں ہے۔"

غفور نے کی آنکھوں میں میرے لیے ایک خاص سی عقیدت درآئی تھی۔ وہ بہت دیر تک میرے پاس بیٹھا اور ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ کچھ

دیر کے لیے خیر دیتا تھے والا بھی آیا اور بہت دیر تک مجھ سے کچھ ل کر اس نے مجھے جکڑ رکھا۔ یہ غریب لوگ بھی ہڈیوں کے معاملے میں کہتے امیر

ہوتے ہیں۔ جس کسی کو ایک بار دل میں بٹھالیں تو پھر اس پر اپنا سب کچھ ٹھاد کر دینے کے لیے ہمدردی تیار رہے ہیں۔ بس شرط صرف اتنی ہی ہے

کہ کوئی ان کے دل کو چھو لینے والا ہونا چاہیے۔ خیر اور غفور سے دونوں نے میرے دل کی آرزو کی کو ٹھوٹا خاطر دیکھتے ہوئے دہارہ مجھ سے مولوی

صاحب یا میرے گھر والوں کی کوئی بات نہیں کی۔ بس اور ادھر کی بات کرتے رہے۔ وہ دونوں ایک معاملے میں ایک دوسرے کے حریف بھی تھے۔ دونوں

کا پسند یہ فلم ادا کا دلپ کمار تھا اور دونوں ہی ہمدردت خود کو دلپ کمار کا حقیقی پرستار ثابت کرنے کی جھڑپوں و کشش میں لگے رہے تھے۔

خیر ہمدردت کسی ایک فلم کا حوالہ دیتا تھا جس میں دلپ صاحب نے نائنگے بان کا کردار ادا کیا تھا اور خیر دیتا تھا کہ جس دن سے اس نے

وہ بلیک اینڈ وائٹ فلم دیکھی ہے جب سے وہ دلپ کمار کی طرح ہی تاکہ چلاتا ہے۔

وہاں غفور نے کو ایک ایسی فلم یاد تھی جس میں اس کے پسندیدہ ہیرو نے حذر دلیپز کا رول بالکل اسی طرح ادا کیا تھا جس طرح غفور خود

اصل زندگی میں تھا۔ عام طور پر جب یہ دونوں اکٹھے ہوتے تھے تو میں جان بوجھ کر دلپ کمار صاحب کی کوئی بات چھیڑ دیتا تھا جس کے بعد گفتگو ان

دونوں کی بحث جاری رہتی اور یہ بحث آخر کار دونوں کے اس دن کے جھگڑے کی صورت میں ختم ہوتی۔ اس دن بھی خیر و غفور نے یہ روٹھ کر چلا گیا کیونکہ

غفور نے اس سے کہہ دیا تھا کہ دلپ کمار جیسے بڑے اداکار کو تاکہ بان جیسا مسموم کردار ادا بھی نہیں کرنا چاہیے تھا۔

ہم دونوں خیر و کے اس بیڈ پاتی پن میں اُنکھ کر چلے جانے پر بہت دیر تک جھپٹے رہے۔ پھر اچانک جیسے غفور نے کو کچھ یاد آ گیا اور اس نے

اپنے ہی سر پر زور سے ایک چپت ماری۔

”دھت تیرے کی غفورے۔۔۔۔۔ پھر بھولی گیا تا۔۔۔۔۔“

میں نے حیرت سے غفورے کی جانب دیکھا۔

”کیا ہوا، کچھ بھول گئے ہو کیا۔“

”پاؤ تیرے آنے کی خوشی میں دیکھو جن سے ہی نکل گیا تھا۔ تیرے پیار پڑنے کے بعد پچھلے دنوں میں ایک واڑھی والا جھان ساڑ کا دو بار

تیرا پلچٹے ہوئے آکٹیشن آیا تھا۔۔۔۔۔ بھلا سا نام بتایا تھا اس نے۔۔۔۔۔“

غفورہ ماتھے پر ہاتھ رکھے نام یاد کرتے کی کوشش کرنے لگا۔ میرا دل اچھل کر مطلق میں آ گیا۔ میری زبان جیسے تالو سے چپک سی گئی اور منہ

نے سرسراہٹ سی آواز میں نام دہرایا۔

”عبداللہ“

غفورے نے خوشی میں زور سے تالی ماری۔

”ہاں۔۔۔۔۔ عبداللہ۔۔۔۔۔ یہی نام ہوا تھا اس نے۔۔۔۔۔ بڑا پریشان لگ رہا تھا۔ میں نے تیری بیماری کے بارے میں اسے بتا دیا

تھا۔ کل پھر آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ تجھے یہ پیغام دے دوں کہ ٹھیک ہوتے ہی شاکر صاحب سے مل لینا۔۔۔۔۔ شاید کوئی ضروری کام ہو؟

میرے ذہن میں جیسے دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ عبداللہ یہاں کیوں آیا تھا؟ اس نے مجھے شاکر سے ملنے کا کیوں کہا ہے؟۔۔۔۔۔

کہیں مولوی صاحب کی طبیعت۔۔۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ لیکن عبداللہ تو خود یہاں نہیں تھا۔ دو تو ایمان اور ان کے گھر والوں کو

لے کر چھ گیا تھا۔ اور جس دن میں مولوی صاحب سے آخری مرتبہ مسجد میں ملا تھا تب تک وہ واپس نہیں آیا تھا۔ میرا دل جانے کیوں ڈوبنے لگا

تھا۔ مغرب کی آذان کا وقت تھا۔ میں نے خیر و کفر کا پیغام بگھوایا کہ تاکہ چار رکھے۔ ہم ابھی کہیں کے لیے نکل رہے ہیں۔ غفورے نے مجھے لاکھ منع کیا

کہ ابھی دیر ہو گئی ہے اور میری حالت بھی پوری طرح سنہیلی ہے۔ میں کل شاکر سے ملنے چلا جاؤں لیکن اب میرے دل کو ایک پل بھی قرا نہیں

تھا۔ میرا دل چار رہا تھا کہ میں پلک جھپکتے ہی نہ اپنی حویلی پہنچی جاؤں۔

خیر جس رفتار سے تاکہ بھاگ سکتا تھا، بھاگ رہا تھا۔ میں نے اسے جلد از جلد اپنی حویلی پہنچنے کا کہا تھا۔ شرکی مرکزی سڑکوں پر کچھ خاص رش نہیں

تھا، جلد ہی، ہم شہر کے مضافات میں حویلی کو پہنچ گئی تھی۔ میں نے اسے حویلی پہنچنے کے لیے کہا تھا۔ وہاں خیرہ بھی کرے۔۔۔۔۔

میں اس وقت چڑکا جب خیرہ نے حویلی کے گیٹ کے سامنے پہنچی کر زور سے گھوڑے کی لگا میں کھینچیں۔ میں نے خیرہ کو وہاں رکھنے کے لیے کہا۔

گھٹت حویلی کے دالان میں ہی بکی خانوں کو جو شاید صوب میں رکھنے کے لیے ڈالی گئی تھیں۔ حویلی کے نوکروں سے جمع کروادی تھی،

مجھے دیکھتے ہی وہ سب چھوڑ چھاڑ کر بھاگتی ہوئی حیوی سے میری طرف آئی۔ کچھ دیر تو اسے اپنا سانس سنبھالنے میں ہی لگ گئی۔ وہ میرے چہرے اور

ہاتھوں کو بے تابی سے ٹھونکتی رہی۔



”کیا ہو گیا تھا آپ کو بسا۔۔۔ بیمار کیسے ہو گئے تھے۔۔۔ کتنے کمزور لگ رہے ہیں۔۔۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے آپ نے۔“  
 مجھے اس کے سوالات کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے اپنی بیماری کے بارے میں مختصراً بتانا پڑا پھر میں نے چھوٹے ہی اس سے شاکر کے بارے میں سوال کیا کہ وہ کہاں ہے۔۔۔؟ میں نے تجبوت کو عبداللہ کے پیغام کے بارے میں بھی بتایا۔

تجبوت نے شاکر کے بارے میں تو یہ بتایا کہ وہ ابھی ڈیوٹی سے واپس نہیں آیا۔ جاتے مجھے ایسا کیوں لگا کہ وہ عبداللہ کے پیغام کے بارے میں بھی جانتی ہے لیکن بتانے کی استغناء نہیں کر پاری۔۔۔

مجبوراً مجھے اس کو اپنی قسم دینی پڑی۔ تجبوت شاید پہلے ہی بہت دیر سے عذاب کر رہی تھی۔ میرے یوں اصرار کرنے پر اس کے ہاتھوں سے عذاب کا دامن چھوٹ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ میرا دل تو پہلے ہی ہول کھائے جا رہا تھا۔ تجبوت کی یہ حالت دیکھ کر تو جیسے ہی میں ہانپ ہی ہو کھلا گیا۔

”خدا کے لیے لگی۔۔۔ کھنکھاتاؤ۔۔۔ کیا ہوا ہے۔۔۔ مولوی صاحب کے گھر میں ٹوب خیرت ہے نا۔۔۔ ایمان تو ٹھیک ہے نا۔۔۔“  
 تجبوت نے عجیب ڈھکی سی نظر دلوں سے میری طرف دیکھا۔ جیسے کوئی پانی پاتے والا حسرت سے کسی دم توڑتے سپاہی کو میداں جنگ میں آخری گھونٹ سے پہلے ہی اس کی سانس رکتے ہوئے دیکھتا ہے۔

”مولوی صاحب نے ایمان کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ اگلے ماہ کی چند روکاس کی رخصتی ہے۔“  
 چند لمبے کوتھمے یوں محسوس ہوا کہ جیسے ہماری سنے، کھنکھانے، دیکھنے اور بولنے کی تمام حیات چھین لی گئی ہوں۔ مجھے اپنے آس پاس صرف ایک خلا محسوس ہوا۔ یہ کوئی اتنی غیر متوقع بات بھی نہیں تھی۔ اس دن میری مولوی صاحب سے جو آخری گفتگو ہوئی تھی اس کے بعد حقیقۃً بالقدم کے طور پر انہیں کچھ ایسا ہی قدم اٹھانا چاہیے تھا۔ وہ پہلے ہی مجھ پر واضح کر چکے تھے کہ کسی صورت میں ایمان کے لیے رشتہ قبول نہیں کریں گے۔ اپنی اور اپنی بیٹی کی بدنامی اور زمانے کی باتوں کا خوف بھی ان کے اندر ہر جہ اتم موجود تھا۔ میری دیوانگی اور وحشت ہماری حالت کو دیکھتے ہوئے کسی بھی شریف باپ کو ہی کرنا چاہیے تھا جو انہوں نے کیا تھا۔ لیکن پھر بھی یہ خبر میرے لیے کسی ہم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ تجبوت کو میری اندرونی حالت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ وہی لیے وہ بہت دیر تک میرے لرزتے ہاتھ پکڑے وہیں کھڑی رہی۔

افسانوی اعصاب کا کھیل بھی عجیب ہے۔ شاید ایک افسانہ کے اندر ایک وقت یہی ایک چیز ہوتی ہے جو صبر سے کمزور اور صبر سے زیادہ مضبوط ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہم سب کو ایک دن مر جانا ہے۔ پھر بھی کسی اپنے کی موت کی خبر سن کر کچھ دیر کے لیے تو ہمارے اعصاب سن سے ہو جاتے ہیں۔ شاید ہم جانتے ہوئے بھی ہر لمحہ خود کو اس انہونی کے نہ ہونے کا یقین دلاتے رہتے ہیں۔ ایمان کے کہیں رشتہ طے ہو جانے کی بات بھی میرے لیے اور میرے اعصاب کے لیے بھی کچھ ایسی ہی خبر تھی۔ دراصل کچھ باتوں کی گنگنی کا ہمیں اس وقت احساس ہوتا ہے جب وہ سرزد ہو جاتی ہیں۔ میرے لیے یہ احساس ہی روح نمود دینے والا تھا کہ وہ دنا زمین کسی اور کی ہونے والی تھی۔ کیسی عجیب بات تھی۔ ہم دونوں میں تو آج تک کبھی کبھی مل کر بات بھی نہ ہونے پائی تھی۔ تب میرا یہ حال تھا اگر کہیں اس کی طرف سے بھی قول و اقرار ہو چکا ہوتا تو شاید میرا دل وہیں پھٹ جاتا۔

بہت دیر تک نہیں اور گھٹ خاموش کھڑے رہے۔ حویلی کے بلند و بالا درختوں کے پرندے بھی ذہلی شام کے ساتھ گمراہی پر شور مچاتے مچاتے چپ ہو گئے تھے۔ اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔ چائیں نے امت جمع کی اور انہوں نے ہونے لہجہ میں گھٹ سے پوچھا۔

”کون ہے وہ۔۔۔۔۔ کس کے ساتھ ایمان کا رشتہ ملے ہوا ہے۔“

”اس کے چچا زاد۔۔۔۔۔ عبداللہ کے ساتھ۔“

”عبداللہ۔۔۔۔۔ ایک۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔“

لقد میرے منہ میں سی ٹوٹ گئے۔ یہ دوسرا پہاڑ تھا جو انی چند لمحوں میں میرے سر پر ٹوٹا تھا۔ عبداللہ تو میری دیوانگی کا خوشامد تھا۔ پھر عبداللہ۔۔۔۔۔ لیکن کیسے۔۔۔۔۔؟ میرے ذہن میں خیالات گڈمڈ سے ہونے لگ گئے تھے۔ محبت نے بتایا کہ مجھ میں مولوی صاحب کی جو بڑی بہن راجتی تھیں وہ عبداللہ کی بہنوئی ہوئے کے ساتھ ساتھ اس کی منہ بولی ماں بھی تھیں۔ مولوی صاحب نے مجھ جاتے ہوئے ان کے ہم خدائے کمر والوں کے ساتھ ہی بھیج دیا تھا۔ وہ ابھی پردہ بھی ایمان لوگوں کے ساتھ ہی آئی تھیں۔ مولوی صاحب نے ان کے سامنے ایمان کے رشتے کی بات نہ کی تو انہوں نے سب سے پہلے عبداللہ کا نام ہی تجویز کر دیا بلکہ بڑی بہن ہونے کے ناظر انہوں نے مولوی صاحب سے بطور حق ایمان کا رشتہ مانگا شاید مولوی صاحب کے دل میں بھی کہیں نہ کہیں اندر سےی خواہش مل رہی تھی، تبھی انہوں نے رات بھر سوچنے کے بعد ہاں کر دی۔ لیکن عبداللہ۔۔۔۔۔ عبداللہ سے کیا کسی نے اس کی رائے نہیں پوچھی۔۔۔۔۔؟ اس نے کیوں ہاں کر دی۔۔۔۔۔؟ لیکن وہ کیوں ہاں نہ کرتا۔۔۔۔۔ اس نے ایمان کے لیے میری دیوانگی ہی تو دیکھی تھی۔۔۔۔۔ اس پر وہ عقیم نے تو مجھ پر کھل کر آج تک نظر بھی نہیں ڈالی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ایمان کا اس مقام قصبے میں کوئی تصور نہیں تھا۔۔۔۔۔ میرا ذہن خودی سوال کر رہا تھا اور پھر خودی ان کے جواب بھی تلاش کر لیتا تھا۔ بہت دیر تک میں وہ ہیں بیٹھا اپنی قسمت کو رد کر رہا۔۔۔۔۔ نہ جانے شاکر کو اس دن اتنی دیر کیوں ہو گئی تھی۔ مجھے باہر تانگے میں بیٹھے خیر و کا بھی خیال تھا۔ رات ذہلی جاری تھی اس لیے محبت کے بے حد اسرار کے باوجود میں وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا، چلتے چلتے محبت نے مجھ سے پوچھا کہ اب کیا کرنا ہے؟

اس سوال کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں تھا۔ انسان ہزار دشمنوں سے لڑ سکتا ہے لیکن جب اس کی تقدیر ہی اس کی دشمن بن جائے تو پھر اس سے مقابلہ کون کرے۔ میری تقدیر کا وہ بھی جانے کب سے میرے در پہ تھا۔ اس جیسے اور نہ جانے کتنے حادو نے ابھی میرے تعاقب میں تھے۔ میں محبت کو جو میری تسلی دے کر گھر سے نکل آیا۔ خیر وہ مجھے دیکھتے ہی تا نکلے کو اڑھ دھانگی اور ہم دو بارہوا مشین کی طرف روانہ ہو گئے۔ مجھے خیر و کی سب سے اچھی عادت یہی گئی تھی کہ وہ از خود کبھی سوال کر کے دوسروں کی تنہائی میں غل نہیں ہوتا تھا۔ چپ رہ کر اس بات کو کھینے کا انتظار کرتا تھا۔ خاموشی بھی تو بہت بڑا صبر ہوتی ہے۔ اور خیر و اس معاملے میں بہت سابر تھا۔

مجھے انٹینشن کے دروازے پر اُتار کر وہ اپنا تانگا اسٹینڈ میں کھڑا کرنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ میں لٹا پٹا سا چلا ہوا پلیٹ فارم میں داخل ہوا۔ انٹینشن ویران سا پڑا تھا۔ میں نے اس سے پہلے بھی کئی راتیں آنکھوں آنکھوں میں کائی تھیں۔ لیکن اس رات کی تنہائی اور اس رات کے درد کا بیان ہی کچھ مختلف کچھ سا تھا۔

صبح نہیں دو بار دشا کر کی جانب جانے کا سوچا ہی رہا تھا کہ میرے کانوں میں غصہ سے کی آواز آئی۔  
 ”دور ہے جہاد باؤ۔۔۔۔۔“

میں اس وقت صبح کی گاڑی میں سے مال اُتر جانے کی تیاری میں تھا۔ اور پیٹ فارم کے آخری سرے پر پہنچ کر رازوم کے قریب ہی کھڑا تھا۔ میں نے چونک کر نظر اٹھائی۔ وہ عبداللہ تھا۔۔۔ جو میری جانب بڑھ رہا تھا۔ جانے کیوں نہیں عبداللہ سے نظریں نہیں ہٹا پایا۔ مجھے ایسے لگا کر جیسے نہیں اس نو جوان کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ تو یہ تھا وہ خوش نصیب جس کے نام میری ایمان کا قلم لکھا تھا۔ میری عجیب حالت تھی۔۔۔ میں تو اسے اپنا رقیب بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ حالانکہ وہ میرا رقیب ہی تو تھا۔ عبداللہ کی نظریں بھی جھکی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر کے لیے ہم دونوں ہی اپنے لفظ بھول گئے تھے شاید پھر مجھے ہی رسم ادا کرنی پڑی۔

”کیسے ہو۔۔۔۔۔؟ گھر میں سب ٹھیک ہیں نا۔۔۔۔۔؟ اس کی نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔“ جی۔۔۔۔۔ سب خیریت ہے۔۔۔۔۔  
 ”میں۔۔۔۔۔ میں آپ سے یہاں حافی مانگنے آیا ہوں۔“

”میں اس قابل نہیں ہوں۔۔۔۔۔ مجھے شرمندہ نہ کرو۔“  
 ”میں پہلے صبح شاکر صاحب کی طرف گیا تھا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ رات آپ وہاں آئے تھے۔۔۔ میں پہلے بھی دوسرے آپ کی حافی میں یہاں آچکا ہوں۔“

”ہں۔۔۔۔۔ مجھے خبر مل گئی، نیا رشتہ مبارک ہو۔“  
 شاید شدید کوشش کے باوجود بھی میں اپنے لیے کچھ کی تھی نہیں چھپا سکا۔ عبداللہ نے تھپ تھپ کر سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی نکایت تھی۔ مجھے اپنے الفاظ کے چناؤ پر شرمندگی ہونے لگی۔

”آپ کو حق ہے۔۔۔۔۔ جو چاہے کہہ لیں۔۔۔ شاید میں آپ کو کبھی اپنا سینہ چر کر اپنے دل کی حالت نہ دکھاساؤں۔“  
 ”میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا۔ شاید کبھی کبھی لفظ اپنے معنی خود ہی طے کر لیتے ہیں۔ حالانکہ ہمارا ان کو ادا کرنے کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو دوسرے کے کانوں تک پہنچتا ہے۔“

عبداللہ نے غور سے میری طرف دیکھا۔

”یہ بھی آپ ہی کا حریف ہو سکتا ہے کہ اس وقت بھی آپ ہی معذرت کر رہے ہیں۔ نہیں بچپن سے مولوی صاحب کے اس قدر احسانوں تلے دبا ہوا ہوں کہ اگر نہیں ان کا شمار بھی کرنا چاہوں تو کم از کم اس زندگی میں نہیں کر سکتا۔ انہوں نے مجھے بچپن کر نہیں۔۔۔ بلکہ باپ سے بھی بڑھ کر پالا ہے۔۔۔ خود تکلیفیں اٹھائیں لیکن مجھ پر کبھی کوئی سخت وقت نہیں آنے دیا۔ ان کے اپنے ہاتھ بھل گئے پر انہوں نے کبھی میرے پیروں میں کوئی چھال نہیں بننے دیا۔“

”تو کیا تمہارے اقرار کی وجہ بھی صرف ان کے احسانوں کا ہو جی تھا۔“ عبداللہ نے پھر اسی کرچی کرچی نظر سے میری طرف دیکھا۔  
 ”اس وقت ان کی حالت ایسی ہے کہ ذرا سی ٹھیس بھی انہیں ہیٹھ ہیٹھ کے لیے توڑ سکتی ہے۔ ہاں۔۔۔۔۔ یہ سچ ہے کہ جب انہوں نے

مکسچور اور تمام گھروالوں سے چھپ کر اکیلے کمرے میں میرے سامنے اپنے سر کی دستار ڈال دی تھی تو میں نے اپنی زبان کو بائیں ٹھک پالا تھا۔ وہ جانتے ہیں کہ میں آپ کی ایمان کے لیے دیواگی سے واقف ہوں۔۔۔ شاید اسی لیے انہیں اپنی عزت کو یوں میرے سامنے گر دی رکھنا پڑا۔ حالانکہ ان کی ہمیشہ سے یہی مرضی تھی شاید۔۔۔ لیکن آپ کے درمیان میں آ جاتے سے وہ بہت ڈر گئے تھے۔۔۔ وہ اس بات سے بھی بے حد خوفزدہ تھے کہ ایمان کے کسی دوسرے گھر میں رشتے کے بعد کہیں کسی مقام پر آپ اپنی دیواگی کے ہاتھوں اگر اس کے سرسرا والوں کے سامنے آ گئے یا اگر بات ایمان کے ہونے والے شوہر کے سامنے کھل گئی تو ان کی عزیز از جان بیٹی کی زندگی ہل میں رہا ہو جائے گی۔۔۔۔

ان سب باتوں کے پس منظر کو اور اپنے ایک ایسے عہس کی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ خود ہی بتائیے کہ اگر آپ میری جگہ ہوتے تو آپ کیا کرتے؟“

عبداللہ میرے سامنے سر تا پا سوال بنا کھڑا تھا۔ میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”عہس بھی وہی کرتا۔۔۔ جو تم سے اس وقت کیا۔“

عبداللہ کے اکڑے ہوئے چہرے میں حیرت سی ہوئی اور اس کی رگیں ڈھیلی پڑ گئیں۔

”میں نے کہا تھا نا۔۔۔ یہ صرف آپ کے طرف کا ہی حوصلہ ہو سکتا ہے۔ ایک اور بیچ کا اقرار کرنا چاہتا ہوں آج آپ کے سامنے۔۔۔ میں بیچن ہی سے جانتا تھا کہ میری شادی ایمان کے ساتھ ہی ہوگی۔ چچی کی نظر میں ہمیشہ سے میرے لیے وہ خاص پسند موجود رہی ہے جو کسی بھی باپ کی آنکھ میں اپنے ہونے والے فرزند کے لیے ہو سکتی ہے۔ جب لڑکیوں سے جراتی میں قدم رکھتا تو میری پہلی نظر بھی ایمان کی طرف ہی اٹھتی تھی۔ اور اس پہلی نظر سے لے کر آج تک میں ایمان سے شدید محبت کرتا ہوں۔ محبت کی شدت کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس نے خود کبھی محبت کی ہو۔ لیکن آج تک کبھی اس محبت کے اظہار کی فہمت نہیں آئی۔ پہلے اظہار کی ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ ایمان تو ہمیشہ سے ہی میرے نام لکھی جا چکی تھی۔ سو جا کہ شادی کے بعد پہلی رات اسے اپنی زندگی بھر کی باتوں کی کہانی سناؤں گا۔۔۔ اُسے ایک ایک بات یاد دلا کر بتاؤں گا کہ جب میرا اس کی کتاب میں سور کے پر کھدچے کا کیا مقصد ہوتا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے جان بوجھ کر اس سے پانی کیوں نہ پیتا تھا۔ اپنے استری شدہ کپڑے پھر سے اسے استری کرتے کے لیے کیوں دے دیتا تھا۔ شدید مردوں کی رات میں پچاس سے چھپ کر اس کے لیے اتنی ڈور سے پان کیوں لاتا تھا۔“

عبداللہ جانے کیا کیا بولے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جھپکی جاتی تھیں اور میرے دماغ میں جیسے آندھیلوں کا شور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اچھا۔۔۔ تو ایک مہر جہر محبت ہی تھی جو اس نوجوان کو ہمیشہ بھیڑ میں بھی سب سے الگ دکھائی تھی۔ عبداللہ کی بات جاری تھی۔

”لیکن پھر آپ آ گئے۔ نہیں جانتا ہوں کہ ایمان نے آج تک پلٹ کر آپ کو کوئی جواب نہیں دیا ہو گا۔ کوئی امید نہیں دلائی ہوگی کیونکہ میں اس لڑکی کو بیچن سے جانتا ہوں۔ شرم و حیا اور دروہاری کی جس مٹی سے گوندہ کر خدائے اُسے بنایا ہے۔ اس میں شاید ایسی محبت کی آمیزش ہی نہیں رکھی گئی۔ اس کی زندگی کا مقصد مولوی صاحب کی خوشی ہے اور وہ اس خوشی کے لیے ان کے ہونٹوں پر ایک ہلکی مسکراہٹ لانے کے لیے اپنی زندگی تو کیا۔۔۔ اپنا ایمان تک تباہ کر سکتی ہے۔۔۔۔۔

لیکن جاتے کیوں۔۔۔ آپ مجھے باقی سب سے مختلف لگے۔ مجھے دھیرے دھیرے ایسا لگنے لگا کہ آپ مولوی صاحب کے دل میں گھر

کری لیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہ سوچ سوچ کر ڈر گئے گا تھا کہ کہیں بچا آپ کے سامنے ٹوٹ ہی نہ جائیں۔۔۔۔۔ میری خود غرض سوچیں گہائی میں مجھے دلاتی تھیں کہ اگر آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو کیا ہوگا۔ آپ کی محبت کی طاقت سے میں بے حد خوف زدہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ آپ کی محبت ایک ایسا طوفان ہے جو سب کچھ بہا کر لے جاسکتا ہے۔ لیکن ہجرت کی بات ہے کہ اس کے باوجود نہیں بھی آپ کے خلاف کچھ نہیں سوچ سکا۔ کیسی آپ سے دل میں بھی نفرت نہیں کر سکا۔ شاید یہ بھی آپ کی محبت کا ہی کمال ہوگا۔“

لیکن پھر جس دن بس نے آپ کو اس اسٹیشن پر دیلوے کئی کے روپ میں دیکھا اس دن میرا دل بھی آپ کے سامنے بارمان گیا۔ آپ سے جیتنا مجھ جیسے کمزور شخص کے بس کی بات ہی نہیں۔ میری محبت نے اسی دن آپ کی محبت کی عظمت کو سیدہ کر دیا تھا۔۔۔۔۔ افسوس۔۔۔۔۔ بچا اس محبت کو نہیں سمجھ پائے۔۔۔۔۔ وہ ایک ڈرے ہوئے مجبور باپ ہیں۔ اور ان کی تربیت اور ماحول میں ایسی کسی محبت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ وہ اسے گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں۔ میں یہاں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ میرے گھر والوں نے آپ کی، آپ کی عظیم محبت کی قدر نہیں کی۔۔۔۔۔ آپ ہم سب کو معاف کریں۔۔۔۔۔ معاف کریں۔“

عبداللہ کی آواز ٹپکیوں میں ڈوب گئی۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا۔ دو جوان دمخہ آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب لیے اپنے ہاتھ معافی کے انداز میں جڑے میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے تڑپ کر اس کے ہاتھ قلم لیے اور ایک جھٹکے سے کھینچ کر اسے اپنے گلے لگا لیا۔ پھر ہم دونوں ہی رو پڑے۔ ہم دونوں کے پاس مزید کچھ کہنے کو تھا بھی نہیں۔ بس یہ آنسوؤں کی بولی ہی تھی جو ہم دونوں کو ایک دوسرے کی بات سمجھا سکتی تھی۔ کتنا عجیب مہر تھا، دُنیا نے آج تک رقیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی کرتے ملائے اور ایک دوسرے کی جان لینے ہوئے تو دیکھا ہوگا۔۔۔۔۔ یہ کیسے دور قریب تھے جو ایک دوسرے کے گلے لگ کر رہ رہے تھے۔ ان میں سے ایک سب کچھ پا کر دور ہوا تھا تو دوسرا سب کچھ لٹا کر۔

اس کے بعد عبداللہ زیادہ دیر تک وہاں نہیں رکا۔ مجھ سے علیحدہ ہو کر اس نے لمحہ بھر کے لیے میرے ہاتھ پکڑے، انہیں اپنی بیگنی آنکھوں سے اگے بٹا کر پلٹ کر وہاں سے چل دیا۔ میں وہیں کھڑا اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ دُنیا میں اتنے ہمت والے لوگ نہیں نے کم ہی دیکھے ہیں۔ وہ آیا اس نے کس ویدہ دلیری سے اپنا کچ مجھے بتایا اور واپس چلا گیا۔ ہم میں سے زیادہ تر ایسا کوئی فیصلہ کرنے میں ہی اپنی عمر گھوما دیتے ہیں۔ اس سے کہیں چھوٹا کچ بولتے ہوئے ہماری زبانیں سالہا سال چھلکتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ کچ ہمارے منہ سے نکل نہیں پاتا۔ جھوٹ در جھوٹ کی جہلیں ہمارے ضمیر کو ڈھانپتی رہتی ہیں اور آخر کار ہم کچ بولنا ہی بھول جاتے ہیں۔ واقعی۔۔۔۔۔ کچ بولنا صرف محبت کرنے والوں کا ہی شہو ہے۔ کیونکہ شاید دُنیا میں صرف محبت ہی کچ ہے۔ باقی سارے جذبے کسی نہ کسی منافقت کی پیادوار ہیں۔

اگر عبداللہ میرے سامنے ایمان سے اپنی محبت کا اقرار نہ کرتا تو مجھے ساری زندگی اس کا پتہ نہیں چلتا نہ ہی اُسے کوئی دور مجھ پر تھی کہ وہ میرے سامنے پیدا ہو سکتا۔ لیکن یہ اس نوجوان کے اندر کا کچ تھا جس نے اُسے یہاں مجھ خیر ایک جلی کر آتے پر مجبور کیا۔ عبداللہ اپنا کچ بول کر چلا گیا تھا، جب کہ مجھے اپنی زندگی کے بہت سے بھیا کچ تھا جیسے تھے اور ان میں سب سے زیادہ تلخ کچ یہ تھا کہ ایمان اُب کسی اور کے نام سے متوسل ہو چکی تھی۔

## جادوگر

ریکا نے جم کے میری طرف دوستی کے لیے ہاتھ بڑھانے کے بعد میرا نام جادوگر رکھ چھوڑا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ جادوگری میری شخصیت کا حصہ بنانے والی ذور میرے دہس کی ایک گل لام ہے، جو مجھے جینے کا ہر قاعدہ سکھا گئی ہے۔

اس دن بھی وہ نکاس میں بیٹھی میرے کان کھا رہی تھی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ مجھے کچھ میں نہیں آتا کہ تم یہ سب کیسے کر لیتے ہو۔ سارہ جیسی لڑکی نے تمہارے لیے باپ سے جھگڑ کر گواہی دے دی۔ جم جیسا مفرو اور بدتمیز امیر زور و خود کھارے پاس چل کر دوستی کے لیے آگیا۔ یہ سب جادو نہیں تو کیا ہے۔۔۔؟ مجھے بھی سکھا دو نا یہ سب کچھ۔“

”میں نے ایسی کوئی انہونی نہیں کی ہے جس کی وجہ سے تم اپنی حیران ہو رہی ہو۔ میں تم سارہ وار جم۔۔۔ یہ سب انسان ہی تو ہیں، بس انسان کو ایک ڈراما انسان ہی کی طرح سمجھنے کی بات ہے۔ اور کچھ نہیں۔“

”یہی تو سب سے مشکل کام ہے مانی ڈیئر میڈی۔۔۔ انسان کو سمجھنا ہی تو محال ہے۔ لیکن تمہارے ساتھ رہوں کی تو یہ بھی سیکھ لوں گی۔“  
اسے میں نے ریکا کو اس کی کسی کینٹی نے آواز دے دی اور مجھے نہر کنارے کھڑے جوزف کا پیغام آ گیا۔ آج وہ پھر مصوری کے سواڑ میں تھا۔ آج لندن میں چٹنگلی و صوبہ نقلی ہوئی تھی اور اس چیز کا فائدہ اٹھانے کے لیے تمام اسٹوڈنٹس کلاس سے غائب باہر گھاس کے میدانوں میں آڑھے ترہیچے پڑے نظر آ رہے تھے۔ جگ ہے لندن میں رہ کر مجھے بھی دھوپ کی اس ٹاپائی کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں جوزف کی طرف بڑھ گیا۔ جوزف نے تصویر ابھی مکمل نہیں کی تھی لیکن مجھے اس نے اپنی تصویر کے لیے نہیں بلکہ ساتھ ہی کچھ فاصلے پر کھڑی سارہ کی پیشکش دکھانے کے لیے بلایا تھا۔ سارہ اپنے دیکھتے رنگ پر دھوپ کی گرمی چھیلتی ہوئی گہرے نیلے سکرٹ میں آسانی رنگ کی سویٹر پہنے ڈیانا فیما سے بے خبر اپنی تصویر مکمل کر رہی تھی۔ جوزف مجھے اس کی طرف بڑھنے کا اشارہ کر کے خود اپنی تصویر مکمل کرنے میں مصروف ہو گیا۔

میں سارہ کو اور اس کی تصویر کو آخری اسٹرک دیتے ہوئے دیکھتا رہا۔ سارہ نے تصویر مکمل کر کے میری طرف دائے طلب نظروں سے دیکھا۔ ”بہت اچھی ہے۔۔۔ لیکن ابھی مکمل نہیں ہوئی۔۔۔ ایک لٹنگی۔۔۔ ایک نامکمل پن کا احساس ہو رہا ہے تمہاری تصویر کو یکہ کر۔“

”بہت خوب۔۔۔ گویا رنگوں کی زبان بھی جانتے ہو۔ ٹھیک کیا تم نے۔۔۔ میری ہر تصویر میں تمہیں اس نامکمل پن کا احساس ملے گا۔ لیکن ہر جوزف کے بعد تم پہلے انسان ہو جیسے اس کی کا احساس ہوا ہے۔ یہ نہیں کیوں میں تصویر مکمل کرنے سے پہلے ہی ختم کر دیتی ہوں۔“

”شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہاری ہر تصویر کا موضوع کوئی تلاش کوئی کھوج ہوتی ہے۔ اور شاید وہ کھوج چوری ہونے سے قبل ہی تم بہت پار دیتی ہو؟“  
سارہ نے اٹلہ کر میری طرف دیکھا۔

”نہیں ایسا نہیں ہے، مجھے بھلا کس چیز کی کھوج ہو سکتی ہے۔“

”جج کی کھوج۔“

”جج۔۔۔ جج کو کھوج کی بجائے کیا ضرورت۔۔۔ دو تو سامنے ہی روشن اور عیاں ہوتا ہے تم یہ بتاؤ تمہارا فرم پیچہ کہاں تک پہنچا۔“

”ابھی درمیان میں ہوں۔ لیکن اس فرم پیچہ کی وجہ سے بہت سے لوگ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ میرا اشارہ سر آ کرک کی طرف تھا۔ سارہ نے غور سے میری طرف دیکھا۔

”مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ تم سے اس قدر خوف زدہ کیوں ہیں۔“

”ائمہ میرا پیٹہ روشنی سے ڈرتا ہے۔“

”لیکن مجھے تو تم سے ڈر نہیں لگتا۔“

”منیں نے کہا نا۔۔۔ تم جی اڑی ہو۔۔۔ اور جج کو آجائے کا خوف کیسا؟“

سارہ زور سے ہنسی۔

”منیں نے بھی کہا تھا نا۔۔۔ تم واقعی بہت خطرناک ہو، کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔“

منیں بھی ہنس پڑا۔

”گے پھر ہو، جس میں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”ویسے تم نے ہم کو صاف کر کے اس کا دل ہی پلٹ دیا ہے کل تک جو تمہارا ہانی دشمن تھا آج سارا دن تمہاری خوبیوں کے گن کا تارہتا ہے۔“

”منیں یہاں دشمنیاں پالنے کو تکی نہیں آیا تھا، مجھے تو اس بات کا بھی افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمہارے اور سر آ کرک کے درمیان کھینچی

پیدا ہوئی۔“

سارہ نے سر پید کیا۔

”آف۔۔۔ پیر بچا بھی نا۔۔۔ اس کے پیٹ میں کبھی کوئی بات نہیں رہ سکتی۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پاپا اور میرے درمیان ایسی

ٹوک جھونک چلتی ہی رہتی ہے۔ انہیں دراصل اس بات کا بڑا لگتا تھا کہ میں سال میں آج تک یو تھو رشی میں کسی نے ان کے فیصلے کے خلاف سر اٹھانے

کی جرأت نہیں کی تھی۔ لیکن میں نے ان سے کہا کہ ہر نئے کام کی ایک دن ابتداء ہوتی ہی ہوتی ہے۔ دو مزید جگہ گئے اور پھر مجبوراً ماما کو جج میں کوونا

پڑا۔ پھر صوبہ معمول پاپا کو بارمانا ہی پڑی۔“

”لگتا ہے تمہیں اپنی ماسے بہت پیار ہے۔“

سارہ کی آنکھیں چپکے لگیں۔

”اوہاں۔۔۔ میری ماما تو میری جان ہیں۔ پاپا تو ہمیشہ مجھے بیڑوں کی طرح لپیٹ کرتے ہیں۔ مجھ سے بہت زیادہ تو تحفے لگاتے

ہیں لیکن ماما ہمیشہ میری مرضی کو ترجیح دیتی ہیں، وہی میرے دل کی حالت سب سے بھر جاتی ہیں۔“

سارہ کی اس کی ماں سے صحبت اس کے لہجے سے صاف جھلک رہی تھی۔





## دشمنِ خدائی

اس دن عبداللہ کے واپس جانے کے بعد جانے بھگے کیا ہو گیا تھا۔ ایک دم سے حق جانے کیوں مجھے ساری خدائی ہی دشمن لگنے لگی تھی۔ ایک دم ہی میرا دل جیسے ہر اچھے احساس سے عاری ہو گیا تھا۔ نہیں جس دن سے صوفی رحمت اللہ سے ملا تھا تب سے اس دن عبداللہ کی مجھ سے اسٹیشن پر ملاقات ہونے تک، میری ایک بھی نماز نہیں چھوٹی تھی۔ لیکن اس دن عبداللہ کے واپس چلے جانے کے بعد میرا دل مذہب سے بالکل ہٹ گیا تھا۔ جیسے میرا اندر کا یقین ہی بالکل ختم ہو گیا تھا۔ دُعا اور اس کی قبولیت سے میرا بھروسہ بالکل ختم ہو گیا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہ سب ایک دھوکوسلہ لگنے لگا تھا، میری ساری نمازیں چھوٹنے لگی تھیں۔ مجھے ہر دم یہ احساس رہنے لگا تھا کہ یہ نمازیں، یہ دُعا نہیں سب بے فائدہ ہیں۔ اگر ان نمازوں سے ان دُعاؤں سے کچھ فرق پڑتا ہو تو خدا مولوی صاحب کا دل میرے لیے نرم کر دیتا۔ آج ایمانِ عبداللہ سے منسوب ہونے کی بجائے مجھ سے منسوب ہوتی۔

مجھے مولوی صاحب کی ہر بات بھی صرف ایک دُسو تک لگنے لگی تھی، مجھے لگتا تھا کہ وہ فحش سرے سے ہر تک صرف ایک دُکاوا ہی تو ہے، جو زمانے کے سامنے اپنی پار سائی کا سوا لنگ و چانے کے لیے میری محبت کے در پے ہے۔ اسے صرف یہ غم ہے کہ کہیں اس کے پیچھے نماز پڑھنے والے معتدلوں اور نمازیوں کی تعداد کم نہ ہو جائے۔ جو صرف یہ چاہتا ہے کہ آتے جاتے اور اسے باور دے کہ گزرتے دیکھ کر لوگ اس کی تعظیم کے لیے اٹھ اٹھ کر اسے سلام کرتے رہیں اور اس کے گزرنے کے بعد اونچی سرگوشیوں میں اس کی نیکیوں اور پاک باری کے نمن گاتے رہیں۔ جنہیں سن کر وہ اپنی عظمت کے نقشے میں خود ہی ہمہ وقت سرشار رہے۔

ایسے اور اس جیسے جانے کتنے خیالات دن رات میرے ذہن میں گردش کرنے لگے تھے۔ شاید مجھ سے یہ توقع ہی جھین لی گئی تھی کہ کسی کوئی مثبت بات سوچ سکوں۔ مولوی صاحب کے پاس جب نہیں عشاء کی نماز پڑھنے جاتا تھا تو نماز کے بعد کے درس میں عجیب و غریب قسم کے مسائل سننے کو ملنے تھے۔ مثلاً ایک دن نماز کے بعد ایک نوجوان مولوی صاحب کو بتانے لگا کہ اس کے ساتھ ایک انوکھا مسئلہ ہے۔ اور وہ یہ کہ جب وہ گھر سے کھنڈر کسی کام کے لیے لگتا ہے یا پھر جب وہ دوسرے شہر پڑھنے کے لیے جاتا ہے اور اسے پورڈنگ میں رہنا پڑتا ہے تو اس سے ساری نمازیں چھوٹ جاتی ہیں۔ وہ چاہے کتنی بھی نمازیں پڑھ پا کر یا کتنی کہ نماز پڑھنے سے اسے گھر کی یاد پڑے یا دوستی ہے؟ اسے لگتا ہے کہ اگر وہ نماز پڑھے گا تو پورے پادہ شکنیں کا، لہذا وہ نماز پڑھنے کے بجائے ان اوقات میں دوستوں کے ساتھ کہیں گھومنے اور غم وغیرہ دیکھنے چلا جاتا ہے۔

اسی طرح ایک دن ایک اور صاحب تشریف لائے جو اس بات سے بے حد پریشان تھے کہ ان کا دل بچ رہا ہے کوئی کام۔ حالانکہ وہ صاحب استطاعت ہونے کے ساتھ ساتھ تندرست بھی تھے اور ان پر کوئی ایسی ذمہ داری بھی نہیں تھی کہ وہ خود اور اپنی بیگم کو نے کراچی کے لیے نہ نکل پاتے لیکن بتوں ان کے، ان کا دل ہی اس طرف مائل نہیں ہو پاتا تھا۔ انہیں بچ رہا ایک بڑی خوار کی کام لگتا تھا اور جو محبت خدا کے گھر کو دیکھنے کے لیے دل میں ہوتی چاہیے تھی، وہ اس محبت سے بالکل عاری تھے۔

ان دنوں میں بڑی حیرت سے لوگوں کے یہ سکتے سنا کرتا تھا اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز مولوی صاحب کے جواب ہوتے تھے۔ مثلاً ان حج والے صاحب کو انہوں نے جواب دیا کہ یہ کوئی لٹری بات نہیں ہے۔ ساری بات تو فقیح طے کی ہے۔ فی الحال ان کے لیے یہ بھی غیبت ہے کہ وہ کم از کم اس بات پر پریشان تو ہوتے ہیں کہ انیس حج سے رخصت کیوں محسوس نہیں ہوتی۔ فی الحال انہیں پریشان ہونے کی توفیق عطا کی گئی ہے۔ جس دن حج پر جانے کی توفیق نصیب ہوگی، وہاں جانے کی محبت اور محنت خود بخود دل میں پیدا ہو جائے گی۔ ہاں البتہ دعا ضرور کرتے رہیں کیونکہ پریشانی کی بات جب ہوگی جب دل سے حج نہ کرنے کی پریشانی بھی جاتی رہے گی۔ ایک دن اسی طرح دعا کے متعلق ایک عجیب بات سننے کو ملی، ایک نوجوان مولوی صاحب کے سامنے پریشان حال، بیگناہ اس بات کا رونا روتا تھا کہ اس کی دعا میں غلطی شامل نہیں ہوتا۔ وہ بس برائے نام ہی خدا کے سامنے گڑا کرتا ہے۔ نہ ہی اس کی توبہ اور دعا میں کچھ سچائی ہوتی ہے۔ وہ منافقانہ دعاؤں میں خدا سے اپنے منہا ہوں کی معافی تو مانگ لیتا ہے لیکن اندر سے اُسے اس گناہ پر خوشی محسوس ہو رہی ہوتی ہے اور دل کبر باہوتا ہے کہ اگر کسی دوبارہ موقع ملا تو وہ یہ گناہ ضرور دوبارہ بھی بنا کسی جھٹ اور خداست کے کر گزرے گا۔

مولوی صاحب نے اُسے بھی جواب میں یہی بات کہی۔ ”توفیق“ اُسے بھی یہی دلاسا دیا گیا کہ ابھی ہلکی اور منافقانہ دعا کی توفیق ملی ہے۔ یہ غلط معافی کی بھی وقت آنے پر مل جائے گی۔ شرط صرف اتنی ہی ہے کہ اس منافقانہ دعا اور دکھاوے کی معافی کا دامن بھی نہ چھوڑا جائے۔ خداست چاہے دکھاوے کی ہو یا چاہے منافقانہ اُسے نہیں کر دینا چاہیے۔

اسی لیے مجھے بھی لگ رہا تھا کہ مجھ سے ہر اچھی بات سوچنے کی اور ہر نیک کام کرنے کی توفیق بھی شاید عبد اللہ سے ہوئی اس ملاقات کے ساتھ ہی چھین لی گئی تھی۔ میں سارا سارا دن انہی خالی الذہن بیٹار ہوتا اور اپنے سامنے ہونے والے دنیا کے تماشے کو دیکھتا رہتا تھا۔

اب میں نے شاکر کی طرف چاہا بھی چھوڑ دیا تھا۔ خیر واد غفور سے یہ بھی کم ہی بات چیت ہوتی تھی۔ صدیقی صاحب بھی میری راہ نکلتے رہتے تھے اور پھر انتظار سے آگیا کہ خود ہی آکٹیشن پر چلے آتے اور مجھ سے ہاتھ سے بکڑ کر اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتے۔ یہی یہ جانتے تھے کہ مجھے کچھ ہو گیا ہے لیکن میرے سامنے ہونے والی اس تبدیلی کی وجہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ خیر واد وہ اس اُمید پر صبح و شام ناگہ جوت کر میرا اسٹیشن کے باہر انتظار کرتا رہتا کہ شاید مجھے اپنی مشقت پر جانا ہو لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ میری ہر مشقت دم توڑ گئی تھی۔ ایمان کو مانگنے کے بعد میرے پاس مانگنے کو کچھ رہا ہی نہیں تھا۔ نہ ہی کسی خرافہ کے پرے ہونے کا یقین ہی دل میں باقی بچا تھا۔ میں دنیا کی ہر خوشی اور غم سے لائق ہو گیا تھا۔ میں ایمان کی قریب آتی ہوئی شادی کے دن یوں گن رہا تھا جیسے کوئی چھائی کا تقید کی گال کو غمزدگی میں اپنی موت کی گھڑیاں گنتا ہے۔

وہ ایک ایسا ہی دن تھا، جو صبح سے نو رات بھر طویل اور آگستہ دینے والا۔ میں سپر مارکیٹ کا پلینٹ فارم نمبر 2 پر مال گاڑی گئے کانا انتظار کر رہا تھا۔ جو کسی وجہ سے پچھلے چمکا پر بہت دیر سے ڈکی ہوئی تھی۔ تھک کر میں لپ لپ کر پوسٹ کے پیچے بڑے قمرے پر بیٹھ گیا اور جس طرف سے مال گاڑی کو اسٹیشن میں داخل ہونا تھا اس طرف کے کسٹل کو دیکھنے لگا۔ آج غمزدہ بھی نہیں تھا اور تمام مال مجھے ہی اتر وانا تھا، دھلتا میری نظر کسٹل سے ہوتی ہوئی نیچے چڑیاں گن کر کے پلینٹ نمبر 2 کی طرف آتے ہوئے ایک شخص پر پڑی۔ کچھ دیکھا بھلا سا لگ رہا تھا۔ پر گون تھا یہ دی۔ اچانک میں اپنے حواس میں ایک جھٹکے سے لوٹ آیا۔ ارے۔۔۔ یہ تو شاکر تھا! میری مخصوص دوا میری دوا کی سفید دروی میں، جس کی وجہ سے میں ڈر سے اُسے ریلوے کا کسی کوئی ہانکا کچھ بیٹھا تھا۔ شاکر میری طرف ہی آ رہا تھا۔ میں ہولکا کر کھڑا ہو گیا۔ شاکر نے قریب آتے ہی مجھے زور سے بھیجے لیا اور بہت دیر

تک بنا کچھ کچھ چاپ مجھے لگے کھڑا اور جب مجھ سے ملے وہ اتنا ہی آکھوں میں نمی جی۔

”خدا بابا۔۔۔ کیا میرا کمر اس قابل بھی نہیں تھا کہ آپ وہاں کچھ دن رہ سکتے۔“

”تم جانتے ہو ایسی بات نہیں ہے۔۔۔۔۔ وہ میرا دوسرا گھر ہے۔۔۔۔۔ لیکن اگر گھر میں ہی رہتا ہوتا تو پھر پہلا گھر ہی کیوں چھوڑتا۔۔۔۔۔ لیکن جیسے یہاں کا پتہ کس نے دیا۔۔۔“

”میں جانتا تھا گت زیادہ دن تک یہ بات چھپائیں گے۔“

”میں جانتا تھا تو آپ کو گھر سے نکلنے کے بعد پہلے دن ہی تلاش کر لینا بابا۔۔۔۔۔ لیکن میں نے صرف آپ کی وجہ سے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ آپ تو امان جا نہیں گے۔ آج بھی واقعی نہیں گت کے بتانے پر ہی سیدھا یہاں آیا ہوں۔ اس نے آپ کو ابھی گھر بلا دیا ہے۔ کہہ رہی تھی بہت ضروری کام ہے۔ آپ کو ابھی میرے ساتھ گھر چلنا ہوگا۔“

”ابھی۔۔۔۔۔ لیکن مجھے اس وقت بہت کام ہے۔۔۔۔۔ میں شام کو۔“

”نہیں بابا۔۔۔۔۔ آپ کو ابھی چلنا ہوگا۔ اگر جلدی نہ ہوتی تو گت مجھے بھی آپ کا پتہ نہ دیتی۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ آپ کی بات کا کتنا مان رکھتی ہے۔“

شا کر کے لےجے میں کچھ ایسی بات نہی کہ مجھے مال گاڑی کا معاملہ ایک دوسرے میٹرنگ کے ہاتھوں میں سوپ کر اس کے ساتھ اسٹیشن سے لگانا ہی پڑا۔ پھر ایک بڑی اونچی مٹری نہی۔ شا کر جانتا تھا کہ میں کسٹمر صاحب یا گھر کی کسی گاڑی میں نہیں بیٹھوں گا اس لیے وہ شاید کسی جاننے والی کی کار لے کر آیا تھا۔ ہم دونوں بڑی اونچی حویلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں شا کر نے بتایا کہ امی اب اندر سے ٹوٹ چکی ہیں اور میری تلاش میں عباد کو ہر طرف دوڑا چکی ہیں۔ لیکن کسٹمر صاحب کے ڈر سے کوئی کھلے عام میری جدائی کا ذکر گھر میں نہیں کرتا۔ اب وہ صبح جان چکے ہیں کہ میں اپنے کسی دوست کی طرف نہیں گیا تھا اور گھر سے نکلنے کے بعد سے ہی تنہا کہیں دور ہا تھا۔ امی نے شا کر سے بھی مجھے تلاش کرنے کو کہا تھا اور آ خر شا کر کو ان کی حویلی کے لیے نہیں بتانا پڑا تھا کہ میں بھی کبھی کبھار بڑی اونچی حویلی میں گت اور شا کر سے ملنے کے لیے آتا رہا ہوں اور خبر یہ ہے ہوں۔ امی نے شا کر سے یہ بھی کہا تھا کہ اب اگر کبھی میں بڑی اونچی حویلی آؤں تو شا کر چپکے سے امی یا عباد کو اطلاع کر دے۔ میں نے چونکہ کر شا کر کی طرف دیکھا۔ کہیں میرا باا وہ امی پر گرام کا ہی تو کوئی حصہ نہیں۔ لیکن بھر میں نے خود ہی کو کلامت کی۔ شا کر کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ ورت وہ مجھے یہ سب تفصیل بتاتا ہی کیوں؟

کچھ ہی دیر میں ہم بڑی اونچی حویلی کے پھاٹک لڑکیٹ تک پہنچے تھے۔ شا کر نے مجھے کیٹ پر اتار دیا اور مجھے گاڑی واپس کر کے جلد آنے کا کہہ کر وہیں سے واپس مڑ گیا۔ شام کے ساڑھے چار کا وقت ہوگا۔ حویلی پر اک سکوت سا چھایا ہوا تھا۔ کیٹ سے اندر بھٹتے ہی سب سے پہلے میری خاطر گت پر پڑی جو بے چینی سے حویلی کے بھلی دالان میں ٹہل رہی تھی مجھ کو دیکھتے ہی وہ حیرت آمیز طرح میری طرف بڑھی۔

”اوہ بھیا۔۔۔۔۔ کہاں وہ گئے تھے آپ۔۔۔۔۔ کتنے دن سے آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں مجھ کو آج آپ کو آپ کے پیچھے بھیجا پڑا۔ کیا

آپ نے ہم سب سے بھی اپنا رشتہ توڑ لیا ہے۔۔۔۔۔ جیسی آپ مجھ سے بھی ملنے نہیں آئے نا۔“

گت کی آنکھوں میں شکوہ تھا۔ میں نے ایک بلی کی جیت اس کے سر پر لگائی۔

”بڑی چالاک ہو۔۔۔۔۔ جانتی ہو کہ میرا پتہ بتانے پر ڈانٹ چڑے گی مجھ سے اس لیے پہلے ہی سے چاری کر رکھی ہے مجھ سے ناراض ہونے کی۔۔۔ ہاں؟“

”بات ہی ایسی تھی۔۔۔۔۔ ورنہ میں آپ کا پتہ کبھی کسی کو نہ دیتی۔ دراصل حیا آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے۔ وہ پہلے بھی ایک مرتبہ یہاں آ چکی ہے۔ لیکن جب بھی آپ کا کچھ لٹ پٹ نہیں تھا۔ نہیں نے اُسے جب یہ کہا تھا کہ شاید آپ ایک آدمی میں آئیں گے تو نہیں، آپ کو آج کے دن دوبارہ آنے کا کہوں گی۔ جب وہ بھی آ جائے اور آپ سے بات کر لے۔ لیکن دن گزرتے گئے اور آپ مجھ سے ملنے آئے اسی نہیں اور آج کا دن بھی آ گیا جب میں نے حیا کو یہاں دوبارہ آنے کا کہا تھا۔ بس اسی پر بیٹانی میں ابا کو آپ کی طرف بھیجتا ہوں۔“

میرے لیے حیا کی آمد واقعی بہت حیرانی کا باعث تھی۔ وہ تازہ سی لڑکی مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی تھی جس کے لیے اُسے دوسرا پہننے قصص جیسے گھر سے نکل کر اتنی زور تک یہاں آنا پڑا تھا۔ میں یہ بھی جاننا تھا کہ اس گھر سے لٹکانا حیا کے لیے کس قدر مشکل مرحلہ ثابت ہوا ہوگا۔

”کہاں ہے حیا۔۔۔۔۔؟“

”میں نے اُسے حویلی کے بڑے برآمدے والے گول کمرے میں بٹھایا ہے۔ ابھی آپ کے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی وہ یہاں پہنچی ہے۔ نہیں اسی پر بیٹانی میں یہاں ٹہل رہی تھی کہ اگر آپ ابا کو اسٹیشن پر نہ ملے تو نہیں حیا کو کیا جواب دوں گی۔ آپ اس سے دو کھڑی وہیں مل لیں، نہیں ابھی آتی ہوں۔“

گھٹ نے جانے کے لیے قدم بڑھا دیا۔ میں گولگی کیفیت میں وہیں کھڑا رہ گیا۔ پھر چلتے چلتے مجھے کچھ خیال آیا۔ میں نے جانتی ہوئی گھٹ سے آواز دے کر پوچھا۔

”لیکن حیا یہاں تک اکیلے آئی کیسے۔۔۔۔۔؟“

”دو اکیلے نہیں آئی، اُس کی امی بھی اس کے ساتھ آئی ہیں۔ وہ اندر ہماری طرف اماں کے ساتھ بیٹھی ہیں۔“

گھٹ ہلٹ کر چلی گئی، نہیں مزید ابھمن کا دکھارہو گیا۔ حیا اپنی امی کے ساتھ آئی ہے۔۔۔ تو کیا اس کی ماں کو بھی اس بات کی خبر ہے جو حیا مجھ سے کہنے کے لیے اتنی دور آئی ہے؟

میں اسی شش و پنج میں جھٹکا پڑا ہوا حویلی کے بڑے برآمدے تک پہنچی چکا تھا۔ کچھ دیر دروازے پر کھڑے ہو کر میں نے اپنے ذہن کو یکسو کرنے کی کوشش کی اور پھر میں قدم بڑھا کر اندر داخل ہو گیا۔ حیا نے آہستہ سُن کر چونک کر مجھے اندر آتے دیکھا اور بکھلاہٹ میں دو کھڑی ہو گئی۔ جلدی میں اُس نے مجھے سلام کیا۔ اس دن میں نے پہلی مرتبہ حیا کو غور سے دیکھا تھا۔ وہ ایمان سے بے حد ممانعت رکھتی تھی۔ شاید عمر میں دو تین سال ہی اُس سے چھوٹی ہوگی۔ اس کی پلکیں بھی ہر بار ایمان کی پلکیں کی طرح لرزتی ہی رہتی تھیں۔ وہ بھی ایمان کی طرح ہی بڑی ہی چادر میں لپٹے سر جھکا کر کھڑی تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے وہ کسی ان جانے نہ بے کی طاقت سے یہاں تک تو آ گئی ہے لیکن یہاں مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے گئی ہے۔ مجھے اس کی دلجوئی کے لیے خروہی بات شروع کرنی چاہیے۔ ورنہ شاید ہم دونوں ہی یوں خاموش کھڑے رہیں۔

”آپ کھڑی کیوں ہیں۔ پلیز بیٹہ جا بیٹے۔“

حیا چپ چاپ بیٹھ گئی، نہیں بھی سامنے والے صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

”معافی چاہتا ہوں آپ کو میری وجہ سے کچھ اظہار کرنا پڑا۔ مجھے ابھی کچھ دیر پہلے ہی گئی نے بتایا کہ آپ آئی ہوئی ہیں۔“

حیا نے ٹکلیں اٹھائیں اور میری طرف دیکھا۔

”آپ اپنے آپ کو کس بات کی سزا دے رہے ہیں۔“

مجھے اس براہ راست طرز خطاب کی توقع نہیں تھی۔

”شاید میری قسمت میں ہی یہ سزا لکھ دی گئی تھی۔ اور پھر نقد پر سے کیا لہنا۔۔۔؟“

”آپ جو محبت کر رہے ہیں وہ اب صرف کنوئیں اور افسانوں میں باقی رہ گئی ہے۔۔۔ ایسی محبت کو سمجھنے والے اب اس دنیا میں باقی

نہیں ہیں۔“

نہیں نے حیرت سے اس نازک سی گل ابرام لڑکی کی طرف دیکھا جو ابھی ابھی اسکول، کالج سے واپس آئی ہوئی لگتی تھی۔ مجھے اس سے اتنی بڑی بڑی باتوں کی توقع ہرگز نہ تھی۔ لیکن شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ لڑکیاں اپنی عمر سے دس سال آگے کی سوچ رکھتی ہیں۔

”محبت کرنا نہ کرنا اپنے اختیار میں ہی ہوتا تو پھر مسئلہ کس بات کا تھا۔ محبت کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ اس کا ہونا نہ ہونا اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔ نہ ہی محبت کو اس بات کی پروا ہوتی ہے کہ کوئی اسے سمجھے گا یا نہیں۔“

وہ غور سے میری بات سنتی رہی۔

”کاش آپ کا اور ایمان آئی کا مکمل ممکن ہوتا۔ لیکن ایک اس میل کے نہ ہونے سے آپ باقی ساری دنیا کو تو نہیں چھوڑ سکتے نا۔ آپ کے

عظیم ایمان باقی کا کیا پیغام لائی ہوں نہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ آپ خدا کے لیے جوں و بدر کی ٹھوکریں نہ کھائیں۔ واپس اپنے گھر چلے جائیں۔ یہ ان کی آپ سے آخری التجا ہے۔“

اوہ۔۔۔ تو حیا اسی ماہر ذکا پیغام لے کر آئی تھی۔ گویا اس کے سینے میں بھی دل دھڑکنا تھا۔ شاید وہ اس دن انٹیشن پر میری حالت کو ابھی

تک بھولی نہیں تھی۔ لوگ کتنے مصحوم اور بھولے ہوتے ہیں۔ بھول جانے کا کہہ کر سمجھتے ہیں کہ دوسرا شاید سب بھول ہی جائے گا۔ چلو اس سبک دل کو مجھ پر اتنا رحم تو آیا کہ اس نے نامہ رنج کچھ اچھا دوا اور انجیلا دشت بھول جانے کا پیغام تو بھیجا۔ اس ایک ختم کے لیے تو اس کی یہ قربانی بھی کچھ کم نہ تھی۔

”اگر آپ کی ایمان آئی کی قلمی اس بات سے ہوتی ہے کہ شہنا واپس اپنے رشتوں کے پاس چلا جائے تو آپ ان سے جا کر یہی کہہ دیجئے

گا کہ میں واپس چلا گیا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ اپنی اگلی ساری زندگی اس احساس کے ساتھ گزاریں کہ ان کی وجہ سے کوئی گھر سے بے گھر ہوا تھا۔“

حیا نے ٹپ کر میری طرف دیکھا۔

”میں جانتی تھی کہ آپ میری بات نہیں مانتے گے۔ کیوں سارا کچھ خود ہی سہنا چاہتے ہیں۔ کیوں خود کو اتنی افسوس دے رہے ہیں۔ اس

وقت بھی آپ کو آپ کی کہ اس احساس کا خیال ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ وہ صرف میرے کہہ دینے سے اس بات پر یقین کر لیں گی کہ آپ واپس گھر

چلے گئے ہیں۔۔۔۔۔؟“

”کھرا آپ ہی بتائیے۔۔۔۔۔ میں انہیں یقین دلانے کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔“

”آپ اس دُنیا کے نہیں گتے۔۔۔۔۔ یہ دُنیا آپ محسوس کے لیے بنی بھی نہیں ہے۔ لیکن ہو سکے تو میری درخواست پر فوراً ضرور کیجئے گا۔ یہ صرف آپ ہی کی ہی خواہش نہیں ہے۔ یہ میری بھی آپ سے ملتی اچھا ہے۔ اس دن آپ کو انٹیشن پر دیکھ کر ہماری کیا حالت ہوئی تھی۔ آپ نہیں جانتے۔۔۔۔۔ اس دن امی نے بھی آپ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ انہیں بھی آپ ہماری دُنیا سے الگ نظر آئے تھے۔ کاش ہماری بد نصیبی کے ستاروں کا سایہ آپ پر کبھی نہ پڑتا۔“

اتنے میں محبت کمرے میں داخل ہوئی۔ حیا اُسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ محبت نے اسے بتایا کہ اس کی امی جانے کے لیے تیار کھڑی ہیں۔ حیا نے مجھ سے رخصت کی اور جانے کے لیے چلی۔ میں گم سم سا بیٹھا ہی رہ گیا۔ اچانک حیا کی اور اُس نے اپنے ہاتھ میں چھپا ہوا کاغذ کا رقعہ نکالا۔ اور میرے قریب آ کر اسے میری طرف بڑھایا۔

”یہ آپ نے مجھے اس وقت آپ کو دینے کا کہا تھا جب مجھے لگے کہ میری درخواست آپ کی قبولیت پانے کے قابل نہیں ہے۔ اپنا خیال رکھیے گا۔۔۔۔۔ حیا پلٹ کر چلی گئی اور ہاتھ میں سفید کاغذ کی وہ پرچتی تھی کی تھی رو گئی۔ کچھ دیر تو مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ محبت بھی حیا کو چھوڑنے پر ابھری گئی تھی۔ میں نے کاغذ کی تھیں کو لیں۔ محبوب کا خط کھولنے اور اُسے پڑھنے کی لذت سے وہی لوگ واقف ہوتے ہیں جنہوں نے خود اس تجربے سے گزر کر دیکھا ہوتا ہے۔ وہ چند لمحے کی قارون کے خزانے سے نہیں نکلتے ہوتے۔ میرے لیے تو دینے بھی یہ اس مہ جیوں کے پہلے چند لفظ تھے جو غریبی کی صورت میں اُس نے بھیجے تھے۔ ورنہ لوگ تو ہزاروں مرتبہ کے کچے، سٹے اور پڑے ہوئے لفظوں کو بھی کسی تھوک کی طرح سنبھال سنبھال کر رکھتے ہیں۔ میں دن میں ہزار ہزار بار پڑھتے ہیں اور ہر بار انہیں وہ غریب راتنی ہی غنتی ہے جتنی پہلی مرتبہ گئی تھی۔ میری نظریں تیزی سے کاغذ پر چسپائی جا رہی تھیں۔ خوبصورت لکھائی میں صرف چند خط ہی لکھے ہوئے تھے۔ بنا کسی القابات اور ادبی سلام و دعا کے بغیر۔

”آپ کے ارادے اور اس کی سچائی کی عظمت پر شک نہیں ہے۔ بس اتنا کہنا تھا کہ محبت میں خدا نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ خدا تو غشی کی بیچان ہے۔ آپ گھر واپس چلے جائیں اور یہ دشمنی ختم کر دیں۔ یہ میری آپ سے پہلی اور آخری بات ہے۔“

☆☆

شاید ان چند لکھوں میں میں نے بیسیوں بار اس رقعے کو پڑھا ہوگا۔ ہر دفعہ اس اُمید پر کہ شاید کوئی لفظ مجھ سے جھپٹی مرتبہ چھوٹ گیا ہو۔ شاید مجھ سے پڑھنے میں کوئی کوتاہی ہوئی ہو۔ دراصل میں ایک سبب تک خود کو یقین ہی نہیں دلا پایا تھا کہ میرے ہاتھوں میں اس گل رُخ کی تحریر ہے جو اس نے صرف میرے لیے لکھی ہے۔ صرف میرے لیے۔۔۔۔۔ حماد امجد رضا کے لیے۔۔۔۔۔ کیا زندگی مزید بھینے کا اس سے بڑا کوئی اور بہانہ ہو سکتا تھا۔ مجھے اس کاغذ کے ٹکڑے میں، ان لفظوں کی پور پور سے اور اس روشنائی کے ہر کھٹے سے اس کی تصویر کی جھلکی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے وہ کاغذ نہ ہو۔ ایمان خود میرے سامنے بیٹھی مجھ سے باتیں کر رہی ہو۔ یہ خط میرے لیے پوری ملاقات سے بھی بڑھ کر تھا۔

میں نے آس پاس نظر ڈالی تو قریب ہی چند کاغذ اور ایک مختصر میز پر دھری پڑی تھی۔ میں نے مختصر اُلٹائی اور کاغذ پر چند سطور سمجھ دیں۔

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک  
کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک  
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کر دو گے لیکن  
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

میں نے اس کے گھر میں غالب کو بکھرے پایا تھا، غالب اس کا پسندیدہ شاعر تھا، میں نے اسی کے پسندیدہ شاعر کی زبان اپنا حال بیان کر دیا تھا۔ میری بات تو وہ آج تک بکھر نہیں پائی تھی۔ شاید اپنے شاعر کی بات اس کو سمجھ میں آ جائے۔ دوسرے کانڈ پر میں نے تقویت کے لیے ایک پیغام لکھا کہ اگر حیا اب تک نہیں گئی ہے تو وہ اس کے ذریعے پھر کس اور طریقے سے یہ پیغام ایمان تک پہنچا دے۔ میں ان دونوں کانڈوں پر سنگ مرمر کا بنا ہوا خوبصورت سا چھوٹا وزن رکھ کر کمرے سے نکل آیا۔ باہر کوئی نہیں تھا، میں زیادہ دیر وہاں نہیں رہ سکتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اسی نے شاعر کے علاوہ بھی حویلی کے کسی نوکر کو میرے آنے کا اطلاع دینے کا پابند کر رکھا ہو۔ میں حویلی کے چھانک سے گزرتا ہوا باہر سڑک پر آ گیا۔ کچھ دیر دور مجھے ایک ٹانگہ مل گیا اور میں اسے اسٹیشن کا پتہ دے کر کچھل بیٹ پر چڑھ گیا۔

میں اپنے خیالوں میں اور اس کانڈ کے ٹکڑے کے دل کے اتنے پاس ہونے کے احساس میں اس قدر مگن تھا کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اسٹیشن پہنچ گیا۔

شام داخل رہی تھی، پلیٹ فارم پر پہنچا تو صدیقی صاحب کا خاص بنگالی نوکر جوان کا باورچی بھی تھا، پلیٹ فارم پر میری ہی تلاش میں ادھر ادھر ہلک رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خوشی کا ایک رنگ لہرایا، وہ جلدی سے میری طرف بڑھا۔

”وہاں وہاں۔۔۔ آپ کو آدھر بلاتے ہیں۔۔۔ آپ کے لیے چاول موٹی بنا دیا ہے ہم نے۔“

میں نے تھکن کا انداز میں کیا لیکن میں جانتا تھا کہ ابراہیم اب مجھے ساتھ لیے بناریاں سے نہیں لے گا۔ صدیقی صاحب نے اُسے کچھ ہی قسم کی ہدایات دے کر بھیجا ہوا گا۔ مجبوراً مجھے اس کے ساتھ ہی صدیقی صاحب کے بنگلے جانا پڑا۔ وہ میرا دمے میں ہی کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے، مجھے دیکھ کر وہ بھی کھل سے گئے۔

”ہاں میاں۔۔۔ اب بھلا ہماری یاد کیوں آنے لگی۔ اب تو جناب کی صورت دیکھئے بھی، ہفتہ ہفتہ ہو جاتا ہے۔“

میں مسکرایا۔۔۔ ”ایسی بات نہیں ہے، آپ سے ملاقات ہو یا نہ ہو آپ ہر دم میرے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔“

صدیقی صاحب کھٹکھٹا کر من پڑے۔

”فنگلوں کی کبھی کبھی کمی نہیں رہی تمہارے پاس۔ کبھی تو کسی کو مراض ہونے کا موقع دیا کرو جا میاں۔“

صدیقی صاحب ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ جانے میں انہیں کس طرح اور کیا جواب دینا پڑا۔ میرا حیا ان تو کہیں اور ہی تھا۔ بس صدیقی صاحب کی دلجوئی کے خیال سے ان کا ساتھ دینا پڑا۔ ابراہیم نے جلدی کھانا لگا دیا۔ وہ ہمیشہ سے چاول پھلی بہت لذیذ بناتا تھا۔ اور پھر کھانے کے دوران وہ آس پاس ہلکتا رہتا تھا کہ ہم اس کے کھانے کی تعریف کر سکیں۔

انسان ہمیشہ سے صرف اپنے غم کی تعریف کا ہی تو بھوکا رہا ہے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی کامیابی کے پیچھے کی تار مار کھا کر کنگالا جائے تو آپ کو کہیں نہ کہیں اس بھوک کا سراغ ضرور ملے گا۔ یہی بھوک انسان کو کچھ انوکھا، کچھ الگ، کچھ سب سے بڑھ کر کروکھانے پر مجبور کرتی ہے، تب انسان سے تان بگل جیسے شاہکار سرزد ہو جاتے ہیں۔ پتہ نہیں مجھے کبھی کبھی ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ تعریف اور سراہنے کا ہنڈیا انسان میں نہ ہو تا تو ہم ابھی تک بھڑکے دور میں ہی کبھی رہے ہوتے۔

کھانا کھانے کے بعد نہیں نے صدیقی صاحب سے اجازت چاہی۔ وہ میرے ساتھ ہی باہر گھر میں بنے ٹکڑی کے چھوٹے سے سفید پھانک فرما گئے۔ آئے۔ میں رخصت لے کر لنگے لگا تو انہوں نے پٹلے سے مجھے روک لیا کچھ دیر تک مجھے دیکھتے رہے جیسے میرے چہرے پر کچھ کھوج رہے ہوں۔

”زندگی کسی ایک رشتے کے غم ہونے سے ختم نہیں ہو جاتی۔ اور پھر ہمیں اسے کیا غم کرنے کا حق ہی کہاں ہے۔ ہم اپنی زندگی اپنے لیے ہی کب پاتے ہیں، یہ مختصر زندگی تو دوسروں کے لیے جینے میں ہی کٹ جاتی ہے۔ اور نہیں جانتا ہوں کہ تم دوسروں کے لیے جینا خوب جانتے ہو۔“

صدیقی صاحب میرا کندھا چھو کر بائیس اندر مڑ گئے۔ نہیں بھی باہر نکل آیا۔ شہری سڑک سنسان پڑی ہوئی تھی۔ سڑک پر تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر میونسپلٹی کے لپ پوسٹ لگے ہوئے تھے جن کی پٹی (Yellow) روشنی سڑک پر دائروں کی صورت میں پھیلی ہوئی تھی۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ رات کو سڑک پر دُور دُور پھیلی ہوئی روشنیوں ہمارا فاصلہ تو کم نہیں کرتیں البتہ ہمارا سفر آسان کر دیتی ہیں۔ اچھے دوستوں کی طرح، جو اگر ساتھ ہوں تو غم بھی خوشی کی طرح کٹ جاتے ہیں۔ مجھے اُس وقت کا مرن کی بہت کی محسوس ہوئی۔ میں نے گھر سے نکلنے کے بعد اب تک فردا فردا تمام حالات کے بارے میں اپنے خطوط کے ذریعے باخبر رکھا تھا، لیکن عبداللہ سے ملاقات کے بعد نہیں اُسے بھی خط نہیں لکھ پایا تھا۔ میں پیدل ہی پلیٹ فارم کی طرف چلا رہا۔ جانے صدیقی صاحب نے آج میرے گھر سے واپسی کے وقت دوسروں کے لیے جینے والی بات کیوں کہی تھی، کتنی عجیب بات تھی، اپنے حالات سے صرف میں ہی واقف نہیں تھا یا میرے پاس رہتے سبھی لوگ میرے ہل ہل کی خبر رکھتے تھے۔ کتنے لوگ صرف ایک میری وجہ سے پریشان تھے۔ مجھے اب اس شہر سے کہیں اور چلے جانا چاہیے۔ بنا کسی کو کچھ بتائے، کچھ بولے۔۔۔۔۔ ہاں واقعی۔۔۔۔۔ اب مجھے کس بات کا انتظار تھا، نہیں کیوں اس کی رخصتی قریب آنے کے دن گئے کے لیے یہاں بیٹھا تھا۔ یہ کہاں تو اب ختم ہو چکی تھی، پروہ کتنے دن بعد گرتا ہے، اب اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔۔۔۔۔؟

یہ کیا ستم تھا۔۔۔۔۔ میری محبت لٹ رہی تھی اور صدیقی صاحب اور ان جیسے اور ان کے جو اس وقت بھی مجھ سے کسی ڈوبتے جہاز کے کپتان کا سادہ قانون فراموش کرتے تھے، ایک ایسے بحری جہاز کا کپتان جو یہ جانتا ہو کہ اس کے آدھے ڈوبے ہوئے جہاز کو پورا غرق ہونے سے آدھ دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی، پھر بھی وہ اپنے عمل اور مسافروں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے جہاز کے شعلہ عرشے پر سینہ بٹانے لگا رہتا ہے۔ اور آخر کار جہاز کے ساتھ ہی فرق ہو جاتا ہے، جانے ان لوگوں نے مجھے اتنا دلیرا دیا جسے بڑے دل والا کیسے سمجھ لیا تھا۔۔۔؟

☆☆☆



## یہودی بستی

شام کو جب میں سارہ کے گھر پہنچنے کی تیاری کر رہا تھا تب کامران آ گیا۔

”کیا۔۔۔ تم اس یہودی بستی میں جاؤ گے، ناممکن۔“

”ادہو۔۔۔ میں کسی یہودی بستی میں نہیں بلکہ سارہ کے گھر جا رہا ہوں جو نیورسٹی کے پچھلے بلاک میں ہی واقع ہے۔“

”جانتا ہوں، اسی کو نہیں یہودی بستی کہتا ہوں۔ تمہارے ایڈمیشن سے پہلے دو مرتبہ تمہارے ہی کام سے گزر ہوا تھا میرا وہاں سے۔ ایک عجیب سی حفاظت تھی ان سب کی نظروں میں میرے لیے جیسے میں کوئی انسان نہیں، کسی جلی کا کیڑا ہوں۔ کسی نے میری ہات کا صحیح جواب تک نہیں دیا۔ تم نہیں جانتے صرف تمہارے فارم اس آئزاک سے تصدیق کروانے میں مجھے کس قدر مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ میری ماں تو وہاں جاتے کا براہہ بدل دو۔“

میں نے مسکرا کر کامران کے کانٹے کو چھینپایا اور اس کے ہاتھ سے گاڑی کی چال لے لی۔

”فکرمات کرو تمہارا دوست اتنی مضبوطی گولی نہیں ہے جسے دو لوگ اتنی آسانی سے نگل جائیں گے۔ میں صرف سارہ اور اس کی ماما کی وجہ سے وہاں جا رہا ہوں۔ ان لوگوں سے ملنا میرے فرائض ہیں بھی میری مدد کرے گا۔ میں اس لوگوں کا رہن سہن قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

کامران نے مضطرب سی سانس لی۔

”اچھا۔۔۔ پھر اس یہودی حید کو میرا سلام بھی کہہ دیتا۔۔۔ اور یہ بھی کہنا کہ آئندہ جب تمہیں اپنے گھر کھانے پر بلائے تو ساتھ ہی تمہارے بھگری دوست کامران کو بھی ضرور بلائے۔ کیونکہ تم اس کے بغیر کھانا مطلق سے نہیں کھا سکتے۔“

میں آٹھ بجے تک بھگ سڑا آئزاک کے پچھلے پہنچ گیا۔ سارہ نے گیٹ پر ہی میرا استقبال کیا۔ مسز جینی اندر لاؤنج میں موجود تھیں لیکن سڑا آئزاک کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ سارہ کا گھر بہت سلیف سے سجا ہوا تھا۔ گھر کی ہر چیز سے نفاست اور اعلیٰ معیار تک رہا تھا۔ سارہ کی بٹائی ہوئی بہت سی پینٹنگز دیواروں پر لگی ہوئی تھیں۔ گھر کے ایک کونے میں چھوٹا سا عبادت خانہ بھی بنا ہوا تھا۔ جس کے چاروں طرف کے گرد بہت سی موم بتیاں ایک خاص ترتیب میں رکھی گئی تھیں۔ ضرور ان موم بتیوں کا تعلق بھی ان کی عبادت کے کسی خاص حصے سے ہوگا۔ سارہ انتظامات میں لگ گئی اور مسز جینی میرے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

”ہاں تو اب ہٹاؤ، یہاں تک کیسے پہنچے؟ تمہارے ملک کے بارے میں میں نے بہت سنا ہے، لیکن تم اتنے بڑے امرائیں لگتے جتنی بڑے امرائے کہنا یا تمہارے لوگوں کے بارے میں جانتی تھیں؟

”ایسا کچھ خاص ہے نہیں میرے پاس اتنے کے لیے۔ اور دوسری ہمیشہ چیزوں کو بڑے امرائے جانتی ہے۔ قریب آنے پر چیزوں اور لوگوں کی بڑے

اسرار یہ شتم ہو جاتی ہے جسکی میں آج آپ کے سامنے پیشا ہوں۔“

سارہ جو قرب ہی میز پر بچوں کی نوکری سنانے میں مشغول تھی میری بات سن کر فحش پڑی اور ماں سے کہنے لگی۔

”آپ ان سے کئی بات کے سیدھے جواب کی توقع مت کیجئے گا۔ اسے سوالوں کے جواب میں سوال کرنے کی عادت ہے۔“

مسز جینی فحش پڑیں۔ سنیں نے اپنے بارے میں انہیں مختصر آئنا دیا۔ مسز جینی خود سے سختی رہیں۔ سنیں نے ان سے سرتاؤک کے بارے

میں پوچھا۔

”دو ابھی آتے ہوں گے۔ یہ ان کی عبادت کا وقت ہے۔ دراصل تمہارے معاملے کی وجہ سے ان میں اور سارہ میں کچھ تاؤ سا چل رہا

ہے۔ اس لیے وہ کچھ اپنی ناراضگی کا بھی اظہار کرنا چاہ رہے ہوں گے۔ اس لیے ذرا دیر سے ہی آئیں گے۔“

سنیں حیرت سے اس بارہا قاری عورت کو دیکھتا رہا، کس قدر آسانی سے انہوں نے بنا کچھ لگی لپٹی رکھے سب کچھ آئنا دیا تھا۔ سارہ بھی یقیناً انہیں کا پرتو ہوگی۔ وہ بھی انہی کی طرح صاف دل اور چچی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو کوئی بھی بات بنا دیتا لیکن اپنے گھر کی اندرونی بات کبھی نہ بتاتا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ پھر تو آپ کو مجھے یہاں مدعو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس سے باپ بیٹی کے کچھ تاؤ مزید بڑھنے کا اندیشہ ہے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ ایسا نہیں ہوگا۔ سارہ نے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے مجھے، سنیں خود بھی تم سے ملنا چاہتی تھی۔ سارہ کبھی کسی لفظ

آدھی کی حمایت نہیں کر سکتی۔ تم سے مل کر مجھے اس بات کا ایک بار پھر سے یقین ہو گیا ہے۔“

کچھ ہی دیر میں سرتاؤک بھی گھر کے پچھواڑے سے نمودار ہو گئے۔ آج واقعی وہ اپنے رواجی لباس میں لباس تھے۔ سر پر چھوٹی سی سفید ٹوپی، جسم پر لمبا سا چادر ہاتھوں میں لٹکڑی کی بڑی سی تسبیح۔ مجھ سے انہوں نے تشدد پیشانی سے ہاتھ ملا دیا۔ کچھ دیر ہم موسم کی اور دھواں دھری معمول کی باتیں کرتے رہے پھر سارہ نے ہمیں کھانا لنگ جانے کی اطلاع دی۔ کھانا واقعی بہت لذیذ تھا۔ سارہ اور مسز جینی نے مل کر اپنے ہاتھوں سے بہت سی ایسی ڈشز تیار کی تھیں جو اس سے پہلے سنیں نے کبھی نہیں کھیں تھیں۔ مثلاً کھجور کا ایک خاص قسم کا طوطا جو انکس اور ناریل کی قاشوں میں ہال کر بھرا گیا تھا۔ ہرن کے گوشت کے نمکین کباب اور اس جیسی اور جانے کیا کیا سوغا تھیں۔

سنیں نے مسز جینی سے کل کر کھانے کی تعریف کی اور انہیں یہ بھی کہا کہ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ سارہ بھی واقعی اتنا کچھ بنا سکتی ہوگی۔ جواب میں سارہ صرف مسکراتی رہی۔ سرتاؤک نے سارہ سے کھانے کے دوران کوئی بات نہیں کی۔ کھانے کے بعد مسز جینی اور سارہ کچن میں مصری قبوہ بنانے کے لیے چلے گئے۔ سنیں نے یہ بات بھی نوٹ کی کہ گھر میں جو دو چار ملازمتیں وغیرہ نظر آ رہی تھیں، انہوں نے صرف کھانا لگانے اور برتن اٹھانے میں ماں بیٹی کی مدد کی ورنہ زیادہ تر کام خود سارہ اور مسز جینی نے ہی خود اپنے ہاتھوں سے کیا۔ سنیں نے نکلیں پڑھا تھا کہ یہ یہودیوں کا دوسروں کو عزت دینے کا ایک خاص انداز تھا۔ مجھے کامران کی بات یاد آئی جو اس نے یہاں کے لوگوں کے بارے میں بتائی تھی۔

سارہ اور جینی کے جانے کے بعد میں اور سرتاؤک ڈائننگ ٹیبل پر چہارہ گئے، انہوں نے خود سے میری طرف دیکھا۔

”تمہاراظم بیچہ کہاں تک پہنچا۔۔۔۔۔ مجھے امید ہے کہ تم کوئی بہتر پرچہ تیار کر دو گے۔ کیونکہ یہ آئندہ ہمیشہ یونورٹلی کے ریکارڈ میں رہے



سے اپنی غلطی تسلیم کی کہ ان کے شوہر کی وجہ سے بدحالی ہی پیدا ہو گئی تھی اور اس بات کے لیے انہوں نے مجھ سے معذرت کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے فوراً انہیں روک دیا۔

”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ مجھے یہاں آ کر واقعی بہت اچھا لگا۔ آپ سے ملنا بھی زندگی کا ایک بہت خوبصورت تجربہ ہے۔ آپ کو کسی معذرت کی ضرورت نہیں ہے۔“

”دراصل میں سمجھتی تھی کہ تمہارے یہاں آنے سے آؤزک کو تمہارے بارے میں مزید جاننے کا موقع ملے گا۔ اور ان کے اور سارے بچے میں تناؤ میں کچھ کمی آئے گی۔ لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔ میں نے آج تک پوری زندگی میں کبھی آؤزک کو اس قدر بدچلتا نہ دیکھا ہے۔ وہ یقیناً کسی شدید ذہنی یا دماغی شکار ہے۔“

میں مسر جینی کا ہاتھ چمک کر ہاں سے اٹھ گیا۔ انہوں نے باہر تک مجھے چھوڑنے کے لیے آنا چاہا لیکن میں نے انہیں روک دیا کہ ہمارے ہاں بڑے چھوٹوں کو ہوں شرمندہ نہیں کرتے۔ میں باہر نکلتا ہوا خشک تھی اور نوا میں برف کے چھوٹے چھوٹے ڈزے شامل ہو کر ادھر ادھر ڈولنے ہوئے گر رہے تھے۔ میں نے اپنی جیکٹ کے کالر اٹھا لیے اور دو درختوں سے بنی کچی روش پر کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ گاڑی کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اندر سے سارہ مجھے آواز دیں وئی، اور تقریباً دوڑتی ہوئی باہر نکل آئی۔ اس نے جلدی میں کوئی گرم چیز بھی ادھر ادھر سے کے لیے نہیں لی تھی اور مجھ تک پہنچتے پہنچتے ہاتھ دھو چکا ہے۔

”یہ کیا بات ہوئی۔۔۔ تم مجھ سے وداع لیے بغیر کیسے نکل پڑے۔۔۔ میں تو پاپا سے بات کرنے کے لیے دو گھنٹی اندر کیا تھی تم تو ہاتھ دھو رہے ہو۔“

”جس نمے میں تم وہاں سے نکلیں گے۔ مجھے نہیں لگا تھا کہ تم جلد واپس آؤ گی۔ اور تمہاری ماما پاپا چارے خواہ مخواہ میرے سامنے معذرتیں پیش کر کر کے تم تک جاتیں۔ سو میں نے سوچا کہ نکل جانا ہی بہتر ہے۔ ہاں البتہ میں رات دیر گئے تمہیں فون ضرور کرتا۔“

سارہ کے چہرے پر بھی غماض ہی تھی۔

”مجھے پاپا سے اس رویے کی اذیت نہیں تھی۔۔۔ مجھے معاف کر دینا۔۔۔ پلیز۔۔۔“

”یہ تم کیسے کہہ رہی ہو۔ یقیناً ہاتھ مجھے سراسر آؤزک کی کوئی بھی بات نہ ہی نہیں لگی۔ انسان اپنے نظریات کے بارے میں جذباتی ہوتی ہوتا ہے۔ وہ تو انہوں نے خود اس بات کا ذکر پچھلے دنوں کیا تھا اور نہ میں اس جگہ بھی ان سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کرتا۔ تم یقیناً کرو۔ یہاں آ کر میرے دل میں تمہاری تمہاری ماما اور سراسر آؤزک کی عزت اور زیادہ بڑھی ہے۔ اس میں ذرا برا برا بھی نہیں ہوئی۔ اور یہ میں پورے غلطیوں سے کہہ رہا ہوں۔“

سارہ کچھ دیر تک یونہی ٹپ سی کھڑی رہی۔ میں جانتا تھا اس جیسی وضع دار لڑکی کے لیے یہ کس قدر مشکل مرحلہ ہو سکتا تھا۔ بنو میں جیڑی آ گئی تھی اور اب ہاتھ دھو برف باری شروع ہو گئی تھی۔ برف کے بڑے بڑے گالے ہم دونوں کے بالوں میں پائیدار سی سمجھنے لگے تھے۔ میں نے

اپنی جیکٹ آٹا کر سارہ کے کانٹھوں پر ڈال دی۔ اور اس کے بال کھیر دیے۔

”ہلو آپ تم اندر جاؤ۔ سردی بڑھتی جا رہی ہے، کہیں جھین کچھ ہو گیا تو سر آٹک ڈالیں میرا داخلہ یونیورسٹی میں بند کروں گے۔“

میرا یہ وار کا رگڑا اور دوپٹے سے منس دی۔ اس کے دل کا بوتھم ہوتا دیکھ کر مجھے بھی بہت سکون محسوس ہوا۔ اس نے ہلکے سے مجھے جھپڑا۔

”آج احساس ہو رہا ہے کہ تم لوگوں کو کیسے جیت لیتے ہو۔ لیکن یاد رہے یونیورسٹی میں تمہاری اور تمہارے نظریات کی سب سے بڑی مخالف آپ بھی نہیں ہی ہوں۔ نہیں اتنی آسانی سے ہار نہیں مانوں گی۔“

میں مسکراتا ہوا گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ میں نے انکیشن آن کی اور کھڑکی سے سر نکال کر اسے جواب دیا۔

”ہلو تم نے آج اتنا تو تسلیم کر لیا کہ تم کبھی نہ کبھی ہارو گی ضرور۔ چاہے آسانی سے نہ کی۔۔۔ بہت جدوجہد اور جتنو کے بعد ہی سی۔“

اُس نے مسکراتے ہوئے مجھے الوداع کہا۔ جب میں گاڑی اس کے محل نما گیت سے باہر نکال رہا تھا، تب میں نے بیک ویو مرر Back

view mirror میں دیکھا کہ وہ ابھی تک جیز گرتی برف میں دوپٹے کھڑی مجھے جاتا دیکھ رہی تھی۔ برف اس کے بالوں اور ہلکے سے گڑھے پڑے

گالوں کو چھو چھو کر زمین پر گر رہی تھی۔ جیسے طرف کی کوئی فضا ہوائی اپنی سلطنت میں کھڑی ہو۔ میری گاڑی نے تیزی سے موڑ کاٹا اور میں رفتہ رفتہ اس

کے محل سے دور ہوتا چلا گیا۔ لندن سنسان تھا، رات گہری تھی اور سڑکیں خالی تھیں۔ میرا دوست دریاے ٹیمز بھی منٹھی غنیمت سو رہا تھا۔ سفید برف کی

رشتائی نے اُسے ڈھانپ رکھا تھا۔ سڑکوں کے کنارے لمبے لمبے درخت ایک دوسرے کو کہانی جانتے جانتے پپ سے ہو گئے تھے اور حیرت سے برف

کے گالوں کو خود سے شرارت کرتا دیکھ رہے تھے۔ رات کے سٹالے میں گرتی برف کا منظر اور لطف وہی لوگ جانتے ہیں جو خود کبھی رات میں تنہائی میں

کسی دیرانے میں برف گرتی دیکھ چکے ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے آسمان سے ننھے سفید گالوں کی صورت میں نور کی برسات ہو رہی ہو۔ گرتی برف کی اپنی

ایک سفید دودھی سی روشنی ہوتی ہے جیسے بہت سے جھنوک وقت آپ کو راستہ دکھا رہے ہوں۔ ایسے ہی بہت سے جھنوکاں وقت میری روزنی گاڑی

کے آس پاس گرد ہے تھے، مجھے اس وقت بھیچن میں ناٹی لٹاس سے شنی ایک اور بہت شدت سے یاد آ رہی تھی۔ جس کے بول کچھ یوں تھے۔

”چند اکوڑ موٹے نے کبھی۔۔۔“

تارے نکل پڑے

محلوں کی غنیمت چھوڑ کر

سارے نکل پڑے۔۔۔۔۔“

میری گاڑی سفید برف سے بھری سڑک پر پھسلتی جا رہی تھی۔ میں بھی تو اک ٹوٹا ٹوٹا رہا تھا۔ جو اپنے چاند سے جھڑک جانے کب سے اُسے

دھوڑ رہا تھا۔



## وہ ایک ملاقات

اس روز منج سے ہی آسمان پر بادلوں کے کٹکڑے شریک بچوں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ آخر ستمبر کی مٹی سی سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ دھوپ اپنی تمازت کھو چکی تھی اور سائے لمبے اور سرد تھے۔ پلا آخر بادلوں کے ان شریک کلوں نے ایک دوسرے کو پکڑ لیا اور سارا آسمان گہرے کالے بادلوں سے ڈھک گیا۔ نہیں اس وقت گیارہ بجے والی مال گاڑی سے مال اتار دیا تھا جب پہلی بوند نے میرا ہاتھ چوم لیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں آسمان سے مینہ کی چھڑی برسا شروع ہو گئی۔ مزدوروں نے بھاگ کر ادھر ادھر چھپنے کی جگہ تلاش کرنا شروع کر دی۔ غور سے نے ایک برآمدے کے ککڑی اور ٹخن سے بنے چھت کے نیچے پناہ کر لی تھی۔ آوازیں دینا شروع کر دیں کہ نہیں وہاں ککڑا بھی کتا رہوں بلکہ برآمدے کی طرف چلا آؤں۔ ہالے لوگ بارش سے کیوں چھپتے ہیں۔ بارشیں تو تن اور سن کو کھٹکڑا جلا کر دیتی ہیں۔۔۔۔۔

اسے میں ذور سے صدیقی صاحب کے دفتر کا چہرہ اسی چھڑی سر پر تانے بارش میں مزہ مزہ لے لے ڈگ بھرتا ہوا پلٹ فارم کے آخری سرے سے نمودار ہوا۔ اور میرے قریب آ کر کہنے لگا۔

”خدا بابو۔۔۔ صدیقی صاحب کے دفتر میں آپ کا فون آیا ہے، وہ بتاتے ہیں آپ کو۔“

”میرا فون؟“

نہیں حیرت سے بڑھایا۔ لیکن زیادہ سوال جواب کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے میں اس کے پیچھے ہی چل پڑا۔ غور سے گواہی کے اشارے سے ذوری سے سمجھایا کہ میرا فون آیا ہے۔ صدیقی صاحب کے دفتر تک پہنچتے پہنچتے نہیں پورا شراپور ہو چکا تھا۔ اس لیے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر باقاعدہ خود کو جما ڈنا پڑا۔

اتحاد داخل ہوا تو دو چار ملاقاتی یا شاید مسافر صدیقی صاحب کی میز کے گرد جمع تھے۔ صدیقی صاحب کے کمرے میں ایک ہی نمبر کی دو لائٹیں تھیں۔ ایک فون ان کی میز پر اور دوسرا سامنے بیٹھے ہیڈ کلرک کی میز پر رکھا تھا۔ زیادہ تر فون ان کا ہیڈ کلرک بشیر ہی وصول کرتا تھا۔ لیکن اس وقت دونوں ہی فون خاموش کر لیے پر پڑے تھے۔ نہیں نے سوالیہ نظروں سے بشیر کی طرف دیکھا۔ صدیقی صاحب نے فونوں پر سے نظر اٹھائے بغیر مجھ سے کہا۔

”لائٹ بجی ہوئی جا رہی تھی، نہیں نے دوبارہ کرنے کا کہا ہے۔ جینے جاؤ۔ ابھی کال آئی ہی ہوگی۔“

نہیں وہیں ہیڈ کلرک کی میز کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بشیر نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

”کسی لڑکی کا فون تھا۔“

نہیں نے چونک کر بشیر کی طرف دیکھا لیکن اس کے چہرے پر ایک مصمم سی مسکراہٹ کے علاوہ دیگر کوئی خبر نہیں تھی۔ یہ کون سی لڑکی تھی جو

مجھے صدیقی صاحب کے نمبر پر فون کر رہی تھی۔؟

باہر مسلا دھار بارش مڑے تیز ہو گئی تھی اور کمرے کی کھڑکی سے باہر جہاں تک اسٹینٹ اور پلیٹ فارم دکھائی دیتا تھا وہاں ہر چیز جیسے دھل سی گئی تھی۔ کالی جھڑیاں تانے لوگ ادھر ادھر تیزی سے چلتے ہوئے گزر رہے تھے، کچھ دور اندیش جو صبح کے وقت موسم کے تیز ویکہ کر گھر سے نکلے تھے اور وہ اپنی لمبی لمبی برساتیاں پہنے، کالرا اٹھائے دوسروں کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ وہ مکھوٹا مانتے تھے کہ آج بارش ہوگی۔ اسے میں اس کا فون کی کھنٹی بھی۔ میں اپنے خیالات میں اس قدر مگن تھا کہ بس اچھلتے اچھلتے رہ گیا۔ بشیر نے فون اٹھایا۔

”جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ یہ ایس بات کریں۔“

بشیر نے فون میری طرف بڑھایا، میں نے ریسیور کان کے ساتھ لگا لیا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ حاد بول رہا ہوں۔“

دوسری طرف سے ایک نازک اور ٹھنکی سی آواز ابھری۔

”جی۔۔۔۔۔ ہیلو۔۔۔۔۔“

”جی کون بول رہی ہیں۔“

”منیسا۔۔۔۔۔ میں حاد بول رہی ہوں۔“

میرے ہاتھ سے ریسیور گرتے کرتے بچا۔ حیا۔۔۔۔۔ فون پر۔۔۔۔۔ یہاں۔۔۔۔۔ اس وقت۔۔۔۔۔؟

”آپ۔۔۔۔۔ آپ کو یہ نمبر کیسے۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے، سب ٹھیک تو ہے نا۔“

حیا کچھ جلدی میں اور کچھ گھبرائی ہوئی سی تھی۔

”جی۔۔۔۔۔ سب ٹھیک ہے۔ کیا آپ آج شام چار بجے نہ اپنی حویلی آ سکتے ہیں۔“

”نہ اپنی حویلی۔۔۔۔۔ جی ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔“

”کوئی سوال نہ پوچھیں گا، میں سمجھاؤں گے ہاں سے بڑی مشکل سے فون کر رہی ہوں بس آپ تک ایمان آئی گا یہ پیغام پہنچانا تھا۔“

دیکھیں وقت پُرآ جا رہے گا۔ یہ بہت ضروری ہے۔ باقی بات وہیں ہوگی۔! سنے گا ضرور۔ خدا حافظ۔

ایمان کا پیغام۔۔۔۔۔ پاؤں۔۔۔۔۔ یہ لڑکی کیا کہہ رہی تھی۔ کیا ایمان بھی وہاں آنے والی تھی، میں نے فوراً اسے روکنے کے لیے کہا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔ ریسیور پر بات۔۔۔۔۔“

لیکن دوسری طرف سے لائن کٹ چکی تھی۔ باہر زور سے پاول گرہا اور پھوار کا ایک تیز ریڈا ہوا کے ایک شدید جھونکے کے ساتھ کھڑکی سے آ کر گر گیا۔ کھڑکی کے پتے کھل گئے اور پانی کی پوریں اندر کمرے میں بہت کچھ بھگو گئیں۔ بشیر نے جلدی سے اٹھ کر کھڑکی بند کی۔ میں اب تک ویسے ہی کم صم بیٹھا ہوا تھا۔ یہ حیا کیا کہہ گئی تھی۔ ایمان نے مجھے نہ اپنی حویلی پہنچنے کا پیغام کیوں دیا۔۔۔۔۔؟۔۔۔۔۔ کیا واقعی وہ خود بھی حویلی آ رہی





علاقے میں داخل ہو چکا تھا اور اسٹاف کالج روڈ کے قریب پہنچنے والا تھا کہ اچانک ایک سوڑ سے ایک خالی ٹانگہ جو شاید کسی فوجی سواری کو اسٹاف کالج چھوڑ کر واپس جا رہا تھا، نمودار ہوا۔ میں نے فوراً ٹانگے والے کو روکنے کا اشارہ کیا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر جتنے بھی روپے ہاتھ میں آئے انہیں نے اسے تھما دیے اور اسے تیز اور جلدی پرانی حویلی کی طرف چلنے کو کہا۔ ٹانگے والے نے گھوڑے کو اشارہ کیا اور کچھ دیر تک سڑک پر ٹانگہ تیزی سے دوڑنے لگا۔ اس پاس گئے بادلوں اور کالی گھٹا کی وجہ سے گہری شام جیسا اندھا میرا چہانے لگا تھا۔ ایسے میں جب بجلی زور سے چمکتی تو یوں لگتا کہ جیسے کسی نے پل بھر کے لیے تمام ماحول پر قحطی ہی پھیر دی ہے۔ بادل ویسے ہی زور زور سے گرج رہے تھے اور برقی بارش کی بو چمڑ میں بھاگتے ہوئے پانی سے شرابہ گھوڑے کے حقنوں سے ہر لپٹی سانس کے ساتھ گرم ہواپ کے سر غوغا سے اٹھ رہے تھے۔ کچی سڑک سے آواز گھوڑا گیلی کی زین پر بڑے پانی کے گڑھوں اور کچھڑ میں چپ چپ کرتا ہوا حویلی کے راستے پر دواں دواں تھا۔

ٹانگے والے نے اپنے معاذ سے کا پورا حق ادا کیا اور مجھے ٹھیک چار بجے حویلی کے پھاٹک پر آ جا دیا۔ وہاں پہلے ہی سے ایک اور ٹانگہ بھی کھڑا تھا۔ لگتا تھا کوئی سواری آئی تھی، جس نے موسم کے تیز دیکھ کر اسے دابھی کے لیے یہیں روک لیا تھا۔ میرے ٹانگے والے نے بھی مجھے پیش کش کی کہ نہیں اگر وہ ابھی کا کار اور رکھتا ہوں تو وہ یہیں انتظار کر لے گا۔ میں نے اسے بھی روکنے کا کہہ دیا۔ دلوں ٹانگے والے آپس میں خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے۔ میں برقی بارش سے بے پیکر لکڑی کا پھاٹک کھول کر حویلی میں داخل ہو گیا۔ ایک عجیب سا ستانا اور ایک عجیب سی آواز می چھائی ہوئی تھی پورے ماحول پر۔

اچانک حویلی کا پڑا انا چوکیدار اللہ بخش کسی جانب سے نمودار ہوا اور مجھے سلام کر کے بتانے لگا کہ نگہبانی بی ابھی بڑے گول کمرے کی طرف گئی ہیں۔ پڑا حویلی کے یہ سارے پڑا انا کو کمرے کے بچپن کے گواہ تھے اور شاید کبھی میرے ملازم اور بھی۔ اب سبھی کو یہ بتا تھا کہ میں نے گھر چھوڑ دیا ہے اور میں شاکر اور نگہبانی وغیرہ سے ملنے یہاں آتا ہوں۔ سبھی یہ بھی جانتے تھے کہ میرے گھر والے میری یہاں آمد کے چارے میں باخبر نہیں تھے لیکن ان میں سے کبھی کسی نے جا کر یا با یا امی کو میرے بارے میں خبر نہیں دی تھی۔ شاید اس طرح سے ان سب نے میرے گھر چھوڑنے کے فیصلے کی توثیق کر دی تھی۔

میں چوکیدار سے مل کر آگے والا ان کی طرف بڑھ گیا جس کے سرے پر برآمدہ تھا جس کے سامنے گرمیوں میں ایک قطار سے گھڑی کی بڑی بڑی سے ٹکیوں ڈلی رہتی تھیں۔ اس وقت بارش کی وجہ سے تمام چکوں کو گول سیٹ کراؤ پر بندھی برآمدے کی ڈوری سے باندھا دیا گیا تھا۔ برآمدے کی چھت پر سب پر تانوں سے بارش کا شیا لا پانی پوری رفتار کے ساتھ نیچے گر رہا تھا اور انٹوں سے بہنے لگن میں بنی ہوئی چھوٹی کچی اینٹ کی ٹالیوں سے ہوتا ہوا مختلف کیا ریوں میں گر رہا تھا۔ فضا میں صرف ایک ہی پانی گرنے اور بہنے کی آواز تھی باقی سب کچھ جیسے جامد تھا۔

جیسے ہی میں گول کمرے والے برآمدے کی طرف ہڑا۔ مجھے برآمدے کے کونے میں سفید چادر میں لپیٹی حیا دکھائی دی جو برآمدے کی چھت سے گرتے پانی کے ایک پر تالے سے جتنی پھوار کو ابھی اچھلی میں جذب کرنے کی کوشش میں ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی۔ آہٹ سن کر اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور جلدی سے مجھے سلام کیا۔ میں اس کی طرف چلا آیا۔

”آپ اس موسم میں یہاں تک کیسے پہنچ گئیں۔ سب تحریرت تو ہے نا۔“  
دو ہفتے سے سگائی۔

”ہم تو عام اور اچھے موسم میں بھی گھر سے نہیں نکل پاتے۔ لیکن آپ کی ان چار لائٹوں نے آنے پر مجبور کر دیا۔ آپ نے کوئی دوسرا چارہ  
بھی تو نہیں چھوڑا تھا۔“

مجھے اس کے جواب سے کچھ الجھن سی ہوئی۔

”منیں سمجھا نہیں۔۔۔۔۔ آپ۔“

پھر مجھے فوراً نگہت کا خیال آیا۔

”نگہت کہاں ہے۔ آپ اکیلی یہاں کیا کر رہی ہیں۔“

اس کی آنکھوں میں آب وہی مخصوص سی شرارت تھی۔ وہ سامنے والے کمرے کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

”میں اکیلی نہیں ہوں، جا بیٹے بل لیجئے۔۔۔۔۔“

میں اسی حیرت اور الجھن میں اس نازک اندام کو دیکھتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اگر نگہت اندر کمرے میں تھی تو پھر وہ یہاں باہر  
برآمدے میں برقی بارش میں کیوں کھڑی تھی۔ بجلی بھی شاید بارش آتے ہی جا بجلی تھی۔ اندر کمرے میں دو چار شخصیں روشن تھیں۔ میں نے دروازہ کھولا  
تو چند لمحوں میں مجھے اندھیرے میں کچھ نظر ہی نہیں آیا۔ دفعتاً بادل زور سے گرجا اور بجلی کی لپک نے پل بھر کے لیے سب کچھ روشن کر دیا اندر کمرے میں  
دیوار کے ساتھ سگری بیٹھی ہوئی۔ رشتی وجود کو ایک گٹھڑی میں پل بھر کے لیے ایک غنمش ہوئی۔ اس کے ساتھ حلق پر کبھی موسم حق کا شعلہ زور سے  
پھڑکا اور کسی کے ماتھے پر وہی اک مخصوص شرارتی سی لٹ لہرا گئی۔ سارا کمرہ اس کی جہیں کے زور سے روشن ہو گیا۔ وہ ایمان تھی۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ وہ

ایمان ہی تھی۔۔۔۔۔ مجھے جیسے سکھ سا ہو گیا تھا۔ میں وہیں دروازے کے پاس اس عجوبے کے ہو جانے کا یقین کرنے کے لیے کھڑا کھڑا ہو گیا۔  
شاید میں خواب دیکھ رہا تھا۔ شاید نہیں۔۔۔۔۔ دیکھنا ہی کوئی خواب ہی تھا۔ میری تقدیر مجھ پر اتنی مہربان تو اک زمانے سے تھی۔

لیکن وہ ایمان ہی تھی۔ سر تا سر جسم ایمان، اس نے مادہ سا سفید لباس پہنا ہوا تھا اور ایک کالی ٹائل میں دھکی ہوئی تھی۔ شاید باہر کھڑے  
تائگے میں ایمان اور حیاء وغیرہ بھی آئی تھیں۔ کیونکہ ایمان کے ماتھے پر اور بالوں میں ابھی تک برسی پوندوں کے ستارے ٹھنرا رہے تھے۔ ماتھے کی  
لٹ بھی جھکی ہوئی تھی۔ اور وہ اس کرنے میں دشمنی حب معمول اپنے نازک پاؤں کے ناخنوں سے نیچے نیچے ٹالین کو کر پید ہی تھی۔ اس نے دھیرے  
سے ویسے ہی سر جھکائے مجھے سلام کیا۔ چند لمحوں میں اسے کچھ بول ہی ختم پایا، جیسے میری آواز ہی گنگ ہو گئی تھی۔ پھر بڑی مشکل سے میری زبان  
سے کچھ نکلا۔

”آپ۔۔۔۔۔؟ یہاں۔۔۔۔۔؟ غمخیز ہے۔۔۔۔۔ کچھ دیر لگے گی مجھے اپنی قسمت اور خوش نصیبی پر یقین کرنے میں۔“

کبلی مرتبہ نہیں نے ایمان کے چہرے پر حیاء کی ایک سرخ لہر لگڑ گڑتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا، وہ ہانپنے

کیا کہنا چاہتی تھی لیکن مجھے یوں دانش میں بھیجا ہوا دیکھ کر وہ پریشان سی ہوئی۔

”آپ۔۔۔۔۔ آپ تو بہت بھیک بکے ہیں۔ میں محبت سے کہتی ہوں آپ کے لیے کوئی تولیہ وغیرہ۔۔۔۔۔“

اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے جلدی سے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔ جیسے مجھے ڈر تھا کہ اگر وہ اس کمرے سے نکل گئی تو میرا یہ زندگی کا سب سے خوبصورت خواب اُور اسی ٹوٹ جائے گا۔

”پلیز۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔ آپ بیٹھی رہیں۔۔۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔۔۔ کچھ دیر میں خود ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔۔ آپ کہیں نہ جائیں۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔“

میں جلدی سے دروازے سے ہٹ کر اس کے قریب آ گیا۔ ایمان اٹھنے اُٹھتے پھر بیٹھ گئی۔ اب وہ مجھ سے صرف دو قدم کے فاصلے پر تھی۔ اتنے قریب۔۔۔۔۔ کہ میں اس کے وجود کی لرزش کو یہاں سے محسوس کر سکتا تھا۔ میں وہیں اس کے قریب بیٹھ گیا، اور بیٹھے وقت میں نے اس زہرہ جیوں کے چلاب بھرے سینے کے انداز کو بھی محسوس کیا۔ یہ لڑکی تھی، مایا پھولوں بھری ایک چمکتی ڈال۔۔۔۔۔

چند لمبے ہم بونٹی ناموش بیٹھے رہے۔ وہ بونٹی سر جھکا کر مٹی میں اپنے وجود کی لرزش پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتی رہی اور میں ہلکی جھپکے بنا اسے ایک تک دیکھتا رہا۔ ہلکی جھپکے کا وقت بھی اس وقت مجھے بے حد مایوس ہو رہا تھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ مجھے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اس کو دیکھوں یا اس سے بات کروں۔ اتنی مشکل تو مجھے کبھی بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ہم دونوں کی بیچ کی ناموشی کا علاوہ صرف باہر برستی تیز ہوندیں پورہ کر رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ جیسے ہم دونوں بہت کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن اس وقت ہم دونوں کے لفظ ہی ناموش ہو گئے تھے۔ پھر اس نے اپنے سر میں ہاتھ میں پکڑا وہ تہہ کی تہہ کا گھڑا گھڑا کلا جس پر میں نے اس دن وہ چہرہ شکر لکھے تھے میں جانتا تھا محبت اس تک یہ کافذ کسی نہ کسی طور ضرور پہنچائے گی۔

”آپ نے یہ کیا لکھ بیجا تھا مجھے۔۔۔۔۔؟۔۔۔۔۔ میں نے تو آپ سے صرف اتنی درخواست کی ہے کہ آپ اپنی ضد چھوڑ دیں۔۔۔۔۔ گھر واپس چلے جائیں۔“ آپ میری بات مان کیوں نہیں لینے۔“

بولتے بولتے اس کی آواز دھکی سی بھڑا گئی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ پہلے سے بہت کمزور نظر آ رہی تھی۔ اس کے نازک سے ہاتھوں کی پشت پر نیلی نیلی رنگین نظر آ رہی تھیں اور چہرے پر بھی ایک بیلا پن مانتا تھا۔

”آپ تو مجھے ہار لگ رہی ہیں، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“

اس نے مجھ پر اک نظر ڈالی۔ اک ذہنی سی نظر جس میں نہ جانے کیا کچھ چھپا تھا۔

”میں یہاں آپ سے صرف یہ وعدہ لینے آئی ہوں کہ آپ اپنے آپ کو مزید سزاؤں میں گم نہ کریں۔ اس دن۔۔۔۔۔ آپ جس جانتے اس دن آپ کو اسٹیشن پر دیکھ کر میری کیا حالت ہوئی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو کتنا صدمہ کھایا تھا کہ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے۔ نا آپ مجھ کو کچھ کہتے اور نہ۔۔۔۔۔“

”خدا کے لیے یہ صامت کیجیے۔۔۔۔۔ آپ کو دیکھنا میری زندگی کا سب سے حسین حادثہ تھا اور آپ کی محبت میری اس بے معنی زندگی کا سب سے حسین تجربہ ہے۔ اس محبت نے مجھے آپ سے ملوایا۔۔۔۔۔ ورنہ میں تو بنا خود کو دیکھ جانے ہی اس دنیا سے چلا جاتا۔۔۔۔۔ اب مجھے اپنی

زندگی سے کوئی کلمہ نہیں ہے۔۔۔ موت بھی آئی تو۔۔۔“

میری بات اس نے تڑپ کر کاٹ دی۔

”آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں، کیوں مجھے میری نظروں میں بار بار گراتے ہیں۔۔۔ کیوں۔۔۔“

وہ اپنی بات پوری کرتے سے پہلے ہی رو پڑی۔ دو موٹے موٹے آسواس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں سے جھٹکے اور زمین پر گرنے سے پہلے ہی نہیں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنی آغوش پر انہیں سولیا۔ اور پھر مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اور کس جذبے کے عالم میں انہیں نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے اس کے دونوں کول منسل پیسے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں قلم لیے۔ باہر بادل زور سے گرے اور بارش کی جھڑی اور جھڑ ہو گئی۔ باہر آسمان رو رہا تھا اور اندر دم و دلوں۔ جانے اس کے ہاتھ پکڑے ہی خود میرے اندر سے یہ آنسوؤں کا سیلاب کہاں سے باہر اُبل پڑا۔ بجائے اس کے کہ میں اسے چپ کرواؤں میری آنکھوں سے بھی آنسو پھٹ پھٹ گرنے لگے۔ اس کے نرم ہاتھ میرے ہاتھوں میں تھے۔ وہ سر جھکا کر بیٹھی تھی، کیا سانسوں کی ڈور ٹوٹنے کے لیے اس سے زیادہ حسین اور کسی گسٹری کی تمنا کی جاسکتی تھی؟

ایمان نے نظر اٹھا کر بیٹھی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ مجھے زندگی میں پہلی بار اس کے حسن کو اتنے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس کی ستارہ نہیں، بڑی بڑی کالی آنکھوں ستواں سی چھوٹی ناک اور لال زمرہ جیسے ہلکے سرخ لبوں کی ہلکی سی مٹھی کی لکڑی جیسے کسی مسور نے بڑی اور اسے رنگوں کو ایک مخصوص زاویے پر لا کر مڑو دیا ہو۔ کہیں بھی تو کچھ کی نہیں تھی۔ اک جب سا اور تھا اس مہرٹ کے پیرے پر۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اپنی انگلیوں سے اس کی آنکھوں کے پیکلے کنارے پونچھ ڈالے اس نے دیر سے سے پھر کہا۔

”آپ میری بات مانیں گے نا ساد۔“

زندگی میں پہلی مرتبہ اپنا نام مجھے اس قدر مقدس، اس قدر محترم اور اس قدر خواہناک محسوس ہوا کہ پہلی مرتبہ اس نے میرا نام پکا رکھا۔

”اگر تمہیں اس سے خوشی ملتی ہے تو میں تمہاری خاطر یہ بھی کر گزروں گا۔“ میرے من سے اپنے آپ اس کے لیے تمکل گیا۔ اس نے دیر سے اپنے ہاتھ مجھ سے چھڑائے اور اپنے دوپٹے کے سر پر لگی کاغذ کھول کر تہاے کیا چیز پتیلی میں بھری، پھر اس نے پتیلی میرے سامنے کی اور کھول دی۔ اس کی آغوش پر وہی دوسری جگہ کار ہے تھے جو میں نے غیبت کے ہاتھ اسے واپس بھجوائے تھے۔

”یہ آپ کی امانت ہے۔ آپ کی یہی ضد تھی نا کہ میں خود انہیں آپ کو واپس کروں۔ آج میں نے آپ کی یہ ضد بھی پوری کر دی۔ اب انہیں اپنے پاس رکھ لیں۔ میرے پاس آپ کو دینے کے لیے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔“

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں پھر پھلک اٹھیں۔ اس نے جلدی سے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔ مجھے کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس کی امداد کو کیسے سنبھالوں۔۔۔ کیا تسلی دوں۔ یہ تو مجھ سے زیادہ مکمل غمخوار ہی تھی۔ میں نے دونوں موتی اس کے ہاتھ سے لے کر اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔ انہیں چہرہ بالور اپنی جیب میں ڈال لیا۔

”ایمان۔۔۔ پلیز چپ ہو جاؤ۔ یہ دوسری میرے لیے دو جہانوں کی تمام نعمتوں سے بھی بڑھ کر ہیں۔ اس سے بڑھ کر کوئی مجھے کیا دے

گا۔ کچھ کہوں تو آج مجھے اپنی محبت بُدی لگ رہی ہے۔ اس نے مجھے تو رو نہ سکھایا دیا تھا۔ آج تمہاری آنکھوں میں بھی آنسو بھر دیے ہیں۔ واقعی۔۔۔ بہت بُرا ہوں میں۔۔۔ اور بہت بُدی ہے میری محبت۔“

اُس نے تڑپ کر سر اٹھایا اور اضطرابی طور پر میرا ہاتھ پکڑ لیا جیسے میری بات کا ناپا جاتی ہو۔ مجھے اپنی محبت کو نہ ابلنے سے روکنا چاہتی ہو۔  
 ”ایسے نہ کہیں، اگر کوئی بُدا ہے تو صرف نہیں ہوں۔۔۔۔۔ اگر کوئی قصور وار ہے تو صرف میں ہوں۔۔۔ میں آپ کی محبت کے بدلے کچھ نہیں دے پائی آپ کو۔۔۔ آپ نہیں جانتے خدا۔۔۔ نہیں کتنی مجبور ہوں۔۔۔ کتنی بے بس ہوں۔۔۔ اب اتنے ساری زندگی کسی خوشی کا منٹ نہیں دیکھا۔ میں اور کیا ابھی بہت چھوٹے تھے جب ہمارے بڑے بھیا آنا فانا چلیا ہماری کا شکار ہو کر ہم سب سے منہ موڑ گئے۔ اب ان کا ہم ابھی تک دل سے نہیں نکال پاتے۔ انہوں نے مجھے اور دنیا کو دنیا کی ہر دولت لا کر دی، جس کی کوئی اولاد و خواہش کر سکتی ہے۔ خود بیخود لگے کپڑے پہننے رہے لیکن ہمیں کبھی کسی سخت وقت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ بھیا کے بعد انہوں نے اپنی ساری توقعات مجھ سے وابستہ کر لی تھیں۔ سچی انہوں نے دھڑ بھڑ مجھے دنیا دی اور دین کی ہر تعلیم سے آراستہ کیا۔ وہ مجھے ساری دنیا سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کئی کتابیں لا کر دیتے ہیں۔ مجھ سے مسائل پر بحث کرنے میں انہیں سب سے زیادہ مزہ آتا ہے۔ میں ہی ان کا سارا جہاں ہوں۔ میں ہی ان کا دن ہوں۔۔۔ میں ہی ان کی رات ہوں میرے مفید دامن پر ایک دھبہ ان کی جان لے لے گا۔ وہ آپ کی خوفناکی محبت سے بہت گھبرائے تھے۔ سچی انہوں نے غفلت میں میرا رشتہ بھی طے کر دیا وہ ابھی مجھے مزید پڑھانا چاہتے تھے۔ میرا اہلہ اسے کا داخلہ بھی بھیجا جانیکا تھا۔ لیکن آپ کی دیوانگی آپ کے جنون کے آگے سب بیہ گیا۔“  
 میں پچ چاپ ناموش نہت، بھاس سنگ مرمر کے حسین مجسمے کے کیوں سے لٹکوں کے موٹی گرد و کچر ہاتھا۔  
 ”کیا تم بھی میری محبت میرے عشق، میری دیوانگی، میرے جنون کو خلد سمجھتی ہو۔“

میرے ہاتھ پر ایمان کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ مجھے لگا وہ میرے ہاتھوں کو حاکم کر آج میری روح ہی سمجھنے لگی۔۔۔۔۔ ”شروع میں جب آپ نے محبت کے ذریعے مجھے اس حویلی میں بات کرنے کے لیے بلایا تھا تب مجھے واقعی بہت ڈر لگا تھا۔ میں بھی اب کی طرح ایسی باتوں کو نہایت بُدا سمجھتی تھی۔ مجھے بھی اُس وقت آپ کی وہ سب کوششیں کسی امیر زادے کا اہنڈاں پہلانا کی ترکیب ہی لگیں۔ پھر جب ایک دن آپ کے گھر والوں نے ابا کے ساتھ رُسلوک کیا تو میں بہت روئی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ آپ کے گھر والوں نے آپ کے قصور کی سزا میں کیوں سنا دی۔ ہر گزبت سے بچ چلا کہ آپ نے گھر چھوڑ دیا ہے۔ اس وقت میں نے اسے آپ کا ایک جذباتی فیصلہ سمجھا تھا اور مجھے سوچتی تھی کہ وہ چاروں میں آپ گھر واپس آ جائیں گے۔ لیکن پھر میں نے ابا کو وہ بارہ بہت پریشان دیکھا۔ جس دن آپ ہمارے گھر میرا رشتہ مانگنے آئے تھے اس دن کے بعد سے میں نے آج تک ابا کو کبھی چین کی فیزموتے نہیں دیکھا۔ ساری ساری رات ٹپکتے رہے تھے۔ میری اماں ایک میڈی سا ڈی ٹی گورت ہیں جو صرف رو کر ہی اپنے شوہر کا دکھ ہانت سکتی ہیں۔ پھر عبداللہ نے بتایا کہ آپ نے ابا کی مسجد میں آنا شروع کر دیا ہے۔ جانے کیوں۔۔۔۔۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی عبداللہ نے جب بھی اور نہ ہی آج تک آپ کے بارے میں کوئی سخت لفظ استعمال کیے ہیں۔۔۔۔۔ میرا دل اس بات کو نہیں ماننا تھا کہ کسی انہنی کے لیے جس سے آپ کی زندگی بھر میں دو لاکھ تین لاکھ نہ ہوئی ہوں اس کے لیے کوئی اس طرح ڈنپا تیاگ سکتا ہے۔

لیکن پھر وہ ہو کر ہی رہا جسے ہر اول اس دن تک جھٹا کارہا تھا اس دن آپ کو ریلوے اسٹیشن پر مزدور کے طے میں دیکھ کر ایک ہی لمحے میں میری ساری زندگی کا فخر میری ساری زندگی کا غرور میرے سب مان، ملی بھر میں ریزہ ریزہ ہو گئے۔ آپ کی محبت کسی بے لگام آنندگی کی طرح آئی اور ایک ہی جھٹکے میں میرے دل کے برسوں سے بندھا کر اڑ کر اندر براجمان ہو گئی۔ میں کچھ بھی تو نہیں کر پائی۔ جب مجھے محسوس ہوا کہ یہ محبت تو اس دن سے کہیں نہ کھٹیں میرے دل میں ہی چل رہی تھی جس دن آپ نے نہیں اس حویلی کی لائبریری میں میرا دست روکا تھا۔ لیکن جب شاید میں اس جذبے سے اس قدر واقف تھی کہ اُسے پہچان نہیں پائی۔ لیکن اس دن اسٹیشن پر آپ نے مجھے مار ڈالا۔ جب سے اب تک مجھے ایک پلی بھی قرار نہیں آیا۔ میری ہر رفت بھی سوچتی ہوں کہ یہ کیسا جذبہ ہے جو پلی میں شہنشاہ کو فقیر اور فقیر کو شہنشاہ بنا دیتا ہے۔ یہ کیسا درد ہے جو دکھائی تو نہیں دیتا لیکن ہر آتی جاتی سانس کے ساتھ دل کو چیرتا رہتا ہے۔ کتنا بے بس کروا رہا ہے اس جذبے نے مجھے۔۔۔۔۔ کتنا مجبور۔۔۔

میں حیرت سے گنگ اس مہتاب کو مستار رہا، اس کی پکوں سے گرتے موتی چھتا رہا۔ وہ اس وقت مجھے پریوں کی کوئی شہر آدمی معلوم ہو رہی تھی جس کی باتیں میرے لیے کسی الف لیلوی داستان سے کم نہیں تھیں۔ ان چند لمحوں نے ہی میری بے وقوف محبت کو کس قدر معتبر بنا دیا تھا۔ میری اس لا حاصل جدوجہد کو کتنا عظیم اور کتنا معنی فیز بنا دیا تھا۔ دو بولتی رہی۔

”اور پھر رہی اسی کسر اس دن آپ کے آن ودا شعرا نے چوری کر دی۔ میں نے سوچا تھا کہ میں آپ کو زندگی بھر کبھی اپنی حالت کی خبر نہ ہونے دوں گی۔ کبھی آپ سے تجسملوں کی کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ لیکن جانے کیوں۔۔۔۔۔ اس دن ان دو لاکھوں نے میرا اندر ہانگس پلٹ دیے۔ وہ شعر پڑھ کر نہیں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ میرے سانس کوئی چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اس شخص کو بنا کچھ کہے چلے جانا اس کی اس لازوال محبت کی تو جین ہوگی۔ شاید مجھے ہی طرح آپ سے ملنا تھا، چاہے پہلی اور آخری مرحلہ ہی کسی۔“

باہر زور سے بجلی لڑکی، ایک لمحے کے لیے کمرے میں اتنی روشنی ہو گئی کہ میں نے اس کے لرزے لبوں پر بھی شمع کے قطرے بھی دیکھ لیے۔ اس نے بتایا کہ تجھ سے اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کا فون نمبر معلوم کر دانے کے بعد انہیں آج موقع ملا تھا کہ وہ حیا کے ذریعے پڑوس کے ماسٹر صاحب کے کمرے سے فون کر داسکے کیونکہ مونوی صاحب ”وہ دن کے لیے شہر سے باہر کسی ضروری کام سے گئے ہوئے تھے۔ ایمان نے بتایا کہ یہاں تک پہنچنے میں اُسے کس قدر دشوار ہیں کا سامنا کرنا پڑا ہے یہ صرف وہی جانتی ہے اور اگر ایسے میں حیا اور رقیبت اس کی مدد نہ کرتیں تو اس کا مجھ سے یوں ملنا ناممکن تھا۔ جانے اسنے دونوں میں اس نازک انجام پر کیا کچھ کر چکی تھی اب مجھے محسوس ہوا کہ وہ اتنی غذا حال ہو چکی تھی کہ بات کرتے ہوئے بھی ہاتھ اندر اس کی سانس پھول ہی جاتی تھی۔ مجھے خود پر غصہ آنے لگا۔ اک سیدھی سا دھی معصوم لڑکی کو میں نے یہ کس پُر خاندان سے پر تحسینت لیا تھا۔ وہ جس کے کوئل قدم پھولوں کی پنکھڑیوں پر پڑیں اب بھی ان کے مہمل جانے کا درد ہو۔ اسے میں نے کانٹوں پر پھٹنے پر مجبور کر دیا تھا، محبت کا زہر اس کے رگ و رپ میں سرایت کر چکا تھا۔ ہاں۔۔۔۔۔ سارا قصور ہی محبت کا تھا۔ میں تو خود اس کی طرح اس سے کہیں زیادہ بے بس تھا۔ اور پھر قصور دور صرف محبت کو ہی کیوں ظہر لیا جائے؟۔۔۔۔۔ اصل قصور دار تو وہ تھا جس نے ہم دونوں کے دلوں میں اس محبت کا بیج بویا۔ اسے پر دان چڑھایا اور اس زہریلی امرتیل کو اس قدر قارور کر دیا تھا کہ آج ہم دونوں اس کے زہر سے بے حال تھے۔ جال لب دم تھے۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ سارا قصور اسی کا تھا۔

جو ہم کمزور انسانوں کے دلوں میں یہ جذبہ پروان چڑھا کر پھر صرف تمنا شاد دیکھتا تھا۔  
ایمان اب تک سسک رہی تھی۔

”نہیں جانتی ہوں آج نہیں نے اس محبت کا آپ کے سامنے اقرار کر کے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ شاید خدا مجھے اس محبت کے گناہ کے لیے نیکی نہ بخشے کہ محبت جب کسی رشتے کے بنا ہو تو گناہ بن جاتی ہے۔ لیکن میرا خدا یہ بھی جانتا ہے کہ آپ سے ملے باور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ میں آپ کو اپنے لیے یوں براہو ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ آج کے بعد میری ساری زندگی اپنے اس گناہ کی معافی مانگنے میں ہی گزرے گی۔ لیکن آپ مجھ سے وعدہ کچھ کر آپ اپنے آپ کو میری اس محبت کی وجہ سے حریف نہیں جلائیں گے۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ میری اس پہلی اور آخری کوشش کو لا حاصل نہیں جانے دیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ آئندہ جب بھی زندگی میں آپ کا نام کسی حوالے سے سامنے آنے تو اس کے ساتھ یہ جوگ کی، یہ ٹو کو جلا کر رکھ کر دینے والی باتیں نہ ہوں۔ میں اپنی خوشی کے لیے آپ سے آپ کی خوشی مانگنے آئی ہوں۔“

نہیں نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

”مجھ سے میری جان مانگی ہوتی جس پر کم از کم میرا اختیار تو ہے، مجھ سے وہ نہ مانگو جو خود میرے بس میں نہیں ہے۔“

”کیوں۔۔۔ کیا زندگی اس ایک ملاقات کے سہارے نہیں کاٹی جا سکتی؟ کیا چند سالوں کا یہ وعدہ صرف اسی ایک ملاقات کی یاد میں بسر نہیں ہو سکتا؟۔۔۔ مجھے پورا یقین ہے۔۔۔ ٹھنکا یہاں نہیں تو نہ کسی۔۔۔ پر وہاں اگلے جہاں میں ضرور آپ کے ساتھ ہوں گی۔۔۔ بس اتنا سادہ نہیں دے سکتے مجھے آپ۔“

اس کی باتوں نے اس نازک کی گل رخ کے اہم داور یقین نے مجھے لاج اب سا کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس وقت کس کرب سے گزر رہی ہے، وہ بے چاری تو اتنی بے بس ہے کہ گناہ کے احساس کی وجہ سے اپنی محبت کا اظہار بھی مکمل کر نہیں کر پاتی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ان لمحوں میں مجھے گناہ تو اب اور سزاؤں کے اس تصور سے ہی شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔ مجھے بھر ایسا لگا کہ جیسے مذہب میری محبت پر ایک مرتبہ پھر ڈاکا مار رہا ہو۔

باہر کی تیز بادش، چھت پر گرنے والی ہینڈوں کی مسلسل سپ۔پ اور اندر بڑھتے اندھیرے میں جلتی شمعوں کے لرزے سائے۔ ایسے میں اس پر ی رخ کا ساتھ، وہ ویسے ہی کانپتی ہوئی ہے جتنی اور بے گل سی گھٹنے جوڑے ٹپٹی تھی۔ اس کی وہ شرارت کیلی ہو کو پھر سے لٹک کر اس کے زخماں چومنے لگی تھی۔ میں بے خودی میں اپنا ہاتھ رک نہیں کا اور میں نے اپنی انگلیوں سے اس کی لٹ کو رخسار سے ہٹا کر مٹانے پر بے کر دیا۔ اس نے ایک دم گھبرا کر مجھ کو دیکھا اور شرم سے دھڑکی ہو گئی اور پھر جیسے ہی اس کی نظر دیوار پر لگے قدیم گھڑیاں پر پڑی تو ایک دم ہلکا کر دھڑکی ہو گئی۔

”آف۔۔۔ اتنی دیر ہو گئی۔۔۔ مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا۔۔۔ اندھیرا ہوئے کو ہے۔ اماں گھر میں کتنی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ ہم لوگ کبھی گھر سے اتنی دیر تک باہر نہیں رہے۔ اب مجھے جانا ہوگا۔“

میرا دل جیسے کسی نے آری سے کاٹ کر رکھ دیا ہو۔ تو اس خواب کا خاتمہ ہونے والا تھا۔ ایمان ہماری تھی۔ میں نے اس سے کچھ دیر اور رکنے کی التجا کی۔ جواب میں بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں جانتا تھا کہ وہ نہیں رک سکتی تھی۔

کاش قدرت ہمیں وقت کو اپنی مرضی سے روکنے کا کوئی کاپی بھی بتا دیتی۔ تو میں آج سات زمین اور آسمان کے خزانے دے کر بھی بدلے میں صرف چند ہل اور سیٹ لیتا۔ اسے میں باہر کسی کے چلنے کی دنگ ہوئی اور پھر کسی نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ ایمان نے جلدی سے اپنی کالی شال منہ پر ڈال دی۔ دروازے سے گھبت اور حیا کا چہرہ ہل بھر کے لیے جھک دکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔ شاید وہ بھی ہمیں اسی قائل وقت کے گزر جانے کا احساس دلانے کے لیے آئی تھیں۔ ایمان نے بے چینی سے میری طرف دیکھا۔

”مجھے آپ کے دھڑکنے کا اتھار ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

میں نے بے بسی سے اس کی جانب دیکھا۔

”گھر سے نکلنے وقت میں نے بھی اپنے آپ سے اور اپنے گھر والوں سے چند وعدے کیے تھے۔ مجھے ان کا بھرم بھی رکھنا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کل کوئی میری محبت کی سچائی کو طعنہ دے۔ لیکن تم اطمینان سے گھر جاؤ۔ تم جو چاہتی ہو۔ ویسا ہی ہوگا۔ بس مجھے کچھ وقت دے دو۔ کہیں میں اپنی نظروں میں ہی نہ گر جاؤں۔“ ایمان نے جلدی سے لٹی میں سر ہلایا۔ ”خدا خواستہ۔۔۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔“

اس کے چہرے پر اب سکون کی پرچائیں تھیں۔

”تمیں جانتی ہوں، آپ میرا ان کبھی نہیں توڑیں گے۔“

وہ جانے کے لیے پٹنی، میرا دل چاہا کہ دوڑ کر اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لوں۔ ہمیشہ کے لیے اور اسے یہاں سے کبھی واپس نہ جانے دوں۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ سخت ضبط کے باوجود اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں آنسو بھری آئے تھے۔ ایک لمحے کو ہماری نظریں۔ اور وہ پلٹ کر باہر چلی گئی۔ میں بے چین ہو کر اس کے پیچھے پکا، برآمدے میں گھبت اور حیا سے اپنے کے لیے کھڑی تھیں۔ ایمان کی آنکھوں میں آنسو کچھ کر وہ دونوں بھی خود پر قابو نہیں رکھ پائیں اور وہ دونوں بھی بس رو پڑنے کے قریب تھیں۔ مجھ کو کچھ کر دونوں نے جلدی سے دوپٹے سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ حیا میرے بالکل سامنے سی ایمان کے ساتھ سر جھکا کر کھڑی تھی۔ اس انجینی اور ایمانی سی لڑکی نے مجھے غیر کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ مٹی کہ آج میری ایمان کو میرے سامنے لا کر آیا تھا۔ میرا ہاتھ بے اختیار اس کے مجھے سر کی طرف اٹھ گیا۔ اپنے سر پر میرے ہاتھ کا بوجھ محسوس کر کے اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں اور پھر مجھے اپنے سر پر ہاتھ رکھ دیکھ کر اس کا دل پھٹک اٹھا اور وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ میں نے اس کا سر اپنے شانے سے لگا کر اسے تھپکا دیا۔ شاید آج ساری کا تسلیت ہی دوری تھی۔ برآمدے سے باہر آسمان آنسو بہا رہا تھا اور یہاں برآمدے میں گھبت اور حیا کی آنکھیں چمک چمک کر پتھر رسا رہی تھیں۔ باہر تانگے والے کا بگل بجا۔ حیا اور ایمان جلدی سے گیٹ کی طرف بڑھ گئیں۔ ایمان جاتے جاتے پلٹ پلٹ کر میری طرف دیکھتی رہی۔ اس لمحے شاید اسے اپنی بڑی سی کالی شال بھی منہ پر ڈالنے کا وہ بیان نہیں تھا۔ اس کا مہتاب سا چہرہ دیکھی آنکھوں کے ساتھ ٹکڑی کے پھاٹک پر غری و دھمیری کی قسمت کے سیاہ آسمان پر چکا اور پھر ہمیشہ کے لیے بادلوں کی اوت میں غائب ہو گیا۔ میں وہیں گھٹوں کے بل برآمدے میں ہی بیٹھ گیا۔ میرا دل اتنی زور سے جھپٹنے کو جا رہا تھا کہ جس سے آسمان وز میں چسٹ جاتیں۔



اس دن ایمان کے چلے جانے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ عشق میں پالینے کی تک تو اس کسک اور تڑپ سے کہیں زیادہ بڑھ کر اور کہیں زیادہ سوا ہوتی ہے جو عشق میں نہ پانے کی صورت میں مجھے ہو رہی تھی۔ مجھے کسی کڑوٹ بھی تو چھین نہیں تھا۔ کچ ہے جنون میں وصل جدائی سے زیادہ زہر بلا طاقت ہوتا ہے۔ اس سے مل کر میرے سینے کی آگ بجھنے کی بجائے اور زیادہ بھڑک اٹھی تھی اور مجھے لگتا تھا کہ جیسے پامگ سب کچھ جلا کر رکھ دیا جائے گی۔

میں نے اس سے وعدہ تو کر لیا تھا کہ میں اپنوں میں واپس چلا جاؤں گا۔ لیکن کیسے۔۔۔؟ اس کے بارے میں نہیں نے ابھی تک نہیں سوچا تھا۔ ابھی سوچتا تھا نگہت کے ذریعے اسے ایک جھوٹا پیغام بھجوا کر کہ میں گھر واپس چلا گیا ہوں، ہمیشہ کے لیے یہ شہری چھوڑ دوں۔ اس کی قہقی اور قصد بخ کا ذریعہ صرف نگہت ہی تھی اور نگہت میری خاطر یہ جھوٹ بولنے پر بھی تیار ہو ہی جاتی۔ اور پھر شاید یہ حار آؤ خری جھوٹ ہی تو ثابت ہوتا۔ پھر جانے کیوں اس بات پر مجھے خود ہی اپنے آپ پر غم آ جاتی۔ اس مضموم اور پری مصمت لڑکی سے اتنا بڑا جھوٹ، جو صرف میری محبت کی لالچ اور محرم رکھنے کے لیے اپنی ساری زندگی کی کمانی لگا کر میرے پاس پھیلی آئی تھی۔ صرف اس بھروسے پر کہ میں اس کی بات ضرور رکھوں گا۔ مجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ جتنا سوچتا تھا اتنا ہی اُلجھتا جاتا تھا۔ وہ اس دن کہہ گئی تھی کہ کیا ساری زندگی بس اک ملاقات کے سہارے نہیں کاٹی جاسکتی؟ اب نہیں سوچتا تھا کہ ضرور کاٹی جاسکتی ہے۔ پر اس کے لیے مجھ جیسے کم ظرف کے لیے ایک اور شرط کا پورا ہونا بہت ضروری تھا۔ اور وہ یہ کہ مجھ سے اس ایک ملاقات کے بعد ہی میرے ہوش و حواس بھی چھین لیے جاتے۔ اس سے ملنے کے بعد یہ کم بخت حافظہ تو میرا سب سے بڑا دشمن ثابت ہو رہا تھا۔ ایک ہفتہ بیت چکا تھا اس سے ملاقات کیسے ہوئے لیکن میری آنکھوں کے سامنے اب بھی ہر پل وہی چلتی رہتی تھی۔ میری سانسوں میں اب بھی اسی کی وہ مالوس سی خوشبو بھی ہوئی تھی۔ میری سانسوں میں اب بھی اس کی وہ دھند کو کھینچ لینے والی طام آواز اور چڑچڑائی کی ٹھٹھک ارتعاش بکھیر رہی تھی۔ میرے لمس کو اب تک اسی کے جانفزائس کی عادت سی پڑی ہوئی تھی۔ یہ کیسی عجیب ملاقات تھی؟ کہ میں ان چند گزلیوں کی ملاقات کے بعد اپنی اس سے پہلی گزار دی ہوئی تمام عمری بھول گیا تھا۔ میں اس ملاقات سے پہلے کیا تھا؟ میری پرندہ پند کیا تھی؟ تمام ڈانٹتے تمام خوشبوئیں تمام حسیات جیسے مٹ گئی تھیں۔ مجھ سے میرا سایہ تک جیسے چھن گیا تھا۔ بس ایمان اور صرف ایمان ہی باقی رہ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے میرا وجود ہی دن اس دنیا میں وارو ہوا تھا جس دن میری ایمان سے وہ آؤ خری ملاقات ہوئی اور شاید اسی دن میں مٹی بھی ہو گیا تھا۔

وہ شاید ایمان سے ملے ہوئے نواں دن تھا۔ اکتوبر شروع ہو چکا تھا، سورج اب جلدی ڈوبنے لگا تھا اور ڈوبنے سے پہلے اس کی سنہری دھوپ ہلکی سردی میں بہت بھگی لگتی تھی۔ جیسے جیسے سردی بڑھتی جا رہی تھی، دھوپ کا ستہرا پن بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ میں پایہ قدم کے اس کو نے پر جہاں سے سورج کو آؤ خری دقت تک سامنے کے پہاڑ کے پیچھے ڈھونڈ رہا تھا کہ کبھی وہاں آ نکلا۔ پانے آج کل میں اپنے کسی بھی پڑا نے رشتے کو دیکھ کر آج میں ڈر سا کیوں جاتا تھا۔ دوسرے دل تھا کہ شاکر مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آ نکلا۔ پانے آج کل میں اپنے کسی بھی پڑا نے رشتے کو دیکھ کر آج میں ڈر سا کیوں جاتا تھا۔ دوسرے دل میں گھر کرنے لگتے تھے۔ شاکر زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ وہ نگہت کو دیکھ دھونڈنے آ پاتا تھا۔ میرے گھر والوں کے بارے میں اس نے بتایا کہ امی اب مکمل طور پر ٹوٹ چکی ہیں۔ مکشہر صاحب سے ان کی اس موضوع پر کئی مرتبہ بحث ہو چکی ہے۔ وہ سب یہ بھی جان گئے ہیں کہ میں کراچی یا اسلام آباد اپنے کسی دوست کی طرف نہیں ہوں، میں لندن کا مران کے پاس گیا تھا بلکہ میں یہیں اسی شہر میں کہیں رہ رہا ہوں۔ شاید آتے جاتے کسی جاننے والے

کی فکر مجھ پر پڑ گئی ہو لیکن میرے گھر والے اس ریلوے اسٹیشن کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے مجھے شہر کے خارجہ اسٹار ہوٹل یا بڑے کیسٹ ہاؤسز میں ہی تلاش کرتے کی کوشش کی ہوگی۔

شا کر اٹھتے ہوئے بولا۔

”خدا بابا۔۔۔ آپ نے پورے گھر کو اس پورے زمانے کو یہ یقین دلادیا ہے کہ آپ کے جذبے سے زیادہ بڑھ کر اس دنیا میں اور کچھ نہیں ہے۔ آپ نے زمانے کو اپنی ٹھوکریں لا ڈالا ہے۔ اب میری صرف اتنی اچھا ہے کہ اگر گھر والے آپ کو واپس بلانا چاہیں تو انکار مست کیجئے گا۔ تجھت آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ اس کی رخصتی بھی طے کر دی ہے اگلے مہینے۔ ہو سکے تو اس سے ملنے کے لیے ایک چکر لگا لیجئے گا۔ چلا ہوں۔“

شا کر مجھے گلے لگا کر وہاں سے چلا گیا۔ میں تہ تجھت کا بیجا ہوا الفاظ کو لا اگلا تھا تجھت نے بہت کرب کے عالم میں یہ خط لکھا تھا، ہر ہر لفظ سے درد لپک رہا تھا۔

”بھیا۔۔۔۔ نہیں جانتی تھی کہ آپ کے جذبوں کے سامنے کوئی نہیں بک پائے گا، بہت طاقت ہے آپ کی محبت میں، آپ کے جنون میں۔ آپ کی محبت نے نامکن کو ممکن کر دکھایا، ایمان بھی لڑکی نے بھی آپ کے جذبے کے آگے سر جھکا ہی دیا، مجھے آپ پر ہمیشہ سے فخر تھا، اور ہمیشہ رہے گا، لیکن وہ بہت نازک بہت معصوم سی لڑکی ہے۔ آپ اس کے لیے نہ حاضر و نہ یکے کا، کیونکہ نہیں جانتی ہوں کہ آپ کی ڈائری میں کتنی ہوں گی۔ جس دن سے وہ آپ سے مل کر گئی ہے اس کی حالت بہت خراب ہے۔ دن رات بخار میں پڑ رہی ہے۔ اس کی اماں کہتی ہیں کہ بارش میں بیٹھنے کی وجہ سے اسے سردی لگ گئی ہے۔ لیکن نہیں جانتی ہوں کہ یہ اس جذبے کی شدت ہے جو آپ کی محبت نے اس کے دل میں جگایا ہے۔۔۔۔ پہلی مرتبہ۔۔۔۔ کیونکہ وہ ایسے کسی بھی جذبے سے ہمیشہ ایمان رہی ہے۔ میں آپ کو نہیں بتانا چاہتی تھی کیونکہ ایمان نے مجھے سختی سے متحسین کیا تھا۔ لیکن حیا کے کہنے پر آپ سے دُعا کی انتہا کرتی ہوں۔ خدا کرے کہ میری ساری خوشیاں آپ کو اور آپ کے سارے غم خدا مجھے دے دے۔“

یہ سنیں بھی کتنی بھولی بھولی ہوتی ہیں وہ یہ نہیں جانتیں کہ ہم سب کو اپنے اپنے حصے کا عذاب کسی نہ کسی صورت بھگت کر ہی جانا ہے۔

میں تجھت کا خط پڑھ کر بے حد غمگین ہو گیا۔ حیا مجھ سے دُعا کی امید کیے بیٹھی تھی۔ وہ بچی اتنا بھی نہیں سمجھتی تھی کہ اگر میری دُعاؤں میں اتنا ہی اثر ہوتا تو آج ایمان میری نہ ہوتی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح سے میرے پر لگ جائیں اور میں ان کو ایمان کے پاس جا پہنچوں۔

مجھے خود پر بھی شدید غصہ رہا تھا۔ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہی تو ہو رہا تھا۔ میں نے ہی اس نازک سی لڑکی کی رگوں میں عشق کا یہ نیٹکوں زہر اتارا تھا اور لوگ مجھ سے ہی اس کے تریاق کی امید بھی کر رہے تھے۔ کچھ کہ محبت ایک نرم گلابی موسم کی طرح ہر قسم پر اثر کرتی ہے لیکن رفتہ رفتہ یہی گلابی موسم ایک بکئی آگ میں بدل جاتا ہے۔ اس پاس ٹیلی تنلیاں مجلس کر رہ جاتی ہیں۔ سب پھول ساری پنکھڑیاں مل کر راکھ ہو جاتی ہیں۔

اور پھر اس نازمین کے کوئل وجود کو جلا لے کے لیے تو ذہب کی کڑی دھوپ ہی کافی تھی۔ ایک ماحرم سے بات کرنے کا احساس جرم ہی

اس کو ساری زندگی تڑپانے کے لیے بہت تھا۔ یہی میں اگر محبت کی آگ بھی اس پیش کو رو آٹھ کرنے کے لیے موجود ہو تو پھر اس کی تڑپ کا اندازہ میں خوب کر سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کا وجود اسی مذہب اور محبت کی جنگ کے بیچ مجلس رہا تھا۔ مذہب اسے مولوی عظیم کی طرف کھینچ رہا تھا اور محبت اسے میری طرف دھکیل رہی تھی۔ اور اس کھینچا تانی میں دور بڑھ رہا، دور بڑھ رہی تھی۔ اس کا نازک بدن کٹ رہا تھا۔ روح تقسیم ہو رہی تھی۔ میں ابھی تک یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ مذہب ایسی محبت کے خلاف کیوں ہے؟ اور اگر ایسی محبت جرم ہے تو یہ جرم اپنے ساتھ احساسِ خدا مت، خوف اور افسوس کی بجائے خوشی و مسرت کیوں لے کر آتا ہے؟ کیوں یہ جرم بار بار کرنے کو بھی جانتا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر گناہ کے بعد انسان کو چند لمحے کے لیے ہی کیوں نہ سبکی، بہت ساف ضرور ہوتا ہے۔ لیکن یہ محبت کیسا گناہ ہے جو ہر روز گزرنے کے ساتھ ساتھ اور نیا اور حسین ہوتا جاتا ہے۔ یہ کیسا گناہ ہے جو دل کو فرو کرنے کی بجائے بر لھو اس میں نئی روح پھونک رہا ہوتا ہے۔ تو پھر کیا میں سمجھ لوں کہ مذہب کا محبت کے بارے میں یہ کلی ہی ہمیشہ سے غلط تھا اور غلط ہے؟ مذہب اگر انسانوں سے، رشتوں سے، جانداروں سے، حتیٰ کہ پھول پودوں اور نباتات و حیوانات سے بھی محبت کرنے کا درس دیتا ہے تو پھر اس محبت کو غلط کیوں کہتا ہے۔ کیوں ایسی محبت کو بھی گناہ سمجھتا ہے جس میں سوائے ایک دوسرے کو دیکھنے اور بات کرنے کے اور کوئی مادی چاہ نہ ہو۔ پاک محبت بھی گناہ کے زمرے میں کیوں آتی ہے۔ صرف اس اندیشے کی بنیاد پر کہ آگے چل کر مواقع ملنے پر اور تہائی بھرا آنے پر یہ محبت بھی سبلی جذبات میں دخل جائے گی، اور اگر ایسا نہ ہو۔۔۔۔۔ اگر جسم کا حصول ہی اس محبت کی ترجیحات میں کبھی شامل بھی نہ رہا ہو تب کیا ایسی محبت مذہب کے لیے قابل قبول ہو جاتی ہوگی۔۔۔؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں۔۔۔؟

مذہب کو تو صرف محبت سے پیدا ہونے والے گناہ کے جذبے سے روکنا چاہیے۔ محبت سے نہیں۔ میں تو مذہب کے اس فلسفے کو سمجھنے سے ہی قاصر تھا۔ میں تو اسی محبت کے دھیلے سے مذہب کے قریب ہوا تھا۔ اور اب جب کہ یہی مذہب مجھے محبت کرنے سے روک رہا تھا تو میں خود بخود اس مذہب سے زور دے رہا تھا۔ بلکہ میں ایمان کی اس حالت کا ذمہ دار بھی براہِ راست اس مذہب کو ہی سمجھتا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں مولوی عظیم کے قدموں میں جا کر بیٹھ جاؤں۔ ان کے پاؤں پکڑ لوں کہ ہمارے درمیان یہ مذہب کی دیوار کھڑی نہ کریں۔ ہم دونوں کا مذہب کی ان زنجیروں سے نکال کر محبت کے حوالے کر دیں۔ ہمارا فیصلہ مذہب کو نہیں، بلکہ محبت کر کے دیں۔

لیکن میں کس قدر بے بس تھا، سوائے ان خیالات کی بلوغت کے، میرے پاس لانے کے لیے اور کوئی دوسرا میدان بھی تو نہیں بچا تھا۔ دن بھر کے عجبے جہاں سے مجھے ایمان کی راحتیں سر پر آ چکی تھیں۔ بس وہ دن ہی تو رہ گئے تھے میری سانسوں کو میری روح سے جدا ہونے میں۔ اگر ایمان مجھے مولوی صاحب کے سامنے گڑبگڑانے کی اجازت دے جاتی تو میں اسی مسجد کے سامنے خود کو سولی پر لٹکانے کے لیے بھی جاتا تھا۔ کیا تب بھی ان کا دل مومن ہوتا؟

لیکن وہ تم کو مجھے مزید باندھ کر چلی گئی تھی۔ اس نے اپنے اپنے واسطوں کی حرمت اور اپنے سفید پوش باپ کی مجبوریوں کا ذکر کر کے میرے جنون کو جیسے زنجیروں میں ہی تو جکڑ دیا تھا۔ ورنہ شاید میں اس کی بیماری کا سن کر پکا قاعدہ مشکوٰۃ لے کر مولوی صاحب کے دروازے پر ہی جا بیٹھتا۔ اور جب تک ان کی چوکھٹ پر سر پٹھار نہا جب تک وہ خود آ کر میرے لیے وہاں سر کو قہقام نہ لیتے۔۔۔۔۔ لیکن افسوس، نہیں ایسا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

والہی ہی ایک اُداس اکتوبر کی آخری شاموں میں سے ایک شام تھی۔ آسمان پر شفق کی سُرنی میرے ارمانوں کے خون کی طرح کھری ہوئی تھی۔ ہوا سرد تھی، برفاں نے پلٹ فارم پر بھی ڈیرہ جھالیا تھا۔ شجوت کے پتے پہلے زرد اور پھر سُرخ ہو کر فلکِ ثنیںوں سے کئی پتنگوں کی طرح گر رہے تھے اور یوں لگتا تھا کہ پلٹ فارم پر کسی نے زردی مائل سُرخ پتیوں کی کوئی چادری بچھا دی ہو۔ میں اسی چادر پر رکھے اپنے مخصوص شیخ پر لپٹ پوسٹ کے چیمے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کس ایمان کے ہاتھوں میں عبداللہ کے نام کی مہندی رچ جائے گی اور پرسوں اُسے گھر سے اس جاتی بہار کی طرح رخصت کر دیا جائے گا۔ نگہت نے مجھے بتایا تھا کہ شادی کے بعد مولوی صاحب نے انہیں چھاپٹی، بھن کے پاس بھیجے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ عبداللہ کے لیے وہاں کسی چوٹے موٹے کام کا بندوبست بھی کر آئے تھے۔ مجھ سے کوئی بھی بہت سی کامیں بھی تھیں۔ انہی کاتوں کے آس پاس چھوٹی چھوٹی بستیوں بھی آتی تھیں جن میں ان کو نیک کاتوں کے کان کن رہتے تھے۔ ایسی ہی کسی ایک بستی کی مسجد کی امامت کے لیے انہوں نے عبداللہ کا نام منظور کر دیا تھا۔ پتہ نہیں مجھے ایسا کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ مولوی عظیم نے یہ قدم بھی صرف اور صرف میری وجہ سے ہی اٹھایا تھا۔ ورنہ وہ ایمان کی جدائی کہاں برداشت کر سکتے تھے۔ نگہت نے تو یہ خدشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ ایمان کی رخصتی کے بعد مولوی صاحب بھی زیادہ عرصہ کوئٹہ میں نہیں ٹھہریں گے اور اندر ہی اندر انہوں نے خود بھی بیوی اور حیا سمیت یہاں سے چھٹل ہونے کا پورا پروگرام بنا رکھا ہے۔ میرے ذہن میں پھر غرت کے سانپ نے نچن پھیلائے۔ مذہب میری محبت کو قتل کرنے کے بعد اس کی محبت بھی یہاں دفن نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اُسے بھی مجھ سے دُور لے جانا چاہتا ہے۔

پھر مجھے عبداللہ کا خیال آیا۔ کتنا خوش نصیب ہے وہ، اُسے ایمان ملنے والی تھی۔ وہ لوگ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں جنہیں ان کی محبت مل جاتی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس وقت ایسے لوگوں کی، ان کے دل کی بیکسی حالت ہوتی ہوگی جب وہ اپنی محبت کے سامنے قریب ہوتے ہوں گے۔ ان کے دل خوشی سے پھٹ کیوں نہیں جاتے اس لمحے۔۔۔؟ میں اگر عبداللہ کی جگہ ہوتا تو یقیناً میں اس وصلِ محبت سے پہلے ہی خوشی سے سر جاتا۔ میری عبداللہ کے بارے میں سوچیں اس قدر طاقتور ہو گئی تھیں کہ میں نے اُسے اپنے سامنے ہی پلٹتے فارم پر پلٹے ہوئے اپنی طرف دُور سے براہِ متے ہوئے بھی دیکھا۔ میں نے سر جھٹک کر اس خیالات کی رو سے نکلنے کی کوشش کی لیکن عبداللہ کا وہ ہیولا اب بھی میرے سامنے ہی بڑھا چلا آ رہا تھا میں گہرا کر کھڑا ہو گیا۔ یہ تو حقیقت عبداللہ ہی تھا جو ان زرد اور سُرخ فلکِ ثنیںوں کی چادر کو روندتے ہوئے چہرے پر پُرچا پتھر بیٹھائی لیے میری جانب ہی بڑھا چلا آ رہا تھا۔ مجھ سے تو اتنا بھی نہیں ہو سکا کہ وہ قدم چل کر میں خود اس کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتا۔ بس ساکت کھڑا اُسے اپنی طرف آتے دیکھتا رہا۔ عبداللہ میرے قریب آ گیا، اُس نے اپنی بکھری سانسوں کو سنبھلنے کی کوشش کیے، ہنسی براہِ راست مجھے کہا۔

”آپ کو ابھی اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“

میں نے ہلکلا کر اس کی طرف دیکھا۔

”ساتھ چلنا ہوگا لیکن کہاں۔“

”ہمارے گھر زیادہ سوال نہ کیجئے گا۔ بس چلنے کی کریں۔“

اس وقت عبداللہ کی حالت ایسی تھی کہ میں واقعی کوئی دوسرا سوال نہ کر سکا۔ عبداللہ چلا اور میں کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے چل پڑا۔

اندھیرا ہو چکا تھا۔ اسٹیشن کے تمام ایپ پوسٹ اور گیس کے ہنڈولے جل چکے تھے۔ لیکن اکتوبر کے آخری دنوں کی شدید زحند اور کبرے بادلوں نے سارے ماحول کو اس طرح سے لپیٹ میں لے رکھا تھا کہ وہ سب روشنیاں صرف غمگینی بٹیاں اور دھجے چراغ دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے کبرے سے سفید بادلوں میں کسی نے بہت سے جھنجھوڑ دیے ہوں۔

نہیں اور عبداللہ اسی کبرے اور دھند کے بادلی میں جیسے رستہ بناتے ہوئے اسٹیشن کی مرکزی عمارت سے پار نکلے، باہر مڑ کر بھی سمنان اور دھند میں لپٹی پڑی تھی۔ جیسے کوئی سانولی بڑھ سپید ساڑھی لپیٹے ابھی ابھی نین کر کے لپٹی ہو، میں اور عبداللہ اس کبرے میں مایوس سے کھڑے اس پاس کسی سواری کی تلاش میں نظریں دوڑاتے رہے۔ عبداللہ کی حالت بالکل ایسی تھی جیسی جل بن بھلی کی ہوتی ہے۔ وہ بار بار بے یقینی سے ہاتھ مل رہا تھا جیسے وقت اس کے ہاتھ سے پھسلا جا رہا ہو۔ جانے اُسے کس بات کی اتنی جلدی تھی۔ اسے میں خیر و کسی رحمت کے فرشتے کی طرح کسی سواری کو چھو کر روکنا یا تا نظر آ یا۔ میں نے جلدی سے اُسے آواز دی۔ اور پھر اگلے ہی لمحے ہم خیر و کے سبک تانگے میں پُرانے مٹھلی کی طرف روانہ تھے۔ لیکن راستے کی شدید زحند اور کبرے کی وجہ سے خیر و کا گھوڑا ابھی جیسے پھونک پھونک کر فضا میں قدم رکھ رہا تھا۔ خیر و نے احتیاطاً تانگے کے اگلے ہانسون کے ساتھ لگے گیس کے دونوں ہنڈولوں کو بھی ہلا دیا تھا تاکہ راستہ کچھ تو واضح نظر آئے لیکن اس نے بھی کچھ خاص فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ سردی کی وجہ سے گھوڑے کے غشوں میں سے بار بار بھاپ کی شکل میں آتی جاتی سانس کا نشان مل رہا تھا۔ ہم اندھیری سڑکوں پر دُور دُور لگے ایپ پوسٹوں کی کڑور چلی روشنیوں کے دائرے سے ہوتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ایسے میں اگر کوئی ہمیں دُور سے ٹٹن روڑ کے دور در پہ گھنے درختوں کی قطاروں سے اس سبھی نہاتا تانگے میں اس دھند اور کبرے میں کہیں جاتے دیکھتا تو اُسے ضرور شراک ہو مڑی گھول کے ایسے بہت سے منظر یاد آ جاتے۔

بالآخر تانگے نے اُنے مٹھلے کے گیٹ سے اندر داخل ہوا، محلہ سمنان پڑا تھا، میں اور عبداللہ جلدی سے تانگے سے نیچے اترے۔ عبداللہ خیر و سے گھر کی طرف بڑھا۔ میں دفعتاً ٹھٹھک کر رک گیا، یہ نہیں کہاں آ گیا تھا، یہی گلی، یہی کوچہ، یہ گھر تو میرے لیے منوہ تھا، میرے تو یہاں آنے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ میں مولوی علیہم کی تو کسی پابندی کا کبھی پابند نہیں رہا تھا، لیکن یہ پابندی تو میری زندگی، میری سانسوں کی اس مالک کی لگائی ہوئی تھی۔ جس کا اب میری ہر آتی جاتی سانس پر اختیار تھا۔

عبداللہ کو جب احساس ہوا کہ میں اس کے ساتھ قدم نہیں بڑھا رہا ہوں تو وہ فوراً پلٹا۔

”آپ ڈک کیوں گئے، جلدی چلئے۔۔۔“

”میں۔۔۔ میں تمہارے اندر نہیں آ سکتا، مجھے ایمان نے منع کیا تھا۔“

میں نے نا سبھی میں ایمان کا نام تو لے لیا لیکن پھر ایک دم مجھے احساس ہوا کہ میں جلد بازی میں ایمان کے ہونے والے شوہر کے سامنے ایمان کا راز افشاں کر بیٹھا ہوں۔ میں نے گھبرا کر بات پھینکی۔ گوشش کی۔

”میرا مطلب ہے کہ مولوی صاحب۔۔۔ انہیں میرا یہاں آنا۔۔۔“ عبداللہ نے غور سے میری طرف دیکھا اس کی آنکھیں ہلکی

رہی تھیں۔

”انہیں شاید بس اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا، آپ اندر آئیں، وقت زیادہ نہیں ہے۔“  
میں پھر بھی اپنی جگہ جمنا ہی نہیں ایمان سے کیا وعدہ نہیں توڑ سکتا تھا۔

”لیکن ایمان۔۔۔۔۔“

”میں ایمان ہی کے کہنے پر آپ کو اسٹیشن لینے کے لیے آیا تھا، آئیے۔۔۔۔۔ دو آپ ہی کا انتظار کر رہی ہے۔“

عبداللہ مجھے گم سم اور سکتے میں چھوڑ کر دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ مجبوراً مجھے بھی اس کے پیچھے قدم بڑھانا پڑے۔ صحن کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ کھلے کی بجلی لگی ہوئی تھی، ایمان کا گھر بھی دھند میں ڈوبا ہوا تھا۔ صحن کا جھولنا آواز سے زور سے ہوا آہستہ آہستہ جھول رہا تھا جیسے ابھی ابھی ایمان یہاں سے اٹھ کر گئی ہو۔ گھر پر ایک عجیب سا سکوت اور سناٹا طاری تھا۔ اچانک آہستہ سن کر اندر سے نگہت برآمد ہوئی۔ میں اس وقت نگہت کو یہاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ برآمدے کے چھوٹے چھوٹے علاقوں میں رکھی شیشیں جھللا رہی تھیں جن کی بجلی روشنی میں نگہت کی آنکھوں میں چھپے آنسو صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دھند کو چہرتی ہوئی چیز سے ہیری طرف دوڑتی ہوئی آئی اور میرے سینے سے لگ کر سسکی چڑی۔ میں ابھی تک حیران و پریشان سا دوں کھڑا تھا۔ عبداللہ نے میرا ہاتھ تھامنا اور برآمدے میں اس حصے کے کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں زندہ تھا۔ یہ کیا عبداللہ مجھے گھر کے زمانے کے لیے اس طرف کیوں لے کر جا رہا تھا۔ مولوی صاحب نے اگر مجھے اپنے گھر میں یوں آزادی سے چلنے پھرتے دیکھ لیا تو غضب ہی تو ہو جائے گا۔ لیکن عبداللہ مجھے بنا کچھ کہنے کا موقع دینے زبردستی کھینچتا ہوا اس کمرے میں لے گیا جو برآمدے کے سرے پر بنا ہوا تھا۔ نگہت بھی میری کنہی سے پہلی میرے ساتھ ہی کمرے میں چلی آئی۔

کمرے کی بجلی روشنی میں جس پہلے شخص کے چہرے پر میری نظر پڑی وہ خود مولوی عظیم ہی تھے۔ میں ٹھٹھ کر رک گیا، مولوی عظیم کے چہرے پر اک عجیب بے بسی تھی۔ ایسی بے بسی صرف اس شخص کے چہرے پر ہو سکتی ہے جو ایک لمبی جنگ کے بعد اس وقت ہار گیا ہو جب اسے اپنی جیت کا پورا یقین ہو چکا ہو۔ ان کے ساتھ ہی پیچھے حیا مسو جو تھی۔ اور ایک نر توڑ چہرے والی عورت چادر لپیٹے کمرے کے وسط میں پڑے چنگ کی پائنتی سے لگی بیٹھی تھی۔ دو سب خاموش سے کیوں تھے؟ پھر میری نظر کمرے کے کچھ اندر میرے رنما چالے سے پیسے کی مانوس ہوئی تو مجھے لگا کہ چنگ پر کوئی لیٹا ہوا ہے جس کے ماتھے پر شاید خندنی پٹیاں رکھنے کے لیے جیا اور اس کی اماں چنگ کے دونوں اطراف کی پائنتی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی سلور کا بوسا سلا پڑا تھا جس میں کچھ سفید پٹیاں تھیں۔ ایک دم سے میرے ذہن میں کوئی جھماکا سا ہوا۔ میں جیسے نیند کے عالم سے یک لخت جاگ گیا تھا۔ چنگ پر کوئی اور نہیں ایمان ہی لیٹتی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے شدید غماص کی ایک ہی تھی لیکن چہرے کے گردورہ لگائی سا ڈالاب بھی ویسے ہی قائم تھا۔ اس کی سانس ترک ترک کر چلی رہی تھی اور وہ آنکھیں موندھے کسی سنو ڈائٹ کی طرح کسی لمبی اور گہری قید میں دکھائی دے رہی تھی۔

چند لمحوں کے لیے مولوی عظیم کی مجھ سے نظریں ملیں اور پھر انہوں نے نظریں جھکا لیں۔ عبداللہ مجھے یوں دروازے پر ہی سکتے کے عالم میں کھڑے دیکھ کر آہستہ سے کھٹکا اور اس نے نگہت کی طرف دیکھ کر کچھ اشارہ کیا۔ نگہت میرا ہاتھ تھامے کمرے میں داخل ہو گئی اور میں کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ ہی آگے بڑھا آیا۔ عبداللہ ایمان کے بیروں کی جانب بیٹھ گیا اور اس نے آہستہ سے کہا۔

”ایمان۔۔۔۔۔ آنکھیں کھولو۔۔۔۔۔ دیکھو تم سے ملنے کون آیا ہے۔“

ایمان کی فیند یا بے ہوشی اب بھی نہیں ٹوٹی۔ حیات نے دھیرے سے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیریں، اور جانے اس کے کان میں آہستہ سے کیا کہا۔۔۔۔۔ ایمان کے وجود میں بالکی ہی جنم ہوئی اور اس نے رشتہ رشتہ اپنی آنکھیں کھولیں۔۔۔۔۔ وہی جان لیوا درد بڑی بڑی کالی آنکھیں۔۔۔۔۔ پھر اس کی نظریں مجھ سے ملیں۔۔۔۔۔ وہی روح کھینچ لینے والی نظر، وہ چاند لے لے لگیں، چپکے سے مٹا مجھے کھینچ رہی۔ جیسے میری مہر کو اپنی آنکھوں کے پردے میں جذب کر لینا چاہتی ہو۔ تھکات اور بیماری نے اس کے کھن پر ڈراما بھی فرقی نہیں ڈالا تھا۔ بلکہ آج مجھے وہ تھکا تھکا سا حسن پہلے سے بھی زیادہ حسین لگ رہا تھا۔ لیکن اس کی اکڑی اکڑی سانسیں بتا رہی تھیں کہ صحت کا حامل ذہن اس کی رنگوں میں پوری طرح جھیل چکا ہے۔ اس محبت نے ایک جھپٹی چائے، چنٹی کھٹکھٹاتی لڑکی کا کیا حال کر ڈالا تھا۔

یاد۔۔۔۔۔ ایہ کیسا عجیب دن تھا، کسی کیسی انہو نیاں ہوئے کو جا رہی تھیں۔ مولوی عظیم کی موجودگی میں نہیں ان کی بیمار بچی کے کمرے میں موجود تھا۔ ان کا سارا اگہرا ہنسنوالا ان کے ہونے والے دماغ کے سب سے ہی تو یہاں موجود تھے لیکن آج مولوی عظیم کی زبان پر تالا پڑا تھا۔ ان کی آنکھوں کے گوشے پھینکے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھوں میں اتنا ارتعاش تھا کہ وہ نمک سے تسبیح بھی نہیں پھیر رہے تھے۔ محبت بھی کیسے کیسے بھڑے دکھاتی ہے، اس کا احساس مجھے اس دن مولوی عظیم کی خاموشی دیکھ کر ہوا تھا۔

ایمان کے لب ڈرامے۔۔۔۔۔ لیکن کسی کو کچھ سمجھ نہ آیا۔ مولوی صاحب تڑپ کر آگے بڑھے اور ایمان کے ماتھے پر ہوسہ دیا اور اس پر کچھ پڑا کر پھونکا۔ ان کی بیوی کی آنکھوں سے زار و قطار ٹپ ٹپ آنسوؤں کی ہلکی سی جھری بہ رہی تھی لیکن وہ اتنی خاموشی سے رو رہی تھیں کہ جب تک کوئی انہیں دیکھے نہ اسے پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ میری نظریں بس ایمان پر ہی جمی ہوئی تھیں، مادر پھر ایک اور مجروح ہوا، مولوی عظیم آگے بڑھے اور میرا ہاتھ خود ہی قہار کر مجھے ایمان کے سر ہانے تک لے آئے۔ حیات نے اٹھ کر میرے کمرے ہونے کی جگہ خالی کر دی۔ ایمان نے ایک ٹکڑے مجھے دیکھا، اس کے ہونٹوں پر وہی بالکی کی کائنات کو زندگی بخش دینے والی چانغزاسی مسکراہٹ ابھری جو اس کے بالوں میں چلنے سے گڑھے ڈال دیتی تھی۔ اس کی نظریں ایک لمبے میں ہی میری نظر سے مل کر ساری کائنات کو تسخیر کر لیا، کہ جیسے کہہ رہی ہو کہ ”محبت قانع عالم“ اور پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ میں نے کچھ دیر تک اسے مسکرت دیکھا، رہا کہ کب وہ دوبارہ آنکھیں کھولے اور کہیں مجھ سے اس کی کوئی نظر چوک نہ جائے۔ لیکن اس ہزیمین کی تبدیلی ہوتی گئی اور پھر مجھے کہیں ڈر و فلاح میں سے مولوی عظیم کی آواز آتی سنائی دی۔

”اللہ وانا الیہ راجعون۔“

کیا۔۔۔۔۔؟۔۔۔۔۔ کیا آس پاس کسی کی موت ہو گئی ہے جو مولوی صاحب اس وقت بے موقع یہ آیت پڑھ رہے تھے۔ مائیں یوں سکون سے سوئی ہوئی اس شہزادی کے سر ہانے ایسا کچھ نہیں پڑھنا چاہیے۔ بدگفتی بھی تو ہو سکتی ہے۔ میں نے فیسے اور ناگواری سے مولوی صاحب کی طرف دیکھا، لیکن وہاں تو حیا اور نگہت بھی ایک دوسرے سے لپٹی سسکیوں سے رو رہی تھیں۔ اب انہیں کیا ہو گیا ہے، نہیں نے عبداللہ سے مدد لینے کے لیے اس کی طرف دیکھا کہ اس سے کہوں کہ ان دو بے وقوف لڑکیوں کو ایمان کے سر ہانے سے دور لے جائے۔ ابھی تو وہ نازعین تھک کر ڈراما سنی ہے۔ جانے کب کی جاگی ہوئی تھی۔ اب ان دونوں کا یہ بین ہی کہیں اس کو نہ چکاوے۔۔۔۔۔ لیکن یہ کیا، عبداللہ تو خود کھٹکھٹوں میں منہ چھپاتے بڑک

بڑک کر دروہ ہوا تھا۔ یہی حال ایمان کی اماں کا بھی تھا۔ حیا اور نگہت بھائے اماں کو چھپ کر دھانے کے خود بھی ان کے ساتھ مل کر رو رہی تھیں۔ اماں حیا اور نگہت ہار بار بڑھ کر اس کی روشن چہرے کو چوم رہی تھیں۔ اس کی زلفیں سنوار رہی تھیں۔ جانے انہیں اتنا سا بھی احساس کیوں نہیں ہو رہا تھا کہ کسی کی فینڈ میں ہوں غفلت نہیں ڈال کر رہتے۔ مولوی صاحب اب بھی زور زور سے کچھ آہستہ پڑھ رہے تھے۔ نہیں آخری آمید کے طور پر ان کی جانب مڑا کر شاید وہ ان ہی نادانوں کو کچھ سمجھا پائیں لیکن یہ کیا خود مولوی صاحب کا چہرہ اور داڑھی پہنچے آنسوؤں سے تر تھی۔ نہیں نے ہاتھ بڑھا کر ان کے آنسو چہرے سے صاف کیے اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سب کو چھپ رہے کیا اشارہ کیا۔ نگہت اور حیا کو گھور اور ویسے ہی ہونٹوں پر انگلی رکھے انہیں بھی خاموش رہنے کا حکم دیا لیکن میرے اس حکم کا خمیوں نے اُلٹا ہی مطلب لیا۔ حیا کی تو ہچکیاں ہی بندھ گئیں روتے روتے اور اس کی اماں کو اس کا وجود سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ نگہت تڑپ کر ابھی اور میرے پاس آ کر اس نے مجھے کاغذوں سے پکڑ کر جھجھوڑ ڈالا۔

”بھیا۔۔۔ ایمان ہم سے رو نہ گئی ہے، وہ ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ اب وہ بھی واپس نہیں آئے گی۔“

میرے دماغ پر بھی وہ صدمہ اور برف جیسے پکھنڈے سی گئی۔ یہ نگہت کیا کہنا چاہ رہی ہے! یہ سب لوگ کیوں روتے ہیں۔ دفعتاً میرے دماغ میں مولوی صاحب کی پڑھی ہوئی آفتوں کی کوئی کسی بازائش کی طرح ٹکرائی۔ نہیں ایمان کے سر ہانے کی پابندی پر جھک کر بیٹھ گیا۔ وہ برف کی شہنشاہی۔ وہ بادشاہ حسن و وہ نور کا ہالہ اک چادر میں لپیٹا پڑا تھا۔ آنکھیں موندھے اس کی سانس ختم ہو چکی تھی۔ ہونٹوں پر اب بھی اک ہلکی سی مسکراہٹ تھی جسے صرف نہیں ہی محسوس کر سکتا تھا کیونکہ اس کی وہ آخری مسکراہٹ صرف میرے لیے ہی تو تھی۔

نہیں نے اُسے دیر سے آواز دی۔

”ایمان۔۔۔۔۔“

لیکن وہ ساکت ہی رہی، نہیں نے گھبرا کر پیچھے کھڑے مولوی صاحب کی طرف دیکھا۔ ”یہ بول کیوں نہیں رہی مولوی صاحب اس سے کہیں کر کوئی قہارت کرے۔ آپ کا کہنا یہ کبھی نہیں نال سکتی۔ آپ کہیں گے تو ضرور جواب دے گی۔ بہت محبت کرتی ہے یہ آپ سے۔“ بڑا احترام ہے آپ کے لیے اس کے دل میں۔“

مولوی صاحب مجھے جواب کیا دینے والہ نہ خود پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے اور مجھے کھینچ کر انہوں نے اپنے گلے لگا لیا۔ ان کے گلے لگتے ہی جانے آنسوؤں کا وہ کون سا سیلاب تھا جو میری آنکھوں سے اُمڈ پڑا تھا۔ جتنا وہ مجھے تھکتے جاتے اتنا ہی میری ہچکیاں بندھتی جاتیں۔ دیر سے دیر سے میرے سن و سن میں یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ ایمان کی سانس کیوں ساکت ہو گئی تھی، اور وہ ہم سب کی التجاؤں کا جواب کیوں نہیں دے رہی تھی۔ میرے ذہن میں اب بھی اس کی ابدی خاموشی کے لیے وہ لفظ نہیں آ رہے تھے جو کسی ایسے شخص کی کیفیت کے لیے بولے جاتے ہیں۔ مجھے حیرت تھی کہ آسمان کیوں نہیں چھٹ پڑا، زمین کی گردش ساکت کیوں نہیں ہو گئی۔ ہم سب جو اس مہ چہرے سے اس قدر محبت کے دعوے دار تھے۔ ہم سب کی سانسیں بھی اسی لمحہ کیوں نہ ختم نہ گئیں جب اس اکمزنی سانس کا یہ دم ختم تھا۔ میری آنکھیں تو اس سے پہلی ملاقات کے بعد اسی کی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔ پھر اب تک ان میں روشنی کیوں تھی؟ میرے لب تو اسی کے لفظ بولتے تھے، پھر اب تک میرے بولنے کی قوت کیوں نہیں چھین لی گئی تھی؟۔۔۔ میرے کانوں کو تو صرف اُسی کی آہوں اور خندیں ہی مٹھی بولی کا انتظار رہتا تھا۔ پھر میری سانس میں اسی لمحہ کا کارہ کیوں نہیں ہو گئیں، میرا



دل جو اس کے نازک دل کے ساتھ دھڑکنے کا دعوے دار تھا، وہ اس کے دل کی دھڑکنے کے ساتھ ہی پھٹ کیوں نہیں گیا۔ نہیں تو اس کے سامنے کوئی کسی کو بچنے کا روادار نہ تھا، پھر کوئی میرے سامنے اس کے کوئل وجود سے رُوح کیسے جھین لے گیا۔

یعنی میرے سارے دعوے ہی جھوٹے نکلے، میرے اندر سے جیڑوں کا ایک طوفان اُبل اُبل کر باہر آنے کے لیے تیار تھا لیکن میری مجبوری تو دیکھئے کہ اس ماہِ رُخ کی حرمت کا خیال مجھے مکمل کر ماتم کرنے سے بھی روک رہا تھا۔ رفتہ رفتہ میرے آنسو بھی خشک ہونے لگے اور اس دن مجھے بنا آنسوؤں کے رونے کا مطلب بھی سمجھ آ گیا۔ مولوی صاحب نے میری ہچکچاہٹ کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن مجھے کچھ ہی دیر میں اپنے حواس کا وارن چھوڑنا ہی پڑا۔ بے سدھ ہونے سے پہلے میں نے آخری مرتبہ ایمان کی اماں کو اس کا ہاتھ چومتے اور چہرے پر چادر ڈالتے دیکھا اور پھر مجھے آس پاس کا کچھ ہوش نہیں رہا، میں مولوی صاحب کے گلے لگے لگے ہی ان کی ہانپوں میں جھول گیا۔

☆☆

اُس دن کے بعد شاید جب پہلی مرتبہ میں اپنے حواس میں واپس آیا تو چند روز کا وقفہ بیت چکا تھا۔ میں صدیقی صاحب کے گھر میں ہی اُسی کمرے میں ڈریس اور بازوؤں میں گھبے کیٹولاز اور سرخوں سے لدا پستانا ہی ستر پر چڑھا۔ بعد میں صدیقی صاحب نے بتایا کہ ریلوے کے ہسپتال میں چھ دن رکھنے کے بعد انہوں نے مجھے اپنے گھر ہی منتقل کروا لیا تھا کیونکہ ریلوے ہسپتال میں اتنی سہولیات بھی نہیں تھیں اور شہر کے جس پرائیویٹ ڈاکٹر کو انہوں نے میرے علاج کے لیے طلب کیا تھا اس کا اور اس کی پوری ٹیم کا ریلوے ہسپتال میں روز آنا جانا ناممکن نہ تھا۔ پہلے چند دن تو میری یادداشت نے ہی میرا ساتھ نہیں دیا۔ میں حیرت سے ان انجینی چروں اور لوگوں کو دیکھتا رہا جو میرے آس پاس آتے جاتے، ٹہکتے، مجھے انجکشن وغیرہ لگاتے اور میرا بخار چمکے کرتے رہے۔

صدیقی صاحب بتا رہے تھے کہ پھر مجبوراً ڈاکٹر نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے شہر کے بڑے ہسپتال میں منتقل کر دیا جائے کیونکہ بظاہر تو میری حالت ٹھیک ہو رہی تھی لیکن میرے ذہن کا اور میری یادداشت کا میرے جسم کا ساتھ نہ دینا انہیں بہت پریشان کر رہا تھا۔ میں بڑے ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ دن گزرتے گئے اب میری جسمانی حالت دیر سے دیر سے سنبھلنے لگی تھی۔ بخار کا وقفہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی نرس آکر ولیہ وغیرہ میرے حلق سے اتار دے میں ناکام ہو بھی جاتی تو صدیقی صاحب آ کر خدمتے اور پیار سے مجھے کچھ مائع خدا کھلا جاتے۔ شاید اس دماغی بے ہوشی کے عالم میں ابھی میں صدیقی صاحب کے احسانوں کی کیفیت محسوس نہ کر رہا تھا۔ اب دیر سے دیر سے مجھے ایک ذلیل جھڑپ شام کے وقت ہسپتال کے بڑے سے والاں میں ایک طرف کوئی چھوٹی سی جھیل تک یا گاس کے میدان میں لہلانے کے لیے بھی بھیجا یا جانے لگا۔

لیکن میرے دماغ پر بھی دھند کسی طور پر کم نہیں ہو پارہی تھی۔ شاید یہ میرے ہوش و حواس کی آخری رات کی وہ دھند تھی جو میرے ذہن سے لپٹ کر ہی رہ گئی تھی۔ میں چروں کو دیکھتا اور انہیں پہچاننے کی کوشش بھی کرتا، لیکن سب ایک خواب کے عالم میں ہو رہا تھا۔ شاید ان دنوں میں مولوی سلیم، عبداللہ، شاکر، خیر، غفور اور جانے کون کون مجھ سے ملنے اور مجھے دہاں دیکھنے آتا ہو گا لیکن میں اُن مانوس چروں کو بھی انہیں سے دیکھ نہ رہا ہوں گا۔

ڈاکٹروں کی رائے میں میرا دماغ اُن کی وی ہوئی ادویات کی جھیل نہیں کر رہا تھا۔ حالانکہ میرے جسم نے ان کے علاج کی ہر ممکن جھیل کی

تھی۔ اب ڈاکٹروں کے بقول مجھے مزید ہسپتال میں رہنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے صدیقی صاحب کی درخواست پر مجھے ان کے ساتھ واپس گھر جانے کی اجازت تو دے دی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ بے حد احتیاط کی تلقین بھی کی تھی۔

شاید وہ بڑے ہسپتال میں میری آخری شام تھی کیونکہ اگلے دن مجھے صدیقی صاحب واپس اپنے ساتھ اپنے گھر لے جانے والے تھے۔ کراچیا تک ہسپتال کی راہداریوں میں ہزاروں سی جی جی۔ منیں اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس وکیل جیٹ پر بیٹھا خالی نظروں سے باہر کا منظر تک رہا تھا۔ وہیں سے منیں نے چند لمبے پہلے دو بڑی سرسبز گلیاں ہسپتال کے احاطے میں داخل ہوتی بھی دیکھی تھیں۔ کچھ دیر ہی میں راہداری کا دوہا سارا شور میرے دروازے کے قریب آ کر ختم کیا۔ دروازہ کھلا اور اس میں سب سے پہلے ایک بانوس کی عورت کا چہرہ اندر آتے ہوئے نظر آیا۔ وہ عورت چند لمبے تو سیکے میں تنگ سی کھڑی مجھے دیکھتی رہی اور پھر نہیں اُسے کیا ہوا، وہ روتے ہوئے دوڑ کر آئی اور میرے گلے لگ گئی۔ اس عورت کے پیچھے ہی ایک کچی عمر کا باوقار مرد جس نے بھلے سوٹ پہنا ہوا تھا اور دو اور لڑکے بھی اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے چھوٹا لڑکا جو عمر میں مجھ سے ایک دو سال ہی کم ہوگا اس عورت کی طرح رو نے لگا اور کچی میرے چہرے اور کچی میرے بالوں کو چھونے لگا۔ مجھے بڑی آنکھیں محسوس ہوئی۔ پھر نہ جانے ڈاکٹر نے اندر آ کر اس عورت سے کیا سرگوشی کی اور اس باوقار مرد سے کیا کہا کہ دونوں نے آگے قدموں سے آگے بڑھ کر اس عورت کو کچڑ کر کھڑا کر دیا اور اسے پُپ رہنے کو کہا۔ وہ سب لوگ رات دیر تک میرے ہی کمرے میں موجود رہے۔ پھر مجھے خیند آنے لگی تو فرس نے ہیلپر کی مدد سے مجھے بستر تک پہنچا دیا۔ سونے سے پہلے ایک عجیب سی بات ہوئی، اس باوقار مرد نے آگے بڑھ کر میرے گال پر زور سے جھنجکی دی۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے بہت پہلے بچپن میں بھی جب میں سونے لگتا تھا تو کوئی جاتے جاتے میرے گال کو اسی طرح تھپک کر جاتا تھا۔

اگلے دن سو کر اٹھا تو میرے جانے کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ وہ سب لوگ جو کچی میرے کمرے میں گھس آئے تھے وہ بھی وہیں موجود تھے لیکن وہ عورت اور وہ مرد ڈاکٹر سے نہ جانے کس بات پر بحث کر رہے تھے۔ لیکن ڈاکٹر شاید انہیں کچھ اور سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر ہند تھے لیکن ڈاکٹر انہیں کہہ رہا تھا کہ بہتر ہے کہ مجھے مکمل ٹھیک ہونے تک صدیقی صاحب کے ساتھ ہی جانے دیا جائے۔ اور کچی بات تو یہی ہے کہ میں ان لوگوں کے ساتھ جانا بھی چاہتا تھا۔ جانے کیوں ان سب کو دیکھتے ہی دماغ پر اک جیج سا بوجھ محسوس ہوتا تھا۔ پھر جیسے مرد اور عورت کو ڈاکٹر کی بات سمجھ میں آ گئی کیونکہ انہوں نے شاید میرے چہرے پر اپنے لیے ناگوار کی ابرو دیکھ لی تھی۔ منیں صدیقی صاحب کے ساتھ ان کے گھر آ گیا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ سب لوگ اور گلیاں بھی ہمارے ساتھ ہی وہاں تک آئیں۔ پھر تو یہ روز کا معمول ہی بن گیا۔ وہ سب لوگ روزی صدیقی صاحب کے گھر پہنچے آتے جہاں میں برآمدے یا صحن والے باغچے میں وکیل جیٹ پر بیٹھا کچی پھول کھی یا بارونک رہا ہوتا۔ پھر ایک دن ایک عجیب سی بات ہوئی۔ ایک شخص جوڑا راجپور کی دردی میں بیٹوس تھا ایک جوان لڑکی کے ساتھ صدیقی صاحب کے گھر آیا۔ دونوں ہی جانے پہچانے سے لگد رہے تھے۔ لڑکی تو نہ جانے کیوں مجھے دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گئی۔ پھر اس دردی والے ڈرائیور اور صدیقی صاحب نے اسے ہسپتال پُپ کر دیا۔ پھر اس لڑکی نے صدیقی صاحب سے میرے کپڑوں اور دیگر چیزوں کے بارے میں پوچھا۔ صدیقی صاحب جاتے کہاں سے ایک آدمہ بٹل شرٹ اور تکیوں کی دردی آٹھالاے۔ وہ لڑکی جیڑی سے اس شرٹ اور دردی کے جیب ٹوٹنے لگی۔ پھر جانے ان کپڑوں کی کس جیب سے دو موٹی نکل کر برآمدے کے فرش پر گرے، تب میں اسی لڑکی کی جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ میرے سامنے ہی دو موٹی

کپڑوں سے نکل کر فرش پر پڑ چکے تھے۔ میرے ہاتھ بے اختیار یاری میں ان موتیوں کو سنبھالنے کے لیے اٹھ گئے جیسے میری کوئی بہت سی جیتی اور افسوس چیز زمین پر گرنے جا رہی ہو۔ پھر جانے کیا ہوا، ان موتیوں کے گرنے کی آواز کا ارتعاش جیسے ہی میرے کانوں سے ٹکرایا۔ میرے اندر نہ جانے کتنا کچھ جھنجھٹا سا گیا۔ موتی گرنے کے بعد وہ بارہ اچھلے اور پھر زمین سے ٹکرائے میرے اندر پھر ایک جھٹکا سی پیدا ہوئی۔ فوراً بیٹھے مجھے سے سب کچھ اپنے دکھائی دے رہا تھا جیسے کسی ظلم کو سلو مشن میں چلا دیا جائے۔ تیسری بار موتی زمین پر ٹکرانے سے پہلے ہی میرے ذہن میں ایک دم جھماکے سے ہونے لگے۔ میرے ذہن پر بھی برف پھیلنے لگی۔ یہ موتی تو مجھے ایمان نے دیے تھے۔ ہاں ہاں۔۔۔ یہ تو وہی دو موتی تھے، لیکن یہ یہاں۔۔۔ اور یہ لڑکی۔۔۔ یہ تو گھمب تھی جو درودی میں بیٹوں شا کر کے ساتھ وہاں آئی ہوئی تھی۔ اور یہ صدیقی صاحب۔۔۔ پھر اچانک مجھے اس کالی رات سے لے کر اب تک کا ہر واقعہ ہر چہرہ صاف نظر آ گیا۔ ہسپتال میں کوئی اور نہیں بلکہ شا کر کے ساتھ کشتر صاحب ای اور باقی گھر والے آئے تھے۔ ایمان کی چلی گئی تھی اور کتنے افسوس اور شرم کی بات تھی کہ میں اب تک زندہ تھا۔ میرے سر میں شدید دوسرا اٹھا۔ ڈاکٹر نے بعد میں مجھے بتایا کہ میں شدید صدمے سے اسی رات عارضی طور پر اپنا دماغی کنٹرول کھو بیٹھا تھا۔ میڈیکل کی زبان میں اسے شاید نرسیری ایمینو یا کہتے تھے۔ ایسے واقعات میں آج تک سینما کے پروے پر دیکھ کر دیکھ کر ہوتا تھا کہ خود میری زندگی بھی ایک ایسے دورے سے گزرنے والی تھی۔

آگے کی کہانی بہت مختصر تھی۔ کشتر صاحب اور امی نے صدیقی صاحب کے گھر کے بہت پکڑ لگائے تاکہ میں ان کے ساتھ گھر چلا جاؤں۔ صدیقی صاحب بھی ان کے حامی تھے لیکن جس دن میں نے ان کو یہ کہہ دیا کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے بھی کہیں اور چلا جاؤں تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں گھر واپس نہیں جانا چاہتا۔ اس دن کے بعد انہوں نے مجھ سے گھر جانے کا بھی نہیں کہا۔ کشتر صاحب اور امی، بھابی، سہا و بھائی سب اپنے کیے پر بے حد مشغول تھے۔ لیکن اب مجھے ان لوگوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ جس کے لیے میں بی بی رہا تھا جب وہ ہی نہیں رہی تو آگے کی زندگی کے ماہ و سال کہاں اور کس حال میں گزرنے لگے۔ اس سے مجھے کچھ خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ عباد اللہ روز شام کو مجھ سے اسٹیشن پر آ کر مل جاتا تھا۔ اب سب ہی یہ جان چکے تھے کہ میں رہنا زکشا احمد رضا کا بیٹا اور ایک رئیس زادہ ہوں۔ لیکن میرے دوست اب بھی وہ ہیں پُرانے لوگ تھے۔ خیر و اور غور اب بھی میرا اسی طرح خیال رکھتے تھے۔ لیکن ہوش و حواس واپس ملنے کے بعد بھی میرے لفظ مجھے واپس نہیں مل سکے۔ میرا بولنا چالنا بالکل اسی ختم ہو چکا تھا۔ میں گفتگوں ایک ہی جگہ تک ہی سے کوئی بات کیے پُپ چاپ بیٹھا رہتا تھا۔ کوئی ہاتھ سے کچھ کرکھیں زبردستی لے جاتا تو چل پڑتا اور نہ وہیں بیٹھا غلامیں ہکتا رہتا نہیں اب تک وہی طور پر اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر پاتا تھا کہ ایمان اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ مجھے اس ساری دنیا سے ہی بے زاری محسوس ہوتی تھی جس میں میں خواہ مخواہ ہی بیٹے جا رہا تھا۔ مجھے اس مذہب سے چڑ ہو گئی تھی جس نے مجھ سے میری ایمان کو چھین لیا تھا۔ وہ محسوس ہوا کہ مذہب اور محبت کے درمیان کی اس جنگ میں پس گئی تھی۔ اس کا نازک دل اور سید حساس دماغ اس جنگ کے بوجھ کو برداشت نہیں کر پایا اور اس نے اپنی زندگی ہار دی۔ محبت مذہب کی ہیجٹ چڑھ گئی تھی۔ محبت مذہب پر قربان ہو گئی تھی۔

درمیان میں ایک آدمی مرزا محمد اللہ بھی مجھ سے ملنے آیا تھا۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ بس ہم دونوں پُپ چاپ بیٹھے رہتے اور پھر وہ الوداع کہہ کر چل دیتا۔ اس کاظم، میرے دکھ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ ہم گفتگوں کی بولی سے زیادہ آپس میں خاموشی کی زبان زیادہ بہتر سمجھتے تھے۔ کبھی کبھی یہ لفظ بھی احساسات اور ہڈیوں کو کس قدر بے وقوف کر دیتے ہیں۔ ان کی عزت اور وقار کم کر دیتے ہیں۔ ان کی شدت کو جان نہیں کر

جاتے۔ سچ مانے تو لفظ کبھی کبھی ہمارے محسوسات اور جذبات کو بے عزت کر دیتے ہیں شاید اسی لیے ہمیں اور عبداللہ آپس میں کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ بس خاموش رہ کر ایک دوسرے کا کرب محسوس کرتے تھے۔

واپس ہوش میں آنے کے بعد جب پہلی مرتبہ گجرات سے ملاقات ہوئی تو اس نے مولوی عظیم کی اس کا یا پلٹ کے بارے میں بتایا جب مجھے پتا چلا کہ ایمان اس آخری رات سے دور تھیں پہلے ہی اس جان کئی کے عالم میں تھی، ایسا لگتا تھا کہ اس کی روح نکلنے کے لیے بے چین ہے لیکن کسی کے انتظار میں نکل نہیں پاتی، ڈاکٹروں نے تو تین دن پہلے ہی جواب دے دیا تھا۔ مولوی صاحب کو اپنی دعاؤں پر دواؤں سے زیادہ بھروسہ تھا لیکن تیسرے دن وہ بھی ٹوٹ گئے۔ عبداللہ نے ان کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیا کہ آخری بار وہ ان سب کی بات مان لیں۔ حیا جانتی تھی کہ ایمان کو کس کا انتظار ہے، لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ایمان ساری عمر بھی چاہے ایسے ہی کیوں نہ توڑ پھڑے رہے لیکن اس کے اندر کی ایمان اسے کبھی لب نہیں کھولنے دے گی۔ حیا نے بھی عبداللہ کو مجھے بلوانے کے لیے کہا تھا۔ عبداللہ نے حیا سے اس بارے میں دوسرا کوئی سوال ہی نہیں کیا اور براہ راست مولوی صاحب کی عدالت میں عرضی لگا دی تھی۔ مولوی صاحب پہلی رات تو بہت جبرجہ ہوئے اور انہوں نے عبداللہ کو سخت سسٹ بھی سنا دی تھیں۔ لیکن پھر دوسری رات اور پھر آخری رات جیسے جیسے ایمان کی حالت بگڑتی گئی ان کے اندر کا سخت گیر مذہبی باپ ٹوٹا گیا جتنی کہ تیسری شام جب عبداللہ ان کے سامنے رو پڑا تو ان سے بھی برداشت نہ ہو سکا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ انہوں نے کسی نامحرم کو اپنے گھر کی نہ صرف دلیز بلکہ ڈٹانے کی حد عبور کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ شاید وہ ایسی لمحہ اندر سے ٹوٹ گئے تھے جب انہیں یہ احساس ہوا تھا کہ ایمان بھی میری عبت میں آئی ہی جتنا جتنی جتنا نہیں۔۔۔۔۔ شاید ان کے لیے یہ تصور ہی محال تھا کہ ایمان صرف ان کی تابعداری میں اس رشتے کے لیے رضا مند ہوئی ہے۔ وہ اپنے تصور کی آخری حد تک جا کر بھی یہ گمان نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی بیٹی کے دل میں یوں چور و درازے سے کوئی اندر بھی داخل ہو سکتا ہے۔ ان کے اندر کے مذہبی انسان کے لیے یہ بہت بڑا تازہ یاد تھا۔ دوسری طرف ان کے اندر بے ایک پیاد کرنے والے باپ کے لیے یہ بہت اذیت ناک تھا کہ ان کی جان سے عیاری بیٹی نے اپنی زندگی ان کی خوشی کے لیے قربان کر دی لیکن انہیں اپنے دل کی حالت کے بارے میں احساس تک نہیں ہونے دیا۔ شاید اس رات عبداللہ کو مجھے جلاالا۔۔۔۔۔ کی اجازت دینے والا شخص مولوی عظیم الدین نہیں بلکہ صرف ایک باپ ہی تھا۔ لیکن اس باپ نے بہت دیر کو دی تھی۔ جب تک اسے ہوش آیا وہ اپنی بیٹی کو چکا تھا۔

مجھے گجرات نے ایک بد لقاؤ بھی دیا تھا جسے میں روزانہ کھولنے کی ہمت کرتا اور روزی بار کر دانیس سنبھال کر رکھتا تھا۔ گجرات نے بتایا تھا کہ یہ لقاؤ ایمان نے اسے اپنی بیماری کے دوران دیا تھا کہ اس کی شادی کے بعد گجرات وہ لقاؤ جھٹک پہچانے اس تازمین کو کیا خبر تھی کہ قدرت نے اس کی سانسیں ہی گن رکھی ہیں۔

پتہ نہیں میں ایمان کے اس آخری خط کو کھولنے سے اس قدر کیوں ہلچکا ہوا تھا۔ میں ایک مقدس تحریر کی طرح اس بد لقاؤ کو مردانہ انداز میں چومتا، آنکھوں اور ماتھے سے لگا تا اور پھر واپس ہی دروازہ رکھ دیتا جہاں سے میں نے اسے اٹھایا تھا۔ شاید میں اپنے اندر اس احساس کو جاؤں رکھنا چاہتا تھا کہ ایمان اب بھی اپنی اس پرچی تحریر کی صورت میں میرے ساتھ رہتی ہے۔ میں اس کی آن لکھی باتوں کو اپنے صبح و شام کے تہیز کی صورت میں زندگی گزارنے کا ایک بہانہ بنانا چاہتا تھا۔



جانے نہیں نے اس عشوہ طراز کا یہ خطہ تھی بار بار سنا اور جانے نہیں سکتی دیر سے تنگیوں سے لے کر روتا رہا۔ بھر کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو میں چونکا۔ وہ عبداللہ تھا۔ یہ نہیں کب سے وہ یہاں کھڑا تھا۔ عبداللہ نے میرے گالوں پر بچے آنسو پونچھ کر میری آنکھوں میں جھانکا۔

”کب تک آپ ہم سب کوڑا لے رہیں گے۔ دیکھیں۔۔۔ آج آپ سے ملنے کون کون آیا ہے۔“

میں نے حیرت سے عبداللہ کی آنکھوں کے تعاقب میں دیکھا اور یہ کھلا کر کھڑا ہو گیا۔ لگتا تھا پلٹ فارم میرے اور شاکر کے گھر والوں سے ہی بھرا ہوا تھا۔ امی، عہاد بھائی، مہربینہ، بھائی، عہاد، منی، شاکر اور رگبت کو دیکھ کر مجھے اتنی حیرت نہیں ہوئی جتنی کشتی صاحب اور ان کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سب سے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر ہو رہی تھی۔

مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار آنے میں بہت وقت لگا۔ مولوی علیم الدین آنکھوں میں آنسو لیے، سب سے آگے کشتی صاحب کا ہاتھ تھا۔ کھڑے تھے۔ شہر کا سب سے دلگرباز ریٹائرڈ کشتی ایک غریب مولوی کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑا تھا۔ اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی سدا کی مفرور آنکھوں میں غلظت کے بجائے شرمندگی تھی اور اس کی ہمیشہ سے اکڑی ہوئی کمرنگی ہوئی تھی۔ وہ سب وہیں کھڑے رہے، میں مولوی صاحب میری طرف بڑھے میری نظر میں خود بخود جھک گئیں، وہ قریب آگئے اور میرے شانوں پر انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔

”تم جیت گئے ہو سادیاں، تمہاری محبت جیت گئی ہے۔ تم نے ثابت کر دیا ہے کہ محبت جی ہو تو وہ سارے زمانے کو اپنے آگے جھکا سکتی ہے۔ ہم سب اندر سے ٹوٹ چکے ہیں۔ سب تم سے بے حد شرمندہ ہیں۔ کشتی صاحب خود بیل کر میرے گھر آئے تھے۔ انہوں نے اور بیگم صاحبہ نے اور سب نے اپنی غلطی کی تلافی کر دی ہے۔ معاف کر دینے میں ہی عظمت ہے۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ سب سے پہلے مجھے اور پھر اس کے بعد اپنے گھر والوں کو بھی معاف کر دو۔ ہم سب تمہاری محبت کی عظمت کے سامنے بہت چھوٹے ہیں۔ اور چھوٹوں کو سزا نہیں دی جاتی۔ دو گزر کر کیا جاتا ہے تم بھی دو گزر کر دو۔۔۔“

مولوی علیم نے ہاتھ جوڑنے کی کوشش کرنا چاہی لیکن میں نے تڑپ کر ان کے ہاتھ تمام لیے۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا اور ہم دونوں کی آنکھوں میں چھپے سیلاب بہہ نکلے۔ وہ مجھے تھپکتے رہے لیکن خود کو بھی رونے سے نہ روک پائے۔ میرا ہاتھ تمام کر وہ مجھے چند قدم ڈور کھڑے کشتی صاحب کے پاس لے آئے۔ میں سر جھکائے کھڑا رہا۔ انہوں نے بچپن کی طرح میرے گال کو زور سے سہلایا۔ اچانک میرے سامنے سے ریٹائرڈ کشتی امجد رضا صاحب ہو گئے اور میرے بچپن والے بابا آ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنی ہاتھیں پھیلائیں اور میں ان کے سینے میں منہ چسپا کر سسک پڑا۔ وہ بھی مجھے گلے لگائے رو رہے۔ برسوں کے بعد ایک باپ نے ایک بیٹے کو گلے لگا لیا تھا۔ بھرا کر کیا تھا، لگتا تھا کہ سارا اسٹیشن ہی وہاں اٹھ آیا ہے۔ امی، عہاد، عہاد، بھائی، شاکر، رگبت سب ہی مجھے اپنے تنگٹنگے میں لیے ہوئے چھو رہے تھے، پیار کر رہے تھے، پتا نہ تھا کہ کبھی ان کے ہاتھوں سے مجھے نہیں ملے گا۔ یہ اسی کے لیے آنکھوں سے پھٹتے ہیں جو آپ کے اپنے ہوتے ہیں، آپ کو پیارے ہوتے ہیں۔ اور بابا کو تو میں نے زندگی میں وہی مرتبہ بیٹکی آنکھوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ غوراً بھی زور غوراً اور دیگر مضر دروں کے ساتھ کھڑا بار بار کاندھے پر



## یادوں کی بارات

ایمان چلی گئی اور میں اُس کے جانے کے بعد لندن آ گیا۔ شاید میں بھی کہیں نہ کہیں اپنے ذہن میں اس نظریے کی غلط فہمی کا ذکر تھا کہ شاید اس کا شہر چھوڑ دینے کے بعد میرے درد میں کچھ کی واضح ہو جائے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اُس کی یاد وہ خنجر تھا جو ہمیشہ میرے دل کے سین ٹچ گزار رہا۔ جب تک لوگ آس پاس ہوتے، ذہن کچھ بڑا رہتا، لیکن تہائی لٹے ہی مجھے اس کی وہ دوڑی بڑی آنکھیں گھیر لیتیں۔۔۔۔۔ اس کے دیے ہوئے وہ دونوں موتی اور اس کا آخری خط میرے سامنے بن جاتے اور گھنٹوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس کی یاد کے آنے سے میری تہائی ہی میری سب سے بڑی محفل بن جاتی اور لوگوں کے چٹچ میں اکڑتا رہتا۔ جیسے ہی لوگ میرے پاس آتے میں تہا ہوجاتا تھا۔ پھر گھنٹوں بیٹھا بھڑچھٹے کا اظہار کرتا کہ لوگ جائیں، مجھے تہائی ملے اور پھر سے اپنی محفل جما سکوں۔ صرف ایک کامران میرے دوستوں میں سے ایسا تھا جسے میرے دل کی حالت کا علم تھا۔ جب گزشتہ دنوں میں نے اُسے ایمان کے چلے جانے کے بارے میں پہلی مرتبہ کھل کر بتایا تو بہت دیر تک توہ سکتے کی کیفیت سے ہی نہیں نکل پایا۔ اُسو اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ کرتے رہے۔ آج تک وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ ایمان کی شادی کہیں اور ہو گئی ہوگی، کیونکہ پچھلے دو سال سے نہ وہ پاکستان آیا تھا اور نہ ہی میں نے اسٹیشن پر ملازمت کے بعد اور لندن آنے سے پہلے تک اس سے کوئی رابطہ نہ کیا تھا۔ کامران اس قدر پریشان ہو گیا تھا کہ مجھ پر اُسے خواب آور دوا دے کر اس رات سلا تاڑا تھا۔ بہت دنوں تک وہ مجھ سے بھی روٹھا رہا تھا۔ کامرانی نے اتنا کچھ ہوجانے کے باوجود اسے شہر کیوں نہ کی۔ اسے میرے آہنی اعصاب پر بھی حیرت تھی کہ میں اب تک چل پھر کیے رہا تھا۔۔۔۔۔ اب میں اُسے کیا بتاتا کہ ابھی تو اصل شرمندگی کی بات تھی، کاش میرے حواس بھی ایمان کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے چلے جاتے۔ لیکن مجھے تو وہ جاتے جاتے چین کی سزا سنائی تھی۔ اور میں تھا کہ سزا کے طور پر جیسے جا رہا تھا۔۔۔۔۔

رہا بھی مجھ سے ہمیشہ یہی گھڑتی تھی کہ میں سب کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی سب کے چٹچ نہیں ہوتا۔ جانے کہاں بھٹکتا رہتا ہوں۔ الہ تہ آج اس کی ناراضگی کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔ وصال اُسے میں نے صبح ہی بتایا تھا کہ میں سارا کے گھر رات کھانے پر مدعو تھا۔ رہا کہ رات بھر کی برف باری کے بعد گھر کے ساتھ ہی برف سے اسٹو میں بنانے کی کوششوں میں مصروف تھی اور اس کوشش میں اس کے سفید ہاتھ پہلے ٹرخ اور اب سردی سے چیلے پڑتے جا رہے تھے۔ یہ بات سننے ہی وہ برف کا ڈھیر چھوڑ چھاڑ کر تیزی سے میری جانب لپکی۔

”کیا کیا۔۔۔۔۔ سارا کے گھر کھاتے پر گئے تھے۔ رات کو۔۔۔۔۔ اور مجھے ابھی بتا رہے ہو یہ بھلا کیا بات ہوئی۔؟“

”اس نے اوپر سڑا حے میں بچے مجھے یہ آخر کی تھی جب تک تم جا چکی تھیں۔ شام کو میں لاٹمیری کی کھانا کھا رہا تھا۔ جب تم ملی، دو تین بار ہواں۔“

رہا جانے کیوں رو دیا ہی ہو گئی۔ پھر خود ہی کہنے لگی۔

”جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے تمہیں سارا کے ساتھ دیکھ کر۔ غلطی میری ہی ہے، ایک فی شخص ہر کسی کے لیے ایک ساساں نہیں بن سکتا۔“



اس کے وجود کی ضمانت یوں نہیں سبھی پر یکساں نہیں ہر سکتیں۔ لیکن مجھے کوئی گناہ نہیں ہے۔ میرے لیے تمہارے وجود کا سحر اسی قیمت ہے۔ نہیں اپنے اس مقدر پر بھی بہت خوش ہوں۔۔۔۔۔“

ابھی ریکا کی بات کھل بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ اچانک ہی سامنے سے سارہ آتی دکھائی دی۔ اس نے موسم کی سناہٹ سے گہرے سرخ کی بند گٹے کی سوئیر اور کافی چیز پکائن رکھی تھی۔ برف سے بچاؤ کے لیے بند جو سے پہنچے وہ ہماری طرف بڑھی چلی آئی۔ اس کے کانوں پر وہی جیکٹ تھی جو رات سردی سے بچاؤ کے لیے نہیں اس کے کانوں پر ڈال آیا تھا۔ ریکا میری جیکٹ کو بہت اچھی طرح پہنچاتی تھی۔ اس نے فور سے آتی سارہ کو دیکھا اور پھر سے اپنے برف کے اوہ بننے کی طرف بڑھ گئی۔ سارہ نے قریب آ کر جیکٹ میرے حوالے کی۔

”یہ ریکا تمہاری امانت۔۔۔۔۔ رات کو میرا دھیان بنانے کے لیے بہت بہت شکر ہے۔“ سر آٹوک نے کہیں بعد میں میری جیبوں کی تلاش تو نہیں لی اکیلے میں۔ “سارہ زور سے اس پڑی۔

”اب ایسے بھی نہیں ہیں میرے پاپا۔۔۔۔۔ رات کو بھی انہوں نے تمہارے جانے کے بعد خود مجھ سے سواری کہا تھا۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ بہت خوب۔۔۔۔۔ واقعی یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔“

ریکا نے برف سے کیپے اپنے ہاتھ جھاڑے اور پلٹ کر بولی۔

”بھئی میں تو اندر کیمپس میں جا رہی ہوں۔ ورنہ میرے ہاتھ میں کٹ کر گر جائیں گے۔“

سارہ اُسے روکتی رہ گئی لیکن ریکا نے پلٹ کر تھیں دیکھا۔ جانے مجھے ایسا کیوں دکا کہ جیسے اگر وہ مرکزہ تحقیق تو اس کی نیکی آنکھیں بھی سارہ کو نظر آ جائیں۔ سارہ نے حیرت سے مجھ کو دیکھا۔

”اُسے کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ ہے سسرناؤ۔۔۔۔۔ تم نے میری سب سے پیاری کٹی کو اتنا اداں کیوں کر دیا ہے۔ یہ ایسی تو کبھی بھی نہ تھی؟“

”شاید اداں میرے آس پاس ٹھہری رہتی ہے، جو مجھ میرے ساتھ رہتا ہے وہ اس اداں کے گہرے میں ڈوب جاتا ہے۔“

سارہ نے فور سے میری جانب دیکھا۔

”تم باتیں بہت خوبصورت کرتے ہو۔ ریکا بھی تمہاری انہی باتوں سے کھل جاتی نظر آ رہی ہے۔ کچھ بات تو ہے تم میں؟“

مجھے اس کے سوالیہ انداز پر ہنسی آ گئی۔

”یہ سوال ہے یا کوئی فیصلہ۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میں نے اپنے پاپا کو کل رات سے زیادہ پریشان اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ میں جانتی ہوں کہ وہ بہت مضبوط انسان ہیں۔ زندگی کی ہر بڑی ہنسی کمانہوں نے سکر اتے ہوئے چھیلا ہے، اسی لیے وہ ہمیشہ سے میرے آئیڈل بھی رہے ہیں۔ لیکن جانے کیوں۔۔۔۔۔ جب سے تم اس یونیورسٹی میں آئے ہو، میں نے انہیں تمہاری جانب سے کسی نہ کسی آنکھ میں ہی جتلا پایا ہے۔ کل رات بھی میری پاپا سے اسی بات پر بحث ہو رہی تھی کہ کیا وہ مجھے یا میرے عقیدے کو اتنا کمزور دیکھتے ہیں کہ میں اس سے پلٹ جاؤں گی۔ ہمیں بچپن سے یہ بات بتائی جاتی ہے کہ تم عظیم ہیں اور عظیم رہیں گے۔۔۔۔۔ تو کیا ہماری عظمت کسی ایک لڑکے کے انکار کرنے سے کیا کم ہو جائے گی۔ کیا

ہمارا عقیدہ اتنا کمزور ہے کہ کسی اور کا ایمان اس میں دراڑیں ڈال دے گا۔۔۔۔۔؟“

میں نے چپ کر کے اس بڑے اعتماد کی کی بات منسار۔

”پھر تمہارے پیانے تمہیں کیا جواب دیا۔“

”مجھے حیرت اور محسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پہلی مرتبہ انہوں نے روایتیں باپ کے رویے سے کام لیا۔ جو دلیل اور لاہک کی بجائے اپنا تجربہ اور خدشات اپنے بچے کے ذہن میں ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے اندر کے خوف سے اسے ڈرانے کی کوشش کرتا ہے۔ تم نے اس دن کہا تھا کہ اندھیرا ہمیشہ روشنی سے ڈرتا ہے۔ اگر یہ اندھیرا ہے تو میں خود بھی اس اندھیرے کا ایک حصہ ہوں۔۔۔۔۔ پھر مجھے تم سے تمہارے عقیدے سے خوف محسوس کیوں نہیں ہوتا؟“

سارہ کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ سر آٹک کے رویے نے اسے الجھن میں ڈال دیا ہے۔ میں اس کی باتیں سن کر یہ سوچتا رہا کہ مغرب اور مشرق کے دونوں میں کس قدر فرق ہے۔ یہاں مغرب میں ایک نبی باپ سے اپنے غلام یا گھج ہونے پر یا قاعدہ کسی طرز کی طرح جرح کر سکتی تھی اس سے لڑ سکتی تھی، درویش کرنا مرض ہو سکتی تھی جب کہ مشرق میں کسی جوان لڑکی کا باپ کے سامنے یوں کھڑا ہونا بھی محال تھا۔ چہ جائیکہ وہ اپنے باپ سے کوئی سوال کر سکے۔۔۔۔۔ کیوں مجھے اس کے ایمان بہت شدت سے یاد آئی۔ سارہ اپنی رو میں نہ جانے کیا کچھ بولتی رہی۔ پھر اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”کہاں کھو جاتے ہو یوں ہل بھر میں۔“

آج اس نے بھی اچانک وہی سوال پوچھا تھا جو بچہ اس سے پہلے کی مرتبہ پوچھ چکی تھی۔

”کہیں نہیں۔۔۔۔۔ بس تمہاری بات سن رہا تھا۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ تم میری بات سننے ہوئے بھی یہاں نہیں تھے۔ تم کبھی بھی ہم لوگوں کے ساتھ نہیں ہوتے۔ میں نے آج تک کسی کی آنکھوں میں فداہی کے سائے نہ دیکھے۔ اگر کوئی بہت ذاتی بات نہ ہو تو تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔“

اب میں اس مصوم لڑکی کو کیا بتاتا کہ میرے ساتھ کتنے غم میرے ابدی ساتھی ہیں۔ میں اسے یہ سب بتا کر اسے فائدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”واہستان اتنی لمبی ہے کہ تم سن کر آتا جاؤ گی۔ ہاں البتہ یہ یقین رکھو کہ اس میں کچھ ایسا ذاتی نہیں ہے جسے تم سے چھپایا جائے۔ جب کبھی ہمیں فرصت ہوئی اور ہم دونوں ساتھ ہوئے تو تمہیں ضرور بتاؤں گا۔“

دو خوش ہو گئی اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولی۔

”وہو۔۔۔“

میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”پکا وعدہ۔۔۔“

پھر وہی دو ہلکے سے گڑھے اس کے چہرے کا نور بڑھا گئے۔ کھاس کی گھنٹی تیسری بار بج چکی تھی۔ ہم دونوں ہی وہاں سے چل دیے۔۔۔۔۔

☆☆☆

## خوف

پھر ایک عجیب بات ہوئی، یونیورسٹی انتظامیہ نے اچانک اعلان کر دیا کہ اس سال پہلے کی طرح طالب علم اپنا پرچہ اور تحقیق ہمیشہ کی طرح کھلے ہال میں تمام یونیورسٹی کے سامنے نہیں پڑھیں گے۔ بلکہ تمام اسٹوڈنٹس پہلے اپنا نام بچہ لاہری میز میں جمع کروائیں گے اور انتظار میز اس کی جانچ اور تحقیق کے بعد چند منتخب شدہ پرچوں کو عام طلباء کے سامنے تقریب میں پڑھنے کی اجازت دے گی۔

سارہ اس بات سے بھی شدید جھلائی ہوئی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ اصل میں معاملہ کیا تھا۔ سراسر نرک نہیں چاہتے تھے کہ میں اپنی تحقیق کسی بھی صورت میں دوسروں تک پہنچاؤں۔ وہ اس نئی نسل کو "ہالوکاسٹ" کا وہی ڈر دکھانا چاہتے تھے اور اسی یقین میں زندہ رکھنا چاہتے تھے جو برسوں سے اس نسل تک پہنچایا جا تا رہا تھا۔ مجھے پہلی ڈر ایک عجیب سا طمانیت بھرا احساس ہوا۔ مجھے ایسا لگا کہ خود کو عظیم کہنے والے اصل میں مجھ سے خوف زدہ ہیں۔ میرے عقیدے سے خوف زدہ ہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ خود کو عظیم کہلانے کا حق اگر کسی کو ہے تو اصل میں وہ ہم ہیں۔ لیکن ہماری عظمت ہم خود اپنے ہاتھوں سے گھونپ چکے ہیں۔ اور ان یہودیوں کو پڑے کہ کہیں ہم پھر سے اپنی اس عظمت گم نہ ہو کہ پائندہ لیں۔

بہت دنوں کے بعد سراسر نرک آج کلاس میں پڑ سکون دکھائی دے رہے تھے۔ شاید ان کے سر سے بہت بڑا بوجھل گیا تھا۔ دیکھا پہلے ہی پتلی جیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے چھوٹے ہی سراسر نرک سے پوچھا کیا کہ اس مرحلہ پر اساتذہ یونیورسٹی نے نرم ہجیرے سے متعلق اپنا اصول کیوں بدل لیا ہے۔ سراسر نرک نے بڑی خوبصورتی سے اسے انتظامیہ کا اندرونی معاملہ کہہ کر ٹال دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ہر سال کچھ معیاری پرچوں کے ساتھ ساتھ بہت سے غیر معیاری پرچے بھی آ جاتے تھے۔ اس لیے اس مرحلہ منتخب شدہ پرچوں کو ہی منظر عام پر لایا جائے گا۔ دیکھنے کا نڈک چٹ پر لکھ کر چٹ مری طرف کھسکائی، اس نے چٹ پر لکھا تھا کہ کیا وہ سراسر نرک سے براہ راست پوچھ لے کہ کہیں یہ پابندی میرے نرم ہجیرے کے موضوع کی وجہ سے تو نہیں لگائی گئی۔؟ نہیں نے آکھیں نکال کر اسے گھورا تب کہیں جا کر وہ یاد آئی روٹ اس سے کوئی بعید بھی نہ تھی کہ وہ یہ سوال بھی سراسر نرک سے کر چکی تھی۔

اتفاق سے سارہ کے نرم ہجیرے کا تعلق بھی "ہالوکاسٹ" سے ہی تھا۔ وہ دراصل فریڈلینڈ کیلبر، نامی ایک یہودی مصنف کی تحقیق پر مبنی تھا مقالہ لکھ رہی تھی جس نے "ہالوکاسٹ" کے حق میں اپنی تعریف (روزنامہ نیچوز) میں مختلف دلائل دیے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے بہت سی کتابوں اور یوز اور مختلف حوالوں سے اس مفروضے کو حقیقت ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

سارہ نے مجھ سے بھی اپنی تحقیق چھپائی نہیں تھی بلکہ وہ مسکرا مسکرا کر مجھے چیلنج کرنے کے انداز میں اپنی روزانہ کی پیش رفت کے بارے میں بتاتی رہتی تھی۔ دیکھا پرچہ دو لمحے بہت گراں گزرتے تھے جب سارہ میرے ساتھ کسی بحث میں مصروف ہوتی۔

پھر ایک ایسے ہی اچلے دن جب پوری یونیورسٹی دھوپ پینکے کے پھر میں جھنمی منانے کے موڑ میں تھی۔ میں نے دیکھا کہ ہاتھ سے پکڑ کر

اپنے ساتھ شہر کنارے اپنی مخصوص بیٹھ پر بٹھا لیا۔ آج نہیں نے اس سے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ آج میرے اس ایمان پر غامضی حیران بھی تھی۔

”جنمو یہاں۔۔۔۔۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

اس نے حیرت سے اپنے ہاتھ میں پھنسے میرے ہاتھ کو دیکھا اور پھر ہنس دی۔

”بے میڈی۔۔۔۔۔ کیا بات ہے۔۔۔۔۔ آج کہیں مجھے پر پوز کرنے کا ارادہ تو نہیں ہے۔“ ”کاش میں اکتا خوش قصبہ ہوتا۔ تمہارا

ساتھ پانے والا دونوں جہاں پالے گا۔“ ”ریکا کی آنکھوں میں ہلکے وقت بہت سے شرارے لپکے۔

”واقعی۔۔۔۔۔ کیا تم ایسا سمجھتے ہو۔۔۔۔۔ مجھ میں تو ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔“ ”تمہارے وجود میں اور تمہاری اس خوبصورت روح

میں وہ سب کچھ موجود ہے جو دنیا کے کسی بھی نوجوان کے خوابوں کی تمنا ہو سکتی ہے۔ تم جس راستے سے گزر جاتی ہو لوگ گھنٹوں وہاں مسحور بیٹھے رہتے

ہیں۔ تمہاری ایک جھلک پانے کے لیے تم سے دو گھڑی بات کرنے کے لیے نہیں نے یہ نہیں اسی پونیر مٹی میں جالے کشتوں کو دن رات پریشان دیکھا

ہے۔ پھر بھی تم کہتی ہو کہ تم میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔“

میں نے اس بے باک مغربی شخص کے چہرے پر پہلی مرتبہ شرم کی غرقی دیکھی۔ عورت دنیا کے کسی خطے کی بھی ہو۔ اس کے دند کہیں نہ

کہیں یہ وصف ضرور موجود ہوتا ہے۔ وہ ہنس کر بولی ”ہاں۔۔۔۔۔ کچھ نہ کچھ خاص بات تو ضرور ہو گئی تھی یہ سب آجیں بھرتے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن وہ

خاص بات نہیں جو اس کے چہرہ کو موسم کر دے۔ جس کو نہیں پکھلانا چاہتی ہوں۔ پھر یہ سب کچھ میرے کس کام کا۔“

تو آج ریکا نے بھی دل کی بات کھل کر کہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ہمارے سامنے بیٹھ سے نکلی اس شہر کا برف جیسا پانی نہایت خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ پانی میں جی برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی

حیرت سے ہوئے سامنے سے گزر جاتے تھے۔ ایک ایسے ہی برف کے چھوٹے سفید رنگ مرمری سیل ٹھاٹھوں پر پرندوں کا ایک جوڑا بیٹھا ہمارے

سامنے سے گزرا جو برف میں ہنسی گھاس کے ٹکڑے لٹکانے میں مشغول تھا۔ دوپ سیدی ریکا کے سنہری رنگ پر پڑا ہی تھی اور اس کا چہرہ مزید کند

ہو گیا تھا۔ ہلکے سرکٹ اور ہلکے ٹاپ میں وہ اس وقت بالکل کالے ٹھل میں لپٹی موندے کی ایک گڑیا لگ رہی تھی۔

ریکا اپنی بات کہہ کر پچ چاپ بیٹھ کر منہ میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بچھلنے لگی۔ اس نے ٹکڑے بچھلنے کے لیے ہاتھ ہوا میں اٹھایا تو نہیں نے

دیکھا اس کی کلائی تھام لی۔

”کیا ضروری ہے کہ سب جذبہ ساری خوشیاں، ہر خواہش کسی ایک شخص سے ہی متصل کر دی جائے؟ ہو سکتا ہے وہ بے نصیب اس انجام

حاصل واری نہ ہو؟۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے حصے کے سامنے رنگ ساری قوس و قزح پہیلے ہی کہیں غماز چکا ہو؟“

ریکا نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ انکی خوبصورت آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے تھے۔ ”اگر وہ اپنے حصے کی قوس و قزح پہیلے ہی کسی اور کی

آنکھوں میں اضمحط چکا ہے تو پھر ہوں سمجھو کہ میری زندگی میں بھی ہر رنگ سے میرا حق ادا نہ ہو سکتا۔ بتائی جھن چکا ہے۔ میری محبت بھی ہمیشہ بے نوری رہے گی۔“

یا خدا۔۔۔ اس لڑکی کو اتنی مشکل باتیں بھی آتی ہوں گی۔۔۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ شاید یہ محبت ہی ہوتی ہے جو ہمیں ایسی کنکھن یولیاں سکھا جاتی ہے۔ ربیکا کا دل بھی مند پڑا گیا تھا۔ محبت بھر سے اپنا صدیوں نہ انا کھیل کھیل رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ عاشق اور محبوب کی جگہ اور نام بدل گئے تھے۔ باقی ساری چیزیں ساری کاٹ، سارے گھاؤ دی تھے۔ کاش ہم انسانوں کو اتنا تو اکتیادیا ہوتا خدا نے کہ اگر ہم خود کو نہیں، تو کم از کم دوسروں کو تو اس آگ سے بھرے گڑھے میں گرنے سے روک سکتے۔ لیکن قدرت کو تو خود یہ قہر تھا دیکھنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ وہ دو انسانوں میں سے کسی ایک کے دل میں دوسرے کے لیے یہ آگ بھڑکا کر اُسے بھر کے لیے سسکتا اور تڑپا ہوا دیکھنا پسند کرتی ہے۔ قدرت تو اس کھیل کی ازل سے سب سے بڑی کھلاڑی ہے۔ وہ ادھرنک ہم انسانوں کو بھئی تڑپاتی سکتا رہے گی۔ جیسے وہ اس وقت ربیکا کو تڑپا رہی تھی میرے لیے۔ وہ ربیکا جسے اس بات کی خبر بھی نہیں تھی کہ میری زوجہ تو جانے کب کی ایمان کے ساتھ ہی پرواز کر چکی تھی۔ یہ سانس لینا جسم تو خدا کا عطیہ بھرتی لاش تھا، محبت کا وہ زہر جو آج اس کی رگوں میں دیر سے دیر سے اتر رہا تھا۔ بہت پہلے میری جان لے چکا تھا۔

ربیکا سر جھکائے بیٹھی اپنے آنسو پینے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی بلندی۔ اس کی جھیل جھلی نیلی آنکھوں میں جانے کتنے گھنور چھلچھلے گیتا رہے۔

”نہیں۔۔۔ تم نہیں روؤ گی۔۔۔ بہت زلال لیا اس محبت نے ہم جیسے بے بس انسانوں کو۔ بہت کھیل لیا ہے اس نے ہمارے جذبات کے ساتھ۔ بہت گھاؤ لگا چکی ہے محبت بہت چر کے سبہ لیے ہم نے اس کے چلائے ہوئے اندھے تیروں کے۔۔۔ نہیں ربیکا۔۔۔ تم نہیں روؤ گی۔۔۔ نہیں۔۔۔ اب اور نہیں۔“

میں اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھتا جا رہا تھا اور اسے رونے سے منع کرتا جا رہا تھا لیکن جس رفتار سے میں اس کے آنسو پونچھتا تھا اس سے کہیں زیادہ تیزی سے مزید آنسو اُٹھتے آ رہے تھے۔ ربیکا بار بار مجھ سے معذرت کرتی کرتی اور نہ رونے کا وعدہ کر رہی تھی لیکن اس کے اندر کا سیلاب آج پوری طرح بہہ جانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ پھر وہ وہاں سے اٹھی اور بھاگی ہوئی وہاں سے ڈور چلی گئی۔ میں اُسے ڈور جاتے دیکھتا رہا۔ نہر پر راج ہنسوں کے ایک جھوٹے نے پانی کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا اور تیزی سے تہ پھڑ پھڑا کر پانی کے اوپر آ کر بیٹھ گیا۔ ہنسی سے ہنس سے پوچھا۔ ”وہ راج ہنسی رو کیوں رہی تھی۔ اس کا ہنس کہاں ہے؟ ہنس نے ایک لمبی اڑان بھری اور پھر سے ہنسی کے سر پر منڈلا کر بیٹھ گیا اور بولا۔

”یہ انسانوں کی دنیا بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ اس ہنسی کا ہنس تو کہیں زور و زور تک نظر نہیں آیا۔ ایک ہنس وہاں نہر کنارے بیٹھا تو ہے لیکن اس کی تو اپنی ہنسی کا بھی کچھ پتہ نہیں۔ یہ کیسے بے جڑ سے جڑ سے کنارے ہیں تقدیر نے ان انسانوں کے زمین پر۔ ان سے تو ہم ہوا کے دوش پر تیرتے راج ہنس ہی بھلے۔ ہم میں سے ہر اک کا اپنا جڑا تو ہے۔ اور وہ اس کے ساتھ بھی ہے۔ ہنسی نے اک دکھ بھری نظر زور بھاگی ربیکا پر اور پھر مجھ پر ڈالی اور پھر اپنے ہنس کے ساتھ ایک لمبی اڑان بھر گئی۔ میں وہیں اکیلا تنہا بیٹھا رہ گیا۔۔۔۔“

☆☆☆





مجھ سے کہا کہ میں کل پارکسوں پکڑ لگا لوں کیونکہ آج وہ کچھ مصروف ہے۔ اب جب کہ جوزف نے مجھے لاہور یونین بائری کی قومیت کے بارے میں بتایا تو مجھے اس کے رویے کی سمجھ آ رہی تھی۔ اُس کے انکار کے بعد میں نے ذرا ہنسی سے اس سے کہا تھا کہ وہ مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں لاہور یونین کی اعلیٰ انتظامیہ باندن میرا افس میں لاہور یونین شیعہ میں اس کے سسٹم رویے کی شکایت کروں، اس پر اس نے منہ بناتے ہوئے ان دونوں سے ایک مقالہ مجھے کہیں اندر سے نکال کر دے دیا۔ دوسرے کے بارے میں اُس نے غدر پیش کیا کہ وہ ایک وقت میں دونوں مجھے جاری نہیں کر سکتا لہذا پہلا پڑھنے کے بعد وہ واپسی پر مجھے دوسرا دے گا۔ اور میں چپ چاپ ایک ہی مقالہ لے کر واپس چلا آیا تھا۔ اُس اتنی سی بات تھی، نہ تو میں نے اُس لاہور یونین کو کوئی دھمکی دی تھی، نہ ہی اس سے آؤ بچی آواز میں بات ہی کی تھی۔

مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ اُسے میری یونیورسٹی کا پتہ کیسے چلا اور وہ میرا تک کیسے پہنچ گیا تھا۔ بھی میرے ذہن میں ڈی کارڈ کا خاکہ سا اُبھرا۔ اور۔۔۔ تو اس نے کتاب جاری کرتے وقت میری یونیورسٹی سے جاری شدہ میرا آئی۔ ڈی (شناختی نمبر) نوٹ کر لیا تھا۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ میرے گرد گھبراہٹ بھرا ہوا تھا۔

جوزف کے تانے کے بعد میں شام تک بیٹھا اپنے نرم پیچ کو اتھکی شکل دیتا رہا۔ اب میں جلد از جلد اُسے ختم کر کے پیش کر دینا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں مجھے ایسا کیوں محسوس ہونے لگا تھا کہ میرے پاس وقت کم ہے۔ مجھے اس وقت اوش آ یا جب چھ بجے شام یونیورسٹی کے لاہور یونین نے بتایا کہ لاہور یونین بند کرنے کا وقت ہو چکا ہے۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا، باہر واقعی اندھیرا چھا چکا تھا۔ باہر لٹکا تو سرد، نوا کے پہلے تھیرے نے ہر اہر پر استعمال کیا۔ آسمان سرخ انگارہ، دھواں، برف، باری کے آثار واضح ہو رہے تھے۔ گیٹ سے باہر لٹکا تو دور دور تک کسی سواری کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں نے اگلے جاک تک میٹرو کی تلاش میں پیدل چلنے کا ہی فیصلہ کر لیا، دو لندن شہر کی روشنیاں اب پوری طرح بج لگنے لگی تھیں۔ اوچھے اوچھے نیون سائنز زمین پر اترے ستاروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ اچانک میرے اور کوٹ کی جیب میں رکھا فون بج اٹھا۔ دوسری طرف سارا تھی۔ اُس کی ماتم آواز فون پر ابھری۔

”ہے مسز ماد۔۔۔ بھی ہم سیورڈیوں کے خلاف مواد اکٹھا کرنے سے باز بھی آ جایا کرو۔ کیا کر رہے ہو؟“

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔

”پیدل چلنے کی پریکٹس کر رہا ہوں، موسم کا لحاظ ہے، دل جو اب ہے اور دستہ طویل ہے۔ سوچا جا رہا ہوں اپنی دھن میں کمن۔“

سارا بھی میری بات سن کر ہنس دی۔

”میرے پاس البرٹ ہال میں ہونے والے اسٹیج قہیڑ کے دستک ہیں۔ ممائی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور پاپا کو تم نے ہزار غلوں میں جتا کر رکھا ہے۔ چلو میرے ساتھ قہیڑ دیکھنے کے لیے؟“

”ایک خوبصورت لڑکی جب کسی نوجوان کو اپنے ساتھ کہیں باہر لے جانا چاہتی ہو تو اس کے عقل مند ماں باپ کو ایسی طرح کے بہانے کر

لیے پائیں۔“



سارہ کی فلی فون پر ابھری۔

”کہاں آجاس وقت۔۔“

میں نے اُسے اس سڑک کا پتہ بتایا جس پر میں اس وقت مڑ گشت کر رہا تھا۔ چند ہی منٹوں میں سارہ کی سفید نقل کار نمودار ہو گئی۔ اس نے میری ٹھکری اوچے نیچے والی سوئزر بلیک اسکرٹ کے ساتھ پہنی ہوئی تھی اور بال کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ آج میں نے پہلی مرتبہ اُسے پوری طرح بے ستورے ہوئے دیکھا تھا۔ ورنہ عام طور پر وہ میک اپ وغیرہ سے بے نیاز سادہ سی راتنی تھی۔ اُس نے گاڑی میرے قریب لا کر روکی۔

”میں سر دشا میں ایک جوان پردیسی لڑکے کا لندن کی سڑکوں پر تھپا گھومنا کچھ ٹھیک نہیں۔ جلدی سے میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ، میں تمہیں تمہاری منزل پر پہنچا دوں گی۔“

میں مسکراتا ہوا اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سارہ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کچھ ہی دیر میں ہم مضائقہ سے گزرتے ہوئے جا گئے ہوئے بلوگاتے لندن پہنچ گئے۔ چلتی ہوئی شیشے جیسی دکائیں وہوں اطراف کھلی ہر گزرتے راہی کی توجہ کھینچ رہی تھیں۔ سنٹرل لندن کے بڑے بڑے کسمو (جوئے خانے) شام ہوتے ہی کھل گئے تھے اور باہر کھڑی نیم عریاں لڑکیاں لوگوں کو اندر آنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ یہ سب کئی کئی منزل کسمو تھے۔ جن کے اندر جانے کے لیے بڑے بڑے دروازے بنے ہوئے تھے۔ آپ اپنی گاڑی سمیت اندر دینی عمارت جا سکتے تھے حتیٰ کہ لگنے والی لمٹوں کے بڑے بڑے بورڈ اعلیٰ بچھ رہے تھے۔ ان میں سب سے بڑا بورڈ نئی فلم کنگ کا لگنا تھا۔ محل میں بورڈ کیا تھا اس کی منزل بہت بڑا کنگ کا ٹک ہوا تھا جو بجلی کی روشنیوں سے بن رہا تھا، بچھ رہا تھا۔ مجھے کنگ کا لگنا کا بورڈ دیکھ کر تخیلی یاد آ گیا۔ اُسے یہ فلم بے حد پسند تھی۔ لیکن وہاں کے سینما ڈس میں ابھی کنگ کا ٹک نہیں لگی تھی۔ اب ہم بڑے ہل کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ ہل کے گرد بڑی بڑی جہازیں سازی کی جیلی روشنیوں نے دن کا سماں باندھ رکھا تھا۔ سٹیل بند تھا، شاید کوئی اسٹیر پیچے سے گزر رہا تھا، خود کار ہل دو میاں میں سے علیحدہ ہو کر اوپر اٹھ چکا تھا۔ بحری جہاز بھوسہ بجاتا ہوا اہل کے درمیان سے گزر گیا۔ جہاز کے عرشے پر کھڑے لوگوں نے اپنے شہر کے پاسیوں کو دیکھ کر خوشی سے غرے لگائے۔ ہاتھ ہلا کر دھند کیا کہ اللود و اے شہروں کے شہر لندن۔ ہم چند ان کے لیے قیم سے جدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ وعدہ رہا کہ ہم پھر ملیں گے۔ اور بہت جلد ملیں گے۔ جب تک اپنی اس رشتہ داری اور بلوگاتوں میں کمی نہ آنے دینا۔ جی ہے دونوں کے ہر خطے کے پاسیوں کو اپنا شہری دنیا کا سب سے خوبصورت شہر لگتا ہے۔ مجھے اپنا کوئی بھی اسی طرح اور اتنا ہی پیارا تھا۔ اس شہر کی فضا میں میری ایمان کی محک نبی ہوئی تھی۔ اس کی دوسری شاموں میں بھی ابھی تک کے کھلنے کے بلکی کی میری پسندیدہ خوشبو موجود تھی، جو چھپن سے ہی میری روح کو کھینچ لیتی ہے۔ یہ شہر بھی میں کس طرح خود سے باندھ لیتے ہیں۔ جیسے کوئی خون کا رشتہ وہاں سے۔

سارہ گاڑی بے حد تیز چلا رہی تھی۔ ہل جڑ سے ہی تھوڑی دیر میں ہم ایلبرٹ ہال کی پارکنگ میں موجود تھے۔ ہال میں بہت بھڑکتی۔ ضرور کوئی خاص تہیہ تھا۔ ہماری نشستیں دوسری رومیں ہی تھیں۔ ہمارے بیٹھنے کے کچھ دیر بعد ہی ہال کی روشنیاں بجھا دی گئیں۔ سامنے اسٹیج کا پردہ اٹھا دیا گیا۔ محبت کی کوئی کہانی تھی۔ کہانی محبت کی ہی ہو سکتی ہے۔ محبت ہی تو ایسی لاکھوں کہانیوں کو جنم دیتی ہے۔ اسٹیج پر ہیرو، ہیروئن سے دوام لے کر رخصت ہو رہا تھا کیونکہ اسے اپنے قہبے سے کہیں دور ملازمت مل گئی تھی۔ لیکن میری ٹھیک جانتا کہ راستے میں جو گناہ جنگ پڑتا ہے وہاں چھپے شیر سے اس

کی زندگی کی تاک میں ہیں۔ وہاں ہیر وئن کی سوتیلی ماں اسے بکری جہاز کے ذریعے مزدوری کے لیے دور دراز کے شہر لندن بھیج رہی ہے۔ ہیر وئن اس بات سے بے خبر ہے کہ اصل میں اس کی لاپٹی سوتیلی ماں نے بکری قزاقوں کے ہاتھ اس کا سودا کر دیا ہے۔ جو اسی بکری جہاز پر موجود ہیں۔ جس میں اسے سمندر پار جانا ہے۔ اسٹیج کا منظر لڑکی کی آخری ملاقات کا منظر تھا۔ جس میں دونوں ہی اس بات سے بے خبر ہیں کہ یہ ان دونوں کی آخری ملاقات ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے ایک سال کے بعد کی ملاقات کے وعدے کر رہے ہیں۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو جھوٹے دلا سے دے رہے ہیں۔ منظر میں جان بھرنے کے لیے دونوں اداکار جم کر اداکاری کر رہے تھے۔ ہدایت کاری اور مکالمے بھی زیر دست تھے۔ پورے ہال پر سنا سنا چھایا ہوا تھا۔ ہیر وئن کے گزر رہا ہے۔ ٹیس منظر میں ولیم ورڈ زودھ کی مشہور نظم "ایک بریلی شام میں جنگل میں رکتا" کے مکالمے کو سنا رہے ہیں۔

"یہ گمنا جنگل

یہ بریلی شام

سب کس قدر دلکش ہے

لیکن مجھے تو اپنے وعدوں کا مجرم مکتا ہے

اور سونے سے پہلے

میلوں کا سفر طے کرتا ہے۔۔۔

اور سونے سے پہلے۔۔۔ میلوں کا سفر طے کرتا ہے۔"

میں نے شاید ساتویں جماعت میں ولیم ورڈ زودھ کی "Stopping by woods in a snowy evening" پڑھی تھی۔ آج اپنی آنکھوں کے سامنے پھر سے اُس منظر کو حقیقت بننے دیکھ رہا تھا۔ یہاں لئیر سے ہیر وئن جلد آ رہے ہیں۔۔۔ وہاں بکری قزاق لڑکی پر بکری سڑکے دوران بھینٹ پڑتے ہیں۔ یہاں ہیر وئن کے سینے میں جھجکھوپ دیا جاتا ہے وہاں لڑکی قزاقوں سے بچنے کے لیے سمندر میں کود جاتی ہے۔ یہاں ہیر وئن مرتے لئیروں سے اٹھتا کرتا ہے کہ اس کی موت کے بارے میں لڑکی کو بتایا جائے ورنہ وہ بھی مر جائے گی۔ وہاں لڑکی سمندر میں ڈوبنے سے پہلے قزاقوں سے چلا کر زاری کرتی ہے کہ لڑکے کو اس کی موت کی اطلاع نہ دی جائے ورنہ وہ بھی خودکشی کر لے گا۔ دُعا کرنے والے ایک بار بھرقا ہو جاتے ہیں۔ ہال میں بیٹھے تقریباً سب لوگوں کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ عورتوں کی تو ہاتھ اُٹھ سسکیاں سناتے ہیں سناٹے میں سناٹے دے رہی تھیں۔ پردہ کرنے کے بعد بھی بہت دیر تک سب لوگ مبہوت سے بیٹھے رہے۔ اور پھر اچانک ہی ہال تالیوں کی بے پناہ گونج سے دھل سا جاتا ہے۔ میں نے سارہ کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں کے گوشے بھی میچکے ہوئے تھے۔

میں اور سارہ جب ہال سے باہر نکلے تو لندن برف کی سفید چٹلی چارہ سے ڈھک چکا تھا۔ پارک میں کھڑی سارہ کی سفید فوسکی (وٹل) کو میں پر پڑی برف کا ایک حصہ لگ رہی تھی۔ جیسے شریر بچوں نے سنو مین کی جگہ برف کی گاڑی بنا ڈالی ہو۔ جب تک ہم البرٹ ہال کی قریبی

خواتین کے مقبول ترین ناول

کیا اسیری کیا رہائی

قیمت: 250

فائزہ افتخار

گلیوں سے نکل کر بڑی شاہراہ پر آئے تب تک لندن کی رات سوچنی تھی۔ سارے شہر پر جیسے کسی نے سفید ترادہ چھڑک کر اس پر جادو کر ڈالا ہو۔ دور کہیں ٹیلا ٹکرا سکو اڑے گھنٹہ گھرنے رات کے بارہ بجنے کی نوید سنائی۔

ہماری گاڑی برف سے بھری سڑکوں پر پھسلتی جا رہی تھی۔ سارہ ابھی تک تھیرے کا اثر میں تھی اور پچپ چاپ گاڑی ڈرائیج کرتے ہوئے دھڑ سکر رہی تھی۔ میں خود بھی کھوپا کھوپا سا تھا، پھر سارہ نے ہلکے سے کہا۔

”مجھے ایسی جھپٹوں کا انجام ہمیشہ سے بہت افسوس کرتا ہے۔ پھر میں گھنٹوں یونہی گم صبر رہتی ہوں۔“

”جھپٹوں کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔“ میرا جواب سن کر اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”تم جھپٹوں کے بارے میں اتنی گہرائی سے کیسے جانتے ہو۔ اس دن تم نے محبت کے پہرہوں کو جب بیان کیا تھا تو میں، بہت دن تک مہارے حصارے محبت کے بارے میں خیالات پر بات کرتی رہی۔ پھر اس دن تم نے ایک طرف محبت کی بات بھی کی اور اسی کو محبت کی شام بنا لینے کا مشورہ بھی دیا۔ کوئی محبت کے بارے میں اتنی تفصیل سے کیسے جان سکتا ہے۔۔۔۔ اس کے لیے تو آئے ہزار جھپٹوں کے عذاب جھیلنا بھی کم پڑے ہوں گے۔“

”کبھی کبھی ایک محبت ہی ہزار جھپٹوں پر بھاری ہوتی ہے۔۔۔ ہزار جھپٹوں جیسا بارود، ہزار جھپٹوں جیسی مٹی اور خربدے جاتی ہے۔“

سارہ نے فوراً سے میری طرف دیکھا۔

”گو یا تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟“

”جانے کیوں کبھی کبھی یہ لفظ محبت مجھے بہت ناکامی معلوم ہوتا ہے۔۔۔ کبھی کبھی قصص ایسا نہیں لگتا کہ ہمارے لفظوں کی وسعت اور دیکھ بھری بہت محدود ہے۔ ہماری زبان، ہمارے لفظ اور ہماری اہانت صرف ظاہری اور اوپری احساسات کو ہی بیان کر سکتے ہیں۔۔۔ بات صرف محبت، عشق اور جنون پر ہی آکر کیوں ختم ہو جاتی ہے؟ جو جذبات جنون اور دیوانگی سے بھی بڑھ جائے۔ اس کے لیے کوئی دوسرا نام کیوں نہیں ہوتا؟ ہمارے پاس؟

سارہ فوراً سے میری بات منہ نہ رہی۔ اس کے چہرے پر عقیدت سی تھی۔ کچھ ضبط جیسے اندر ہی اندر کچھ مارنے کی کچھ دبانے کی کوشش کر رہی ہو۔

”کیا نہیں پوچھ سکتی ہوں کہ وہ خوش نصیب جس کے لیے تمہارے جذبات، تمہارے لفظ کم پڑ جاتے ہیں۔ اس وقت کہاں ہے۔؟“

”وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔۔۔۔۔۔“

سارہ کے ہاتھوں سے اسٹرنگ چھوٹے چھوٹے جھپٹے بننا لگی۔ برقی سڑک پر زور سے لہرائی سارہ مزید بولنا لگی۔ میں نے سیٹ کے ساتھ لگی بندر بیک کھینچ دی۔ گاڑی اپنے ہی زور پر گھومی اور کچھ دیر کھینچتی ہوئی ڈورفٹ پاچھ کے ساتھ لگ کر رک گئی۔ سارہ نے اپنا سر اسٹیرنگ پر رکھ دیا۔ میں نے جلدی سے اُسے بلایا۔

”تم فیک ہو۔۔۔ معذرت چاہتا ہوں۔۔۔ مجھے قصص اس طرح سے نہیں بتانا چاہیے تھا یہ سب کچھ۔۔۔۔۔۔ لفظی میری ہی ہے۔“

سارہ نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کی۔

”نہیں۔۔۔ تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔۔۔ میں ہی تمہاری باتوں میں اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ اپنا اختیار کھو بیٹھی۔“

”تم کہو تو پانی راستہ میں گاڑی چلا سکتا ہوں۔“

سارہ نے کچھ نہیں کہا اور چپ چاپ اسٹیزنگ سائٹ سے انز کر میری طرف آگئی۔ میں بھی دروازہ کھول کر اس کی سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے گاڑی آگے بڑھادی۔ سارہ ابھی تک گم صم ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر وہ سامنے دنگ سکرین میں سے باہر دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔

”اتنا بڑا درودل میں رکھ کر تم کیسے مسکرا لیتے ہو۔۔۔۔۔ کبھی کسی کو اپنے اندر کے دھم جھانک کر دیکھنے کا موقع بھی نہیں دیا۔۔۔۔۔“

واقعی۔۔۔۔۔ تم سب سے الگ ہو۔۔۔۔۔ سب سے ہنسا ہو۔۔۔۔۔ اس دنیا کے نہیں ہو۔۔۔۔۔“

میں چپ چاپ گاڑی چلا رہا تھا۔ ویسٹ فٹ پریس سے کچھ پہلے پکاڑی سے تیسری سڑک کے قریب سارہ نے مجھے گاڑی ایک بہت ہی کشادہ لیکن انتہائی سی سڑک پر موز نے کہا۔ میں نے بناء کچھ پوچھے گاڑی اس لمبی چوڑی سمنان سی سڑک پر موز دی۔ کچھ دور چل کر سڑک کے نیچوں سچ ایک بہت بڑا سا چوراہا تھا۔ اتنا بڑا کہ اس کے گرد گھومنے کے لیے گاڑی کا پورا اسٹیزنگ تھمنا پڑتا تھا۔ ہمیں سے سڑک چار حصوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ چوراہے کے اندر ایک بہت بڑا فوارہ لگا ہوا تھا جس میں سے پانی کی دھاریں سردی کی وجہ سے نکلنے نکلنے جم نکلیں تھیں۔ چوراہے سے نواتے ہی سڑک کے آخر میں بتایا ہوا ہوں گا ایک بہت ہی قدیم، سفید پتھر سے بنا ایک عظیم الشان چرچ سامنے آ گیا۔ چرچ کی سفید عمارت اس وقت برف سے اتنی ہوئی کسی پری کا مکمل لگ رہی تھی۔

میں نے گاڑی چرچ کے سامنے لے جا کر روک دی۔ چرچ کے دیوینکل چوٹی دروازے پر حضرت موسیٰ کی ایک شبیہ بنی ہوئی تھی اور دروازے کے دونوں اطراف بڑی بڑی سے شعلیں جل رہی تھیں۔ سارہ گاڑی سے اتر گئی۔۔۔۔۔ میں بھی نیچے اتر آیا۔ سارہ نے میری جانب دیکھا۔

”یہ میری پسندیدہ عبادت گاہ ہے۔۔۔۔۔ میں صرف خاص موقعوں پر یہاں آتی ہوں۔ آج یوں آجی رات کو یہاں آنے کا مقصد بھی بہت خاص ہے۔۔۔۔۔ میں تمہاری محبت کے لیے دُعا کرنے آئی ہوں، وہ بہستی جو آج تمہارے لفظوں میں تمہاری پادوں میں اور تمہارے احساس میں زندہ ہے، میں اس کے لیے یہاں دُعا کرنے آئی ہوں۔“

میں گنگ سا دھپن کھڑا رہ گیا۔ سارہ نے قدم بڑھائے، پھر وہ پلٹ کر بولی۔

”تم اگر چاہو تو میں کچھ دیر میرا انتظار کر سکتے ہو، میں جلدی آ جاؤں گی۔“

سارہ میرے ڈکے قدم دیکھ کر یہ کبھی تھی کہ شاید میں یہودیوں کے چرچ کے اندر آنے سے ہچکچا رہا ہوں۔ سارہ آگے بڑھ گئی۔ میں اس کے پیچھے برف پر بننے اس کے قدموں کے نشانات پر چلتا ہوا اس چرچ کے اندر داخل ہو گیا۔ چرچ کے اندر اونچی اونچی دیواروں کے اندر بننے ہوئے خاتون میں بکلی ہلکی ہلکی روشنیاں جل رہی تھیں۔ چرچ میں مدہم سی ایک خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے ڈاس پر جہاں پادری کھڑا ہوتا ہے، وہاں گلی کے چوہارے پر بہت سی موسم تہیاں رکھی جل رہی تھیں۔ سارہ گلی کے چوٹی فرش پر پلٹی ہوئی ایک خاص جگہ پر آ کر رک گئی۔ اور زبردست نوریت کی کچھ آیتیں پڑھنے لگی۔ میں چپ چاپ دونوں اطراف پر لگی ہوئی لمبی لمبی تہیوں میں سے ایک پر کونے میں بیٹھ گیا۔ چرچ میں عجیب سا سکوت طاری

تھا۔ اتنی خاموشی تھی کہ مہم قیڑوں کے جھلنے سے پیدا ہونے والی آواز کی سرسراہٹ بھی گونج رہی تھی۔ سارہ ایک ہنرے کے عالم میں کھڑی اپنے ذہنیاتی کلمات پر چڑھ رہی تھی۔ ایک انتہائی لڑکی ایمان کے لیے ہزاروں میل دور اس تنہا رات میں جھکی پٹکیں لیے ڈعا کر رہی تھی۔

میں کچھ دیر بیٹھی سارہ کو سینے پر ہاتھ رکھے دعا کرتا دیکھتا رہا۔ پھر کیا کیا جانے کیوں مجھے ایمان کی بے حد مکی محسوس ہوئی۔ اس احساس نے میرے دل کو جیسے ایک شجر سے چرنا شروع کر دیا کہ اب میں اس زندگی میں کبھی اس سے نہیں مل پاؤں گا۔ اور جانتے کس وقت میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو پکنا شروع ہو گئے اور مجھے احساس بھی نہیں ہوا، سارہ دعا ختم کر کے میری طرف بلی اور اس کی نظر میری برقی آنکھوں پر پڑ گئی۔

”ہے حماد۔۔۔ کیا۔۔۔؟“

دو تقریباً دوڑتی ہوئی میری طرف بڑھی اور میرے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر اس نے اپنی نازک انگلیوں سے میرے آنسو پونچھ دیے۔ اور شاید یہی لحاظ آنسوؤں کے سیلاب کے بند کھولنے کے لیے ضروری تھا۔ پھر میرا خود ہر اختیار ہی نہیں رہا اور جانے کتنی دیر تک یہ ٹھیکس پانی اس کی نازک پتیلیوں کو بھگوتا رہا۔ مجھے تسلیاں دیتے دیتے وہ خود بھی غلط حال ہی ہو گئی۔ پھر جیسے اس نے قیصلہ کر لیا کہ آج وہ ان تمام آنسوؤں کو بہہ جانے دے گی۔ اس نے میرا سراپے شانے سے اگایا اور میری پٹکیوں سے گرتی شیم اپنی آنکھوں میں سمیٹ لی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ اگر میں حساب سمجھوں تو اپنے دل کا قہار اس کے سامنے بیان کروں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ میرے درد کو اپنا ہی درد سمجھتی ہے اور درد کا درماں دونا جتنا جتنی ہے۔ میں نے شروع سے لے کر آخر تک تمام لسانہ سارہ کو سنا دیا۔ وہ چپ کر کے خاموشی سے میری بات سنتی رہی۔ مجھے تسلیاتی رقی۔ کئی مقام پر مجھے ایسا لگا کہ وہ خود پھوٹ کر روئے گی لیکن اس پر ہاؤر لڑکی نے اپنے حواس قاید میں رکھے۔ شاید اسے اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ اگر اس مرحلے پر اس نے ورامی بھی نہ کر دی کہ کاغذ پر کیا تو پھر مجھے نوٹے سے پھانسا یا پھانسا ہو جائے گا۔ میری بات ختم ہوتے کے بعد وہ بہت دیر تک خود پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ میں جانتا تھا کہ اس کو دل اور پھول کی ہچکچڑی سی نازک لڑکی کے دل پر اس وقت کیا گز رہی ہوگی۔ لیکن اس نے مجھ پر اپنے اندر کے طوفان کا ہر ٹھٹھہ ہونے دیا۔ کبھی کبھی آنکھوں سے زیادہ دو انسانوں کے دل کے خاموشی مضبوط اور زوردار شرم بہم ثابت ہوتی ہے اس وقت وہی خاموشی ہم دونوں کے درمیان ہاتھوں کا کام دے رہی تھی۔ وہ چپ چاپ میرا ہاتھ تھا جسے ٹھنکی رہی اور اپنے لفظ اپنا شرم، اپنے نرم لمس کے ذریعے میرے ہاتھوں میں اور میری روح میں منتقل کرتی رہی۔ چرچ کے بوے بوے روشن دھواں اور کھڑکیوں سے صبح کی سفیدی جھلکنے کی تھی اور جب ہم چرچ سے باہر نکلے سحر کے سپیدے اور برف کی چادر کی سفیدی نے ہماری آنکھیں چند سیاسی دیں۔ برف پر ابھی تک میرے اور سارہ کے اندر ہاتھ قدموں کے نشان واضح تھے۔ رات کے اندھیرے میں نہ جانے کیا ماہود ہوتا ہے۔ شاید اسی سحر کے زور میں، میں نے رات کو سارہ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ سب کچھ بتا دیا تھا لیکن اب صبح ہوتے ہی میں اپنی رات کی حالت پر اس کے سامنے شرمندہ سا تھا۔ کچھ جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن سارہ نے جیسے اس میں میرا ہر مجرم قائم رکھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اس نے میری طرف دافستہ دیکھنے سے گریز کیا۔ ٹپ ٹپ سے گاڑی ڈرائیو کرتی رہی۔ پہلے اس نے مجھے میرے اپارٹمنٹ پر ڈراپ کیا۔ لیکن ابھی تک بے خبر سو رہا تھا، میں گاڑی سے اترا تو میرے قریب سے گزرتے دو دو کی ٹولیں پہچانے والے کی سانکیں تھکی جھاتی گزری۔ اس نے اپنی ہانپ کیپ اٹھا کر چلتے چلتے مجھے انگریزی سلام کیا۔ اور مسکرا کر سارہ

کی طرف دیکھا۔ سارہ اس کی نظروں کا مطلب سمجھ کر جھینپ سی گئی۔

”میں نے سارہ کی طرف دیکھا وہ ابھی تک اسٹیزنگ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ میں نے سارہ والی کھڑکی میں جھک کر اُسے کہا۔

”میں شکر پہ جیسے چھوٹے لفظ ادا کر کے تمہارے اہمول احساسات کی توجہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس رات کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“

سارہ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”شکر یہ ادا کرنے کی کوئی بات ہے بھی نہیں۔۔۔۔۔ یقین جانو۔۔۔۔۔ میں نے ہمیشہ ہی تمہیں دوسروں سے بہت مختلف سمجھا ہے۔۔۔۔۔

اور گزری ہوئی رات کے بعد تمہاری عزت میرے دل میں اپنی آخری حد تک بڑھ گئی ہے۔۔۔۔۔ یاد رکھو۔۔۔۔۔ جب بھی تمہیں میری ضرورت

ہوگی۔۔۔۔۔ تم ہمیشہ آواز دینے سے پہلے جھپٹنے مارنے پاؤ گے۔“

”میں جانتا ہوں ایسا ہی ہوگا۔ اور یہ احساس میرے لیے ہمیشہ بہت قیمتی رہے گا۔“ مجھے سارہ نے شام کو لاہور ہری سے واپس پر آتے

ہوئے تھیں کے لیے لیا تھا۔ میرا ٹیک جس میں میرے نوٹس تھے اب بھی اس کی گاڑی کی بجھلی سیٹ پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے نکل شام ہی اپنا فرم بھیج کر

کر لیا تھا۔ میں نے ٹیک سے اپنے فرم بھیج کے تمام نوٹس نکالے جس پر میری دو مہینے کی محنت میری تحقیق لفظوں کی صورت میں بکھری ہوئی تھی۔ میں

نے فرم بھیج کی پوری فائل سارہ کے حوالے کر رہے ہوئے تھا۔

یہ میرا فرم بھیج رہے۔ اس میں میری تمام تحقیق موجود ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم اسے اپنے پاس رکھو۔ اور اگر کسی وجہ سے میں اسے

یونیورسٹی میں جمع نہ کروا سکوں تو میری جگہ تم اسے لائبریری رکھنا اور اس کا حصہ بنوانے کے لیے تیج کر دینا۔“

سارہ نے حیرت سے فائل کے صفحے پلٹے۔

”تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔ مجھے اسے اپنے پاس رکھنے میں کوئی ہنگامہ نہیں ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں اسے خود چل کر جمع

کر دلائیں گے۔ بلکہ میں پاپا کو اس بات کے لیے بھی مجبور کروں گی کہ وہ تمہیں تمہارا فرم بھیج پوری یونیورسٹی کے سامنے فائل تقریب میں خود پڑھنے

دیں۔ تمہیں اپنا نظریہ سب کے سامنے پیش کرنے کا پورا حق ہے۔“

میں نے اس موقع پر اسے پتھر والی بات بتا کر پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے اچھوڑ دیا کہ جھکے سے اس کے دل کی بات سمجھ رہا ہوں۔

وہ مسکرائی۔ میں نے اسی انداز میں ہاتھ ہلایا اور سارہ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں اپنی سٹڈنٹسنگ کے آخری کوڑے تک اس کی گاڑی کو کھڑے ہوئے

دیکھنے کے لیے کھڑا رہا۔ پاپا کو کامران جاگ چکا تھا اور اپنے کارڈ پار پر جانے کی تیاری میں تھا۔ اس نے کافی کالج میرے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

”آ“ کیا میرا شہزادہ ساری رات آوارہ گردی کرنے کے بعد۔ میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا کہ اس یونیورسٹی سے فوراً ہی رہنا۔ لیکن

گنا ہے میرے حضور سے کالٹا اڑ ہو رہا ہے۔ پہلے تو صرف دن ہی اس کی دلتوں تلے بسر ہوتا تھا۔ اب راتیں بھی انہی کے ساتھ مشغولیت کرتے

ہوئے گزرتی ہیں۔ پارمیڈی۔۔۔۔۔ تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ اس کا باپ بڑا کایاں آدمی ہے۔ جانے اب تک تمہیں یونیورسٹی میں کس دل سے

برداشت کر رہا ہے؟“

شاید کامران نے کمزگی سے مجھے سارہ کی کار سے اترتے ہوئے دیکھ لیا تھا میں نے اسے کل یونیورسٹی میں جوزف کی طرف سے دی ہوئی پیٹرولنگ شکایت کی قبرستانی۔ کامران نے ذرا لب ان یہودیوں کی شان میں کچھ کہا اور پھر مجھ پر بھی بکڑتے ہوئے کہنے لگا۔

”اسی لیے میں نے کہا تھا کہ ان لوگوں سے بچنا نہ لینا۔ تم یہاں کے قانون سے خود انگی طرح واقف ہو۔ اس لائبریرین پیٹرکی شکایت پر جیسس انگلینڈ سے ڈی۔ پورٹ بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہاں کی ہر بڑی اعظمی میں انہی یہودیوں کا بچہ لگا ہوا ہے۔ قانون بھی انہی کا ساتھ دے گا۔ اور پھر 9/11 ہان ایون کے بعد تو ہر مسلمان پہلے ہی ان کی نظر میں ایک دہشت گرد ہے۔ صرف کسی شکایت کی ضرورت ہے۔ انہیں لہل چسپاں کرنے میں ذرا دیر نہیں لگتی۔ جانے کتنے لوگوں کو تو یہ صرف جیسے میں ہی ملک بدر کر چکے ہیں۔ مجھے کچھ نہیں آتا اس نرم بیچہ کی آغوشی کیا اہمیت ہے۔ یہودی کہتے ہیں کہ ”ہالوکاسٹ“ کا واقعہ ہوا تھا تو کہنے دو۔ ہماری بلا سے جیسس کون سے میڈل مل جائیں گے اس حقیقت سے انکار کرنے پر۔ اور پھر سننے والے تو خود وہ ہیں جنہوں نے یہ طرہ نظر گھڑا ہوا ہے۔ کون تمہارے نرم بیچہ پر اور تمہاری تحقیق پر یقین کرے گا؟“

میں نے کامران کی طرف دیکھا۔

”کوئی اور یقین کرے نہ کرے۔۔۔۔۔ مجھے خود یقین ہے اپنی بات پر۔ اپنے بچ پر اور پھر وہ سب بھی جانتے ہیں کہ سچ کیا ہے۔ بس کسی نے ہمت نہیں کی آج تک ان کے سامنے سچ بولنے کی۔ لیکن میں یہ سچ ان کے سامنے لا کر دوں گا پوری یونیورسٹی میں اگر ایک بھی طالب علم نے میری بات کا یقین کر لیا تو میں سمجھوں گا کہ میرا مقصد پورا ہو گیا۔ اور میری محنت رنگ لے آئی۔ چاہے اس کے بعد وہ لوگ میرا نرم بیچہ جلادیں اور مجھے اس ملک سے ہمیشہ کے لیے ملک بدر کر دیں۔“

کامران مجھ پر جھجھکا سا گیا۔

”لیکن اس جدوجہد کا فائدہ۔۔۔۔۔ یہ سب تم کس کے لیے کر رہے ہو۔ اس تحقیق کا اور تمہارے اس بچ کا کوئی مقصد بھی تو ہونا چاہیے۔“

مجھے کامران کی بات پر غصہ آ گیا۔

”تو کیا جو کچھ میں نے ابھی جیسس بتایا، جیسس اس میں کوئی مقصد نہ نظر نہیں آتی؟ اور اگر اس بچ کا جیسس کوئی فائدہ نظر نہیں آتا کہ یہ نئی نسل ان یہودیوں کے اس جھوٹ کو جان لے تو پھر میرا ایک اور مقصد بھی سن لو۔ جو اس مقصد سے کہیں بڑا ہے۔“ ہالوکاسٹ“ کا یہ تمام پروپیگنڈا یہودیوں نے صرف اور صرف فلسطین کی سر زمین پر اپنی ایک آزاد ریاست بنانے کا خواب پورا کرنے کے لیے کیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی اس ڈرامے کو سچ کرنے کی پوری تیاری کر لی گئی تھی۔ اس وقت چندہ جمع کرنے کی عظیم الشان مہم شروع کر دی گئی تھی۔ امریکہ، برطانیہ اور دوس نے جرمن قوم کو ہر بار کرنے کے لیے یہودیوں کو غداری پر آمادہ کر لیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مذہم تحور وہ جرمن قوم پلیٹ کران پر واضر در کرے گی۔ وہ جرمنوں کو غلطی قیادت میں نکالنا ہوتے ہوئے دیکھ چکے تھے اور نظر کے عزم بھی اس کی جنگی تیاریوں سے بالکل واضح تھے۔ اسی لیے انہوں نے یہودیوں کو قبلہ اول پر قبضے کا خواب دکھایا اور اس خواب کو پورا کرنے کے لیے ان کی پوری مدد کرنے کا یقین بھی دلا دیا۔ ”ہالوکاسٹ“ کا الزام تو ظہور و جرموں پر دوسری جنگ عظیم کے بعد لگایا گیا تھا۔ لیکن اس کی قیمت فلسطین کے مسلمانوں نے یہودی، مسیحیوں اور پھر اسرائیل کی صورت میں چکانی۔ اگر نظر ”ہالوکاسٹ“ کا ذمہ دار تھا بھی تو یہودی اس یہاں نے فلسطین کے مسلمانوں پر کیوں ٹوٹ پڑے۔۔۔۔۔؟ اور سچ یہی ہے کہ ”ہالوکاسٹ“ میں بچاس





آج کوئی بات ہم دونوں ہی کے دلوں کو نہو گئی ہے۔ شاید زندگی ایسے ہی موڑ بدلتی ہے۔ شاید دلوں کے انقلاب اسی طرح رونما ہوتے ہیں۔ شاید ہم کبھی کے دلوں پر لگا یہ ذنگ کسی آب زم زم کی تلاش میں جہار پتا ہے۔ شاید ہم سب کے دل ہی بہت زمانے سے قلمی چاہتے ہیں۔ کبھی سب کچھ سوچتے سوچتے جانے کس وقت میری آکھ لگ گئی۔ کبھی کبھی غیب بھی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ دل کے ہرزنگ پر وقتی طور کے لیے پردہ والہ دیتی ہے۔ انسان کو خود سے بھی نظر پھرانے کا ایک موقع فراہم کر دیتی ہے۔

☆☆☆

## قلمکار کلب پاکستان

- ۱۔ اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ مختلف موضوعات پر لکھ سکتے ہیں؟
- ☆۔ آپ اپنی تحریروں میں روانہ کریں 'ہم ان کی نوک پلک سنوا دیں گے۔
- ۲۔ آپ شاعری کرتے ہیں یا مضمون لکھنا چاہتے ہیں؟
- ☆۔ ہم انہیں مختلف رسائل و جرائد میں شائع کرنے کا اہتمام کریں گے۔
- ۳۔ آپ اپنی تحریروں کو کتابی شکل میں شائع کرانے کے خواہشمند ہیں؟
- ☆۔ ہم آپ کی تحریروں کو دیدہ زیب و دلکش انداز میں کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔
- ۴۔ آپ اپنی کتابوں کی مناسب تصویر کشی کے خواہشمند ہیں؟
- ☆۔ ہم آپ کی کتابوں کی تصویر مختلف جرائد و رسائل میں تبصروں اور تذکروں میں شائع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔
- ۵۔ اگر آپ اپنی تحریروں کے لیے مختلف اخبارات و رسائل تک رسائی چاہتے ہیں؟
- تو۔ ہم آپ کی صلاحیتوں کو مزید نکھارنے کے مواقع دینا چاہتے ہیں۔
- مزید معلومات کے لیے رابطہ کریں۔

ڈاکٹر صابر علی ہاشمی

قلمکار کلب پاکستان

0333 222 1680

qalamkar\_club@yahoo.com

## پہلی بازی

دوسرے دن صبح جب ٹیس یونیورسٹی کے گیٹ سے اندر داخل ہوا تبھی مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ آج لخصاً کچھ بدلی بدلی سی ہے۔ سب سے پہلے مجھے جیم (Jim) نظر آیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے میری طرف بڑھا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تمام کر بولا۔

”ہے میڈی۔۔۔ تم گھر مت کرنا سن مارن۔۔۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ پوری یونیورسٹی کو جاکر رکھ دیں گے۔“

کچھ دیر میں ہی کلاس کے باقی طلباء بھی میرے گرد، بھیڑ کی صورت میں جمع ہو گئے، سب ہی اپنی اپنی بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔ کبھی میرے ساتھ ہونے کا اور ساتھ دینے کا وعدہ کر رہے تھے۔ میں کچھ سمجھا اور کچھ سمجھ نہیں پایا۔ اتنی دیر میں میرا نام انٹیکر پر لپکا جا جانے لگا۔ ڈین آئزاک کے کمرے میں میری ٹیلی کی جاری تھی۔ میں آئزاک کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اور پھر کمرے میں بٹھتے ہی سب سے پہلے میری نظر مشنل اسکواڈ کی لائبریری کے انچارج پیئر پر پڑی۔ جس کے ہونٹوں پر مجھے دیکھتے ہی ایک طرزی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ کمرے میں اس کے علاوہ اس وقت صرف سرائزاک ہی موجود تھے۔

”آؤ تمام۔۔۔ مجھے اُمید ہے تم نے آج یونیورسٹی آنے کے بعد نوٹس بورڈ پر لگا اپنے خلاف نوٹس سب سے پہلے پڑھا ہوگا۔“

اور۔ تو یہ بھیڑ جو باہر میرے گرد جمع تھی وہ اس نوٹس کی وجہ سے تھی۔

”نہیں مر۔۔۔ میں ابھی پہنچا ہی ہوں۔۔۔ آپ ہی مجھے کچھ بتائیے اس نوٹس کے بارے میں۔“

”اس سے پہلے میں تم سے ایک ذاتی سوال پوچھنا چاہوں گا۔ اگر تم کسی تعلیمی ادارے کے انتظامی سربراہ ہوتے اور تمہارے علم میں یہ بات آتی کہ تمہارے زیر انتظام تعلیمی ادارے میں کچھ طالب علم مذہبی سیاست کو نافذ دینے کا باعث بن رہے ہیں، جس کی وجہ سے شہر میں بھی بے چینی پھیل رہی ہے۔ تو تم ایسی صورت میں کیا کرتے۔“

”میں پوری چھان بین کرتا اور میرے اور حق پر فیصلہ کرتا۔ آپ سے بھی مجھے انصاف ہی کی توقع ہے کیونکہ آپ کو بحیثیت سربراہ پوری تحقیق کا فرض بھی سونپا گیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپ ایک فرض شناس استاد بھی ہیں۔ آپ کا فرض انصاف ہے۔“ سرائزاک نے غور سے میری طرف دیکھا جیسے میرے چہرے پر غلط فہمی کی کوئی جھلک ڈھونڈ رہا ہو۔ چار برس جھلک کر بولا۔

”کیا تم سٹریٹیز سے پہلے بھی مل چکے ہو۔“

”نہی ہاں۔۔۔ کچھ مشنل اسکواڈ کی لائبریری جانتا ہوں۔ وہاں ان سے کئی بار ملاقات ہوئی ہے۔“

”کیا تم 13 جنوری کی شام بھی مشنل اسکواڈ لائبریری گئے تھے؟“

"جی ہاں۔۔۔ مجھے دو مقالے چاہیے تھے جن سے میرے رزم بکھر کی تحلیل میں مجھے کافی مدد مل سکتی تھی میں وہی لینے کیا تھا۔"

"مسٹر بیڑے تمہارے خلاف تحریری شکایت جمع کروائی ہے کہ 13 جنوری کی شام تم نے انہیں کچھ خاص کتابیں جاری نہ کرنے پر مذہبی طور پر ہراساں کیا تھا اور انہیں تاج بنگلے دھکیلا بھی دیں جس کی وجہ سے اپنی زندگی خطرے میں سمجھتے ہیں۔ انہوں نے ازراہ کرم ابھی تک لندن پولیس اور انتظامیہ کو اس واقعے سے آگاہ نہیں کیا کیونکہ یہ یونیورسٹی کی بدنامی نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے یہ پہلے میرے پاس آئے ہیں تاکہ انہیں انصاف فراہم کیا جائے۔ تمہارا اس بارے میں کیا کہنا ہے۔"

"یہ سب جھوٹ ہے۔ میں نے انہیں کبھی ہراساں نہیں کیا نہ ہی کبھی دھمکانے کی کوشش کی ہے۔"

"تمہارے پاس اپنا بے گناہی کا کوئی ثبوت ہے۔"

"بے گناہی کو کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ثبوت انہیں لگانے والے کو دینا پڑتے ہیں سر۔۔۔۔۔"

سر آؤنگ نے میری بات سن کر اپنی ٹیک کے باریک شیشوں کے پیچھے سے مجھے غور سے جھانکا۔ جیسے وہ میرے اٹھکاکا بازو دیکھنا چاہتے ہوں۔  
 "ٹھیک ہے تمہاری بات میں وزن ہے۔ لیکن آخر مسٹر بیڑے کی تم سے کوئی ذاتی دشمنی تو ہے نہیں۔ آخر وہ بلا وجہ ایسا الزام کیوں لگائیں گے تم پر۔۔۔۔۔؟"

"جی تو میں بھی جانتا چاہتا ہوں۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ اپنے الزام کو ثابت کرنے کے لیے ثبوت بھی پیش کریں۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ تم اپنا تحریری جواب بھی جمع کروادو۔۔۔۔۔ اور یاد رکھو کہ یہ معاملہ پولیس تک جانا نہیں چاہیے۔ یونیورسٹی انتظامیہ اس سے پہلے ہی معاملہ صاف کرنا چاہتی ہے۔ یونیورسٹی کے قانون کے مطابق کسی بھی طالب علم کے کسی پولیس کیمس میں ملوث ہونے کی صورت میں اسے ہمیشہ کے لیے یونیورسٹی سے خارج کر دیا جاتا ہے۔"

"جی۔۔۔۔۔ نہیں جانتا ہوں۔۔۔۔۔ لیکن اسی قانون کی ایک شق یہ بھی ہے کہ پہلے طالب علم پر کیس ثابت ہونا بھی ضروری ہے۔ میں اپنا جواب جمع کروادوں گا۔ شکریہ۔"

میں کمرے سے باہر نکل آیا اور صوب سے پہلی نظر میری سارہ پر پڑی۔ وہ تیزی سے ڈین کی کمرے کی طرف ہی آ رہی تھی۔ شاید وہ ابھی یونیورسٹی آئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے میری طرف بڑھی۔

"صدا۔۔۔۔۔ یہ سب نہیں کیا سن رہی ہوں۔۔۔۔۔ یہ کون سا نیا ڈرامہ چلایا ہے یونیورسٹی والوں نے۔"

"میں نے اُسے مختصر اینٹری کی شکایت اور لائبریری کے واقعے کے بارے میں بتا دیا۔۔۔۔۔ وہ حیرت سے میری ساری بات سنی رہی۔ پھر چونک کر اس نے مجھ سے جلدی سے پوچھا۔ "تم نے لائبریری کا کیا نام بتایا۔"

"ہیلر۔۔۔۔۔"

"ہاں۔۔۔۔۔ ہیلر۔۔۔۔۔ ہیلر گورنمنٹ تھا اس یہ تو پایا کا بہت پُرانا واقعہ ہے۔۔۔۔۔ کئی سالوں سے تو وہاں پر اس کا ہمارے گھر آنا جاتا ہے۔"

میرے ذہن میں ایک ساتھ ہی کئی جھماکے ہوئے۔ اس کا مطلب ہے کہ سراسر آنکھ ابھی تک دم والے معاملے میں میرے ہاتھوں ہونے والی ہزیمت کو بھولے نہیں تھے۔ یہ سارا منصوبہ انجمن کا بنایا ہوا تھا۔ انہوں نے ایک حیرت سے دو شکار کیے تھے۔ میری شخصیت کو بھی انتظامیہ کے لیے متنازعہ بنادیا تھا اور میرے یونیورسٹی سے نکالے جانے کی صورت میں میرا ٹرم بھیچو پہلے دن سے ان کے دل میں ٹھک رہا تھا۔ اس سے بھی ان کی جان ہمیشہ کے لیے ٹھوٹ جاتی، سارہ بھی ساری صورت حال سمجھ چکی تھی۔ وہ دانت بندھتی ہوئی سراسر آنکھ کے کمرے کی طرف بڑھی، لیکن منہ نے اس کا ہاتھ قلم لیا۔

”نہیں۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ ایک بار پھر میری وجہ سے ایک بچی، ایک باپ کے سامنے کھڑی ہو جائے۔ اس سے ان کی انا کو مزید چوٹ لگے گی۔“

سارہ نے حیرت اور غصے سے میری طرف دیکھا۔

”تم ابھی انجمن کی اتنا اور انجمن کے رشتوں کے بارے میں سوچ رہے ہو، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ شخصیں اس یونیورسٹی سے اور شاید اس شہر سے بھی بدر کرنے کی تاک میں ہیں۔“

”نہیں جانتا ہوں۔۔۔ اس بار ان کا وار۔۔۔ بڑا گھائل کر دینے والا ہے۔ لیکن میں شدید ڈھی ہو کر بھی دشمن پر غلہ دار گرنا پسند نہیں کرتا۔ وہ عقل اور تدبیر کی جنگ قانونی طریقے سے لڑ رہے ہیں۔ میں بھی ان سے ان کے ہی انداز میں لڑوں گا۔“

سارہ نے میرا ہاتھ مضبوطی سے قلم لیا۔

”صرف تم نہیں۔۔۔ ہم۔۔۔ ہم دونوں مل کر یہ جنگ لڑیں گے۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”راستہ بہت طویل، کھن اور کاٹوں بھرا ہے۔“

”میں پاؤں کے چھالے گتے سے نہیں ڈرتی، ویسے بھی تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ تقی پر نظر رکھنے والے سو داگر ہوتے ہیں اور میں نے سو داگر نہیں دیکھا۔“

اس وقت اس کے لہجے میں اور آنکھوں میں ایک ایسا عزم تھا کہ جس کے آگے پہاڑ بھی ٹکھ کر ریڑھ پر بڑھ ہو جاتے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے سلیٹے سے سنورے بال نکھیر دیے۔ وہ مسکرا دی۔ اسی لمحے سراسر آنکھ پیڑ کو الوداع کہنے کے لیے رو دڑے میں آئے اور انہوں نے سارہ کے ٹکڑے ہال اور اس کا میری طرف وپکڑ کر سسکا ناؤ دیکھا۔ اک لمحے کو ان کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا لیکن انہوں نے اپنے جذبات پر قابو پانا خوب سیکر رکھا تھا۔ انہوں نے پیڑ کو الوداع کیا اور دروازہ بند کر دیا۔ پیڑ سارہ سے نظر پڑا ناؤ اور دوسری جانب سے اٹھ گیا۔

اگر بابا کو یہ چٹا کہ میرے نرم ہنسنے پر رے لندن کے بیوروہوں کو کس مشکل میں ڈال دیا ہے تو جانے وہ کیا سوچتے۔ ہمارے گھر میں ہر سب کو کبھی اتنی اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ ہمارے گھر میں پانچ وقت کی نماز تو دور کی بات ہے جمہ اور عید پر بھی برائے نام اور دکھاوے کے لیے عید گاہ جانے کا رواج تھا۔ قرآن کو ہمارے ہاں صرف اونچے خاق پر سجا کر رکھنے کی ایک کتاب سمجھا جاتا تھا۔ آخری مرتبہ شاید اسے میری بڑی بہن کی رخصتی

کے وقت اس کے سر پر رکھنے کے لیے اس طاق سے اسے اُٹا کر لیا تھا۔

مجھے اپنے لڑکپن کی ایک بات ہمیشہ یاد ہے گی۔ جب میں چند سو سال کا تھا، ٹھیک آج سے قریب اُس سال پہلے جب میری کلاس کی ایک ہندو لڑکی کا منی پر میرا دل آ گیا تھا۔ ایک دن وہ ہمارے گھر آ گئی تھی، شاید میری سالگرہ کا دن تھا۔ اس وقت ہمارے گھر روز پڑھانے کے لیے آنے والے مولانا صاحب آئے ہوئے تھے جنہوں نے عصر کے وقت ہمیں زبردستی وضو کروا کر اپنے ساتھ نماز کے لیے کھڑا کر رکھا تھا۔ جیسے ہی میری نظر کانٹھی پر پڑی، میں نے جلدی سے نماز توڑ دی تھی تاکہ کانٹھی کو یہ نہ پتہ چلے کہ میں نماز بھی پڑھتا ہوں۔ صرف کانٹھی پر ہی کیا تھم رہا تھا اب تک بھی اپنی کسی لڑکی دوست کے سامنے نماز پڑھنے سے کتراتا تھا۔ پتہ نہیں میرے دل میں ایک عجیب سی جھجک تھی کہ مجھے اپنی گرل فرینڈ کے سامنے نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ اس سے میرا اثر ان کی نظر میں شراب ہو جائے گا۔

اس دن جب میں نے بابا کو کانٹھی کے آنے اور میرا اپنی نماز توڑ کر بھاگ کر بڑے کمرے میں ٹھپ جانے کا واقعہ سنایا تو وہ بہت دیر تک بیٹھ رہے تھے۔

اس دن جب جیلر یونیورسٹی آیا تھا، مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ طلباء کی بہت بڑی تعداد اب خود میرا فرم بھی ملتا چاہتی تھی، پڑھنا چاہتی تھی۔ کیونکہ انتظامیہ کے پورے اقدامات نے جو وہ میرے خلاف کر دی تھی۔ ان سب میں تجسس کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔ وہ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ آخر ایک معمولی اور عام طور پر یونیورسٹی کی لائبریری کے حلقوں میں مٹی اور گرد کے نظر ہو جانے والے اس نرم بچہ میں انہیں آخر کیا بات لگنے اور کہنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے آئے دن مجھے گھرنے کے لیے نئے انتظامات کیے جا رہے تھے۔ اور یہی سراسر آنکڑ کی بنیادی غلطی تھی۔ انہوں نے طلباء کے اس تجسس کو نواہ دی تھی۔ حالانکہ میرا خیال تھا کہ اگر مجھے روزمرہ کے معمول کی طرح خود اپنا فرم بچہ پڑھنے اور پیش کرنے کی اجازت دی جاتی تو شاید وہ متنازعہ تو ضرور ثابت ہوتا لیکن اس کا وہ اثر نہ ہوتا جو اب ان پڑھنے اور پیش کیے ہی دھیرے دھیرے طلباء کے ذہن پر ہو رہا تھا۔

اسی شام جب میں نے منبر کے کنارے اپنے پسندیدہ پینٹ پر بیٹھا سامنے منبر میں تیرتے پرنسپل کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ربیکا شاید مجھے ڈھونڈتے ہوئے ہی وہاں آنکلی، دُور سے اس کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ میری طرف چلی آئی۔ کالے اسکرٹ پر اس نے سفید پھولوں والی بہت خوبصورت سی قمیض پہنا رکھی تھی اور اس لباس میں وہ خود بھی کوئی پھول ہی لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سو جھی سو جھی سی تھیں۔ جیسے بہت دیر تک روٹی رہی ہو۔ بہت دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر وہ دھیرے سے بولی۔

”کیا میں تم سے معافی مانگنے کا حق اب بھی رکھتی ہوں؟“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”دوست جرتی رکھتے ہیں، سوائے معافی مانگنے کے حق کے۔ یہ حق انہیں کبھی نہیں دیا جاسکتا کیونکہ دوستی میں اس کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ دوست کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتا تو پھر معافی کیسی؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ غلطی تو میری بہت بڑی تھی۔۔۔۔۔ لیکن میں جانتی تھی کہ میڈی کا طرف کتنا بڑا ہے اور وہ آگے سے مجھے میری معذرت کا

کیا جواب دے گا۔"

"جائے دو ان باتوں کو۔۔۔۔۔ اسنے دونوں کے بعد بات کی ہے تو کچھ اور کہو۔"

"نہیں۔۔۔۔۔ مجھے کہہ لینے دو۔۔۔۔۔ ورنہ یہ کائنات میری روح میں ہمیشہ گھنسا ہی رہے گا۔ اس دن جب تم نے مجھے یہ کہا تھا کہ کوئی پہلے سے تمہارے دل و جان پر قابض ہے تو مجھے شدید دکھ، شدید ملن کا احساس ہوا تھا۔ نہیں یہ سمجھتی تھی کہ تمہارے جذبات سارے کے لیے ہیں۔ اور تمہیں سارے سے بھی شدید ناراض ہو گئی تھی۔ لیکن کل سارہ نے جب زبردستی مجھیں اسی نہر کے کنارے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے قریب بٹھالیا اور اس نے مجھے ایمان کے بارے میں بتایا تو یقیناً کروٹیں شرم اور ندامت سے غور سے بھی نظر نہیں ملا پاری تھی۔ میری محبت تو بہت سلی گئی مہدی۔۔۔۔۔ اصل میں تو محبت تم نے کی ہے۔۔۔۔۔ ہم سب کو ایسی محبت کے پہلے پہر کے بھی حق دار نہیں ہو سکتے۔ مجھ جیسے کم حوصلہ اور کم ظرف محبت کی شام تک بھلا کیسے پہنچ پائیں گے۔"

دوسرے دن صبح دھیرے دھیرے بولتی رہی۔ دل کا غبار اپنے آنسوؤں سے دھوئی رہی۔ نہیں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے قلم لایا۔

"ایسا نہیں ہے رہی۔ تم تو ایک لمحے میں ہی محبت کے تیزوں پہر بھلا گ کر محبت کی شام میں پہنچ گئی ہو۔ ورنہ آج اس وقت یوں اس طرح میرے پاس بیٹھ کر یہ سارے اعتراف نہیں کر رہی ہوتیں۔ اصل میں تو تم ہی محبت کی اس شام کی حق دار ہو۔ شہنشاہی اور مصلحتی محبت کی شام۔۔۔۔۔ جو اس وقت تمہارے آس پاس ہی کہیں منڈلا رہی ہے۔"

ریکا رو پڑی۔

"نہیں تمہارے۔۔۔۔۔ ایسا نہیں ہے۔۔۔۔۔ اگر ایسا ہوتا تو میرا دل درد سے یوں کھٹ نہ رہا ہوتا، مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔ دل اب بھی یوں نہ تڑپ رہا ہوتا۔ نہیں تمہارے سامنے بیٹھی یوں کم ظرفوں کی طرح آنسو نہ بہا رہی ہوتی۔ میں تو اتنی ناشکری ہوں کہ نہیں تمہاری قبول دہی کی قدر بھی نہیں کی۔ تمہاری محبت پانے کی خواہش میں اس دہی کو بھی رو کر دیتی رہی تم مجھے اس بات کے لیے کبھی معاف مت کرنا۔۔۔۔۔ کبھی مجھ پر رحم نہ کھانا۔"

وہ بولنے لگے بلکہ پڑی۔ نہیں تے اس کا سر اپنے شانے سے لگا لیا۔ اور اسے کل کر رونے دیا۔ محبت کا کائنات جب جسم میں چھو جائے تو اس کا چہرہ بدن سے صرف اور صرف آنسوؤں کی صورت میں ہی نکالا جاسکتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ اس دہریلی محبت کا ڈاکو کبھی نہیں ہی ہوتا ہوگا۔ دوسرے دن مجھے پتہ چلا کہ پیٹرن اپنے دعوے کے ثبوت کے طور پر لائبریری ہی کے دو ماحول کو بیان دینے کے لیے یونیورسٹی انتظامیہ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ وہ دونوں بھی بیرونی ہی تھے۔ یونیورسٹی نے عارضی طور پر مجھے کلاس لینے سے منع کر دیا تھا کیونکہ وہ انکوائری مکمل ہونے تک مزید کمی بڑے "ہنگامے" سے بچنا چاہتے تھے۔

یونیورسٹی میں جب یہ خبر پہنچی تو میری ساری کلاس ہا ہلکل آئی۔ طلبا نے میرے حق میں لڑنے کی جڑی شروع کر دی، انہوں نے باتوں میں بڑے بڑے کارڈ اور بیٹر اٹھا لیے جن پر "انصاف۔۔۔۔۔ انصاف۔۔۔۔۔ انصاف" لکھا ہوا تھا۔ طلبا کی قیادت ریکا اور جم کر رہے تھے۔ جم خاصا

مشغول تھا اور اس نے انتظام یہ کہ دھمکی دے دی تھی کہ اگر مجھے کلاس لینے کی فوری اجازت نہ دی گئی تو وہ تمام طلبہ کو لے کر باہر سڑک پر نکل جائے گا اور یہ ہڑتال پورے شہر کی تعلیمی درس گاہوں تک پھیلا دی جائے گی۔ یونیورسٹی کا میدان، بھر کنارے، راہداریوں اور چھتوں پر ہر جانب اسٹوڈنٹس ہی دکھائے دے رہے تھے۔ نہیں جب کلاس سے نکل کر باہر آیا تو ان سب کے نعروں میں شدت آ گئی۔ ان سب کو ایک انجینی لڑکے کے لیے اس طرح لڑتے دیکھ کر میری آنکھوں کے گوشے خود بخود ہلکے گئے۔ مجھے لگا ایمان کسی ستون کی آؤٹ سے مسکرا کر جھانک رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ ”نہیں نے کہا تھا۔۔۔۔۔ تم کبھی اکیلے نہیں ہو گے۔۔۔۔۔ نہیں ہر لمحہ محبت کی صورت میں۔۔۔۔۔ دوستی کی صورت میں تم پر برقی برہوں کی۔ میری محبت روپ بدل بدل کر تمہارے ارد گرد منڈلاتی رہے گی۔ نہیں تمہیں اتنا مستر کروں گی کہ لوگ تم پر مہر مٹھنے کے لیے ہرم تیار ہیں گے۔ میری محبت ہر لمحہ تمہارے گرد و محبت اور حفاظت کا حصار بنائے رکھے گی۔“

جم نے مجھے یوں کم صدمہ پہنکی آنکھوں کے ساتھ کھڑے دیکھا تو دو آگے بڑھا اور اس نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ ساری یونیورسٹی نعروں سے کونج اٹھی۔ نہیں رو پڑا، آنسو خود بخود دھیری آنکھوں سے بہہ نکلے۔ جم نے میرے دجو کو اور مضبوطی سے گلے لگا لیا۔ ریکا نے آگے بڑھ کر میری آنکھوں سے آنسو صاف کر دیے اور دھیرے سے میرے کان میں بولی۔

”فکرمات گرد باقی لا کے۔۔۔۔۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔“

نہیں نے سارہ کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ اتنے میں ڈین آئزاک کے کمرے سے اعلان ہونے لگا کہ نہیں جہاں کہاں بھی ہوں۔ فوراً ان کے کمرے میں آ بیٹھوں۔ ایک بار پھر شور مچ گیا۔ سب میرے ساتھ ہی ڈین کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ میرا ایک ہاتھ جم نے اور دوسرا ریکا نے تھام رکھا تھا۔ ان سب کو کمرے کے باہر چھوڑ کر نہیں اندر داخل ہوا تو میری نظر سارہ پر پڑی جو غصے میں سرخ چہرہ لیے ڈین کے کمرے سے نکل رہی تھی۔ دروازے میں ہی اس کا میرے ساتھ ٹکراؤ ہو گیا۔ اس نے چند لمبے میری جانب دیکھا۔ پھر نکلے

نکلے اس نے میرا ہاتھ اک گھڑی کے لیے تھامنا دھیری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”فکرمات کرنا۔۔۔۔۔ یہ لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔۔۔۔۔ نہیں نے تمام اسٹوڈنٹس کی طرف سے ہڑتال کی کال جمع کر دادی ہے۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ یہ تمہیں کیسے یہاں سے باہر کرتے ہیں۔“

سارہ میرا ہاتھ چھوڑ کر باہر نکل گئی۔ اندر کمرے میں سر آئزاک انتہائی غصے کے عالم میں کمرے میں ٹپل رہے تھے۔ سارہ کو مجھ سے بات کرتے دیکھ کر تو ان کا چہرہ بالکل ہی گھبرا گیا تھا۔ سامنے میز پر پڑی جانب چیدری کے دو دروازے کان بھی پیسے ہوئے تھے۔ سر آئزاک میری طرف پلٹے اور غصے میں فرمائے۔

”دیکھو مے ہو مسز جواد احمد رضا۔۔۔۔۔ تمہاری وجہ سے آج اس یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ڈسپلن کی کسی دھجیاں اُڑائی جا رہی ہیں۔ نہیں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔ یونیورسٹی کے نام پر دھجہ لگ گیا ہے۔ پہلی مرتبہ اس یونیورسٹی میں طلبہ نے میرے حکم کے خلاف جانے کی جرأت کی ہے۔ بغاوت کی ہے۔۔۔۔۔ اور اس سب کے ذمہ دار صرف اور صرف تم ہو۔“

میں نے سکون سے ان کی بات سنی۔

”آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ مجھے تو یونورسٹی آئے ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔ آپ گریٹ کارجنر دیکھ سکتے ہیں۔ جب کہ یہ تمام اسٹوڈنٹس صبح 9 بجے سے آپ کے دفتر کے باہر بکھ پوری یونورسٹی میں جمع ہو چکے تھے۔“

”تم اس قدر خطرناک ہو کہ تمہاری موجودگی یا غیر موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم یہ صلاحیت رکھتے ہو کہ اپنی غیر موجودگی میں بھی ان سب کو گمراہ کر سکو، بھڑکا سکو، تمہاری موجودگی اس یونورسٹی کی سلامتی کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔“

سراآ نرک کا ہنس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس وقت مجھے اور اس خطرے کو بیٹھ کے لیے ختم کر دیتے۔ میں نے دھیرے سے کہا۔

”آپ ایک طرف فیصلے کرنے کے عادی تھے ہیں سر۔ آپ نے ایک طرف طور پر فیصلہ کر کے مجھے کاہل لینے سے منع کر دیا لیکن میں نے اس پر بھی کوئی احتجاج نہیں کیا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ انوکھائی میں کوئی غلط پڑے۔ اس وقت بھی جیوری جو فیصلہ کرے گی۔ مجھے بول ہوگا۔“

میرا جواب سن کر سراآ نرک دانت کچکچا کر ہی تو رہ گئے۔ وہ مجھے جیوری کے سامنے اشتعال دلا کر کچھ مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن اب میں بھی اس کھیل کو پوری طرح سمجھنے لگا تھا۔

جیوری نے مجھے مطلع کیا کہ وہ غیر شرط طور پر مجھے کاہل لینے کی اجازت تو دی رہی ہے لیکن دو دن بعد ہونے والی بڑی تقریب میں میں اپنا تمام بچہ یونورسٹی کی لائبریری یا ریکارڈ میں جمع نہیں کروا پاؤں گا تاہم جیک میرے خلاف انوکھائی میرے حق میں ختم نہیں ہو جاتی۔ فیصلہ سارک جیوری کے نمبروں نے اٹھتے اٹھتے مجھ سے یہ درخواست بھی کہ میں اپنے طور پر لوگوں کو باہر جا کر کنٹرول کروں اور تمام اسٹوڈنٹس کو کاہل میں جانے پر مجبور کروں کیونکہ ان کے اس برادرسے جلتا اب یونورسٹی کی دیواروں سے باہر جانے لگی تھی جس سے یونورسٹی کی بدنامی کا خدشہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے جیوری سے وعدہ کیا کہ میں اسٹوڈنٹس سے بڑا تال ختم کرنے کی اپیل ضرور کروں گا۔ جیوری ارکان باہر نکل گئے۔ میں بھی واپس جانے کے لیے چلتا۔ سراآ نرک جواب بھی بے چینی سے کمرے میں ٹھہل رہے تھے رک گئے اور مجھے پیچھے سے آواز دی۔

”مسز حماد۔۔۔ سارہ میری اکلوتی اور بڑے مددگار لڑکی بیٹی ہے لیکن ابھی بہت نادان ہے۔ اگلے سال میں نے اور اس کی ماں نے اس کی شادی کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ لڑکا ہمارے خاندان کا ہے اور ہماری امیدوں کا چراغ ہے۔ امید ہے جب تک تم اس یونورسٹی میں رہو گے تاکہ سارہ کی شادی میں شریک ہو سکو۔ ظاہر ہے بطور اس کے بہترین دوست یہ تمہارا حق بھی ہے۔“

”آپ بے فکر ہیں سر۔۔۔ سارہ واقعی میری بہترین دوست ہے اور اگر اس کی شادی میں شریک ہونے کے لیے مجھے اپنے ملک سے بھی دیا رہا یہاں وہاں آنا پڑا تو میں اس کی شادی میں شرکت کے لیے ضرور آؤں گا۔ مجھے بس آپ کے دعوت نامے کا انتظار رہے گا۔“

میں سراآ نرک کو ٹوہ کو ٹوہ کرنا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ تو گو یہاں بھی مذہب کے ساتھ ساتھ ایک محبت کرنے والا باپ بھی میرے خلاف برسرِ پیکار تھا۔ جو یہ سمجھتا تھا کہ میں اس کی لادلی بیٹی کو اس سے بچھین کر لے جاؤں۔ کیا ساری دنیا کی بیٹیوں کے باپ ایک سا ہی سوچتے ہیں۔۔۔ وہاں مولوی علیم الدین اور یہاں سراآ نرک۔



میں نے بڑی مشکل باہر جمع لڑکے اور لڑکیوں کو دوپہر کلاس میں جانے پر آمادہ کیا۔ جم کے تو باقاعدہ ہاتھ دیر جوڑنے پر تھے جب جا کر وہ کہیں غلا۔ دیکھا اس بات پر بھی بے حد خفا تھی کہ میں نے اندر ٹرم بھیج دینا نہ کرنے کی شرط پر حامی کیوں بھری۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اصل میں یہ سارا تکمیل ہی مجھے اس بچہ کو پیش نہ کرنے کی خاطر کہنا چاہتا تھا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے دوسرے کسی طالب علم یا جم وغیرہ کو بھی حجاب کا نشانہ بنایا جائے۔ مجھے انکو امی کے خاتمے تک انتظار کرنا ہی تھا۔ سارا بھی وہیں کھڑی چپ چاپ ہماری بحث سنتی رہی۔ اس کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ جیسے اس کے اندر بہت سے سوال ہیں رہے ہوں لیکن وہ انہیں پوچھ نہیں سکتی ہو۔ جیسے اس کے اندر ایک جنگ سی جاری ہو۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے آگے ہنگی بھائی۔ وہ چونک گئی مگر میں نے اسے چھیڑا۔

”ہے مس آؤک۔۔۔ دیکھا لوگ ہم سے کس قدر خوف زدہ ہیں۔ مسلمان نام اتنا خوف ناک تو نہیں تھا کبھی۔۔۔ تمہارے پیالے تو ابھی سے مجھے تمہاری مستقبل کی شادی میں باراتی کی حیثیت سے دعوت نامہ بھی دے ڈالا ہے۔ انہیں ڈر ہے کہ کہیں نہیں تمہیں ہچکا کر نہ لے جاؤں۔“

سارا اور دیکھا دونوں ہی خنس پڑے۔ دیکھا نے غصیلی آواز بھری۔

”اب سراً توک کو کون سمجھائے کہ تم کسی لڑکی کو نہیں۔۔۔ بلکہ مجھ جیسی کئی لڑکیاں تمہیں اپنے ساتھ ہچکا لے جانے کی تاک میں ہیں۔“

دیکھا بوجھ سب کے لبوں پر مسکرائیں سمجھتی رہی لیکن میں نے نوٹ کیا کہ سارا اس وقت ہمارے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ خفی۔۔۔ جانے اس کے دماغ کے کہاں اٹھے ہوئے تھے۔



یوینورسٹی کا بڑا اہل کچا کچھ بھرا ہوا تھا۔ آج سب طالب علم اپنا اپنا ٹرم بھیج کر دینے کے بعد ہال میں جمع ہوئے تھے۔ یہاں پر آج چند بہترین طالب علموں کو اپنا پرچہ اور اپنی تحقیق باقی طالب علموں کے سامنے پڑھ کر سنانے کا موقع دیا گیا تھا۔ ان تمام نے قیصل کیا تھا کہ آج صرف تین اسٹوڈنٹ جنسوں نے کچھلے مسٹر میں یوینورسٹی بھر میں پہلی تین پوزیشنز حاصل کی تھیں۔ وہی اپنا منتخب ٹرم بھیج حاضرین کے سامنے پیش کر رہی تھے۔ خاصی بڑی تقریب تھی۔ لندن کے میئر صاحب جب معمول مہمان خصوصی تھے۔ لوگوں کی تعداد کچھلے چند ہفتوں سے جاری انقلابیہ اور میرے درمیان چھٹیل کی وجہ سے بھی بہت زیادہ تھی۔ جانے یہ خبر کہاں کہاں گردش کرتی رہی تھی۔ سائنس کے اس دور میں لوگوں کو اسلام رکنا بھی بہت مشکل کام ہے۔ انجی میں اخباری رپورٹرز اور فوٹوگرافرز کی بڑی تعداد بھی شامل تھی جو ہر سال کی طرح اس سال بھی یوینورسٹی کی اس خاص تقریب کی ترویج کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے بہت کم ہی ایسے ہوں گے جو میرے چہرے سے واقف ہوں گے لیکن بقول جوزفین میں سے ہر ایک کم از کم میرے نام سے ضرور واقف تھا۔

کچھ دیر میں سراً توک نے اسٹیج پر آ کر مہمان خصوصی کا شکریہ ادا کیا۔ ان چند بڑے ناموں کا اعلان کیا جو یوینورسٹی کو انکوں پاؤں پر سالانہ چندہ دیتے تھے اور جن میں سے اکثر اس وقت اس تقریب میں ہال کی پہلی ترو میں موجود بھی تھے۔ یہ سب کے سب نام یہودیوں کے ہی تھے۔ ان میں سے اکثر کی اپنی اولادیں بھی ایسی یوینورسٹی میں زیر تعلیم تھیں تقریب کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔ پہلے چند طلباء مطالبات کو ان کی غیر معمولی

قابلیت پر سند اور میڈل وغیرہ دیے گئے۔ اس کے بعد ان اسٹوڈنٹس کو اپنا پرچہ پڑھنے کی دعوت دی گئی جن کے نام آج کی فہرست میں شامل تھے۔ ان ناموں میں سارہ کا نام بھی شامل تھا کیونکہ پچھلے سیکسٹر میں بھی میڈک کی طرح اس نے ہی کئی پوزیشن حاصل کی تھی۔

سب سے پہلے جینی فوکس نامی لڑکی نے معاشیات پر اپنا پرچہ پڑھا اور ہال سے خوب داد و صول کی۔ اس کے بعد مارٹن نامی سال اول کے طالب علم نے لندن کی پُرانی عمارتوں کے بارے میں اپنی تحقیق پیش کی۔ اس کا پرچہ بھی واقعی لا جواب تھا۔ ہال نے اسے بھی جی بھر کے ستائش کا انعام دیا۔ اس کے بعد سارہ کا نام پکارا گیا۔ بلیک کورٹ اور بلیک ٹراؤڈر میں ٹیوش سارہ نے سٹیڈ ٹیوش کے ساتھ اپنا پسندیدہ اسکالر ف بھی لکھے میں ڈال رکھا تھا۔ اس نے مجھے ایک دن بتایا تھا کہ سرخ رنگ کا پاپا اسکالر ف دو صرف خاص موقعوں پر ہی پہنتی تھی۔ آج بھی اس نے اپنے لیے ہال پیچھے کس کر باندھے ہوئے تھے اور دور سے ہال کسی کالونف اسکول کی طالبہ ہی تو لگ رہی تھی۔ سارہ کا نام پکارے جانے پر ہماری ساری کلاس نے خوب شور مچایا جن میں جم اور بیکاسر فہرست تھے۔ سارہ مسکراتی ہوئی اسٹیج پر چڑھ گئی۔ اس نے ہال کے تمام حاضرین کا اور صدر تقریب کا شکریہ ادا کیا۔ اور پھر اس نے اپنے سامنے اسٹیج پر بنے چھوٹے سے شیشے کے دو سٹرم (ڈائس) پر رکھے اپنے پرچے کا پہلا صفحہ پلٹا۔

”مہیا! آپ سب جانتے ہیں کہ میرے پرچے کا عنوان ہے ”ہالوکاسٹ۔۔۔ ایک نظریہ یا ایک حقیقت؟۔۔۔ آج سے تین ماہ پہلے بھی میں نے اسی موضوع پر پہلے صفحے کی حیثیت انعام بھی حاصل کیا تھا۔ آج میں اُسی پہلے صفحے کا دوسرا حصہ آپ سب کے سامنے پیش کرنا چاہوں گی۔ امید ہے آپ سب کی توجہ مجھے حاصل رہے گی۔“

کئی قطار میں بیٹھے سر آئزک فخر اور مسز سے اپنی بیٹی کا با اعتماد امداد دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ساتھ بیٹھے مسز اور چند دیگر خصوصی مہمانوں کو بھی دیر سے سے بتایا کہ سارہ ان کی بیٹی ہے۔ سب نے ستائش امداد میں سر ہلائے۔ سارہ کی بات جاری تھی۔

”جیسا میں اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی کہ پہلے صفحے کو تحریر کرتے وقت میں نے تحقیق کی بجائے زیادہ تر مواد اکٹھا کرنے پر اپنی توجہ قائم رکھی تھی۔ شاید اس وقت تک مجھے تحقیق کرنے کی اتنی عادت نہیں تھی یا صرف تصویر کا ایک ہی رخ دیکھنے پر ہنسنے کی وجہ سے میں نے دوسرے رخ کو چھپنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن آج میرا رزم بھی پوری تحقیق اور دلائل کے بعد مرتب ہوا ہے۔ میرے پایا۔۔۔ سر آئزک نے مجھے ہمیشہ ڈنکے کی چوٹ پر بچ بولنے اور بچ بننے کی تربیت دی ہے اور بچ ہے کہ آج اگر میں آپ سب کے سامنے اس اسٹیج پر فخر سے کھڑی ہوں تو یہ فخر دینے والے اصل میں میرے پایا، میرے سب سے بڑے استاد خود ہیں۔“

سارے ہال نے سارہ کی اس بات پر تالیاں بجاائیں۔ سر آئزک کا سر فخر سے مزین تھا کیا سارہ نے پہلا صفحہ ختم کر کے دوسرا صفحہ پلٹا۔

”ہالوکاسٹ، یہ تحقیق کے دوران میں نے بچ اور مغروہ بننے کی ایک عجیب سی جنگ دیکھی۔ یہ جنگ یاہر بھی ہو رہی تھی اور خود میرے اندر بھی، میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ لوگوں کو بچ کہنے اور بچ بننے سے اس قدر گریزاں دیکھا۔ ایک عجیب انسان ہماری زندگیوں میں آیا اور اس نے سب کچھ جس جس کر کے دکھوایا۔ میں نے اپنے پایا کے بعد بچ کا دوسرا صفحہ اُسی انسان سے دیکھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ کوئی کس طرف بچ پر قدم جما کر کھڑا ہو سکتا ہے اور ساری کائنات سے نگر لینے کی امت کر سکتا ہے۔ میرا آج کا رزم ہیجڑ، یہ تحقیق اور یہ تجربہ دراصل میری نہیں ہے، بلکہ اُسی ہے

انسان کی تحقیق ہے جس کا نام سارو مضامین ہے۔

ہال میں بیٹھے کسی نے ہم کا دھماکا کر دیا ہوا، اچھا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ سر آ ٹوک ٹوک ٹوکے میں کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کسی سے چلا کر ایک بندہ کر دینے کا کہا لیکن جب تک جم اور ڈیوڈ وٹیر نے ہال کے آڈیو سسٹم پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور گھٹتے ہوئے رپورٹرز اور فوٹوگرافرز کے جسم میں بیٹھے کسی نے بجلی کی بھجری تھی۔ وہ دھڑا دھڑا سارو اور دیگر لوگوں کی سر آ ٹوک سمیت تصاویر بناتے گئے۔ میٹر نے آہستہ سے سر آ ٹوک کے کان میں کچھ کہا شاید ان کی توجہ اخباری رپورٹرز کی طرف متوجہ کر دئی۔ سر آ ٹوک سہیلی کے عالم میں خون کے گھونٹ پیچے ہوئے اور سہیلی نے ہاتھ ملنے ہوئے دوبارہ بیٹھ گئے۔

خود میرے لیے بھی یہ کسی دھماکے سے کم نہ تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مارا اپنے پرچے کی جگہ میرا پرچہ پڑھنے کے لیے آئے گی۔ اس نازک سی لڑکی کی جراثیموں کی حد جانے کہاں جا کر ختم ہوتی تھی۔ اس کا انداز دھماکا مشکل تھا۔ بہت مشکل۔۔۔۔۔ سارو کی تقریر جاری تھی۔

”تقریر یہ بالوکاسٹ کی ابتدا میں ہونی اور لڈا رڈ کے اسرائیلی لیڈر اور وزیر اعظم ڈیوڈ بن گوریون کی تحریک سے شروع ہوتی ہے اور اس کے لیے جرمنی کے لیڈر اور دوسری جنگ عظیم کے ایک مشہور کردار ڈیوڈ کو ہف بنایا گیا۔ جب برطانیہ اور امریکہ کی یہودی رہنماؤں کو یہ یقین دہانی تھی کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ایک آزاد سلطنت یہودیوں کے نام ہوگی۔۔۔۔۔

سارو میرا دلچسپ پرستی جاری تھی اور ہال پر اک سنا سنا چھایا ہوا تھا۔

”سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جرمن اور نظریہ ہف کیوں بنے۔۔۔۔۔؟ جواب ہٹلر کی یہودی دشمنی سے ظاہر ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد یہودیوں کو جرمنی بدر کر دیا گیا۔ اسلئے اور دیگر جنگی ساز و سامان کی فیکٹریاں یہودیوں سے چینیں لی گئیں۔ کلیدی اسماعیل نور عہدوں سے یہودیوں کو ہٹا کر جرمن ہاشدوں کو قیامتات کر دیا گیا تھا اور یوں یہودی جرمنی کے خلاف ہو گئے۔ یہ سلوک نہ صرف جرمنوں نے بلکہ رومانیہ اور دیگر کئی ملکوں نے بھی یہودیوں کے ساتھ روا رکھا۔ اور یسٹین سے بالوکاسٹ کے نظریے کی ابتدا ہوئی۔ شروع میں میں نے بھی انہی تحقیق کے اس حق میں چھینے والی بہت سی کتابوں سے حوالے لے کر اسے سچ مانا لیکن آج سارو مضامین کے پرچے اور اس کی تحقیق کے نتیجے میں میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہودی مصنفین اور محقق آج تک اتنی بڑی ہلاکتوں کے بارے میں ایک بھی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کر سکے۔ جرمنوں کے ہاتھوں یہودیوں کی ہلاکتیں تو ضرور ہوئی تھیں لیکن اصل تحقیق اور تمام تر شواہد اور ثبوت چند ہزار ہلاکتوں سے زیادہ کی تصدیق نہیں کر پائے۔“

سر آ ٹوک نے منے میں اٹھ کر دوبارہ ہال سے باہر جانے کی کوشش کی لیکن اس وقت تک ہال سے باہر موجود لوگ بھی اندر گھر آئے تھے اور دروازوں کے قریب اور ہال کے اندر نشستوں کے درمیان بیٹے راستوں میں اس قدر جھگڑا تھا کہ وہ تھلا کر وہیں کھٹکتے رہ گئے۔ سارو بولتی رہی۔

”دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر راستے بڑے چبانے پر جرمن فوج نے یہودی قتل عام کیا بھی تھا تو اس وقت کے اخبارات، جرائد اور رسائل اس بارے میں اس قدر خاموش کیوں ہیں۔ جیسے کئی دنوں میں میں نے دوسری جنگ عظیم سے لے کر بالوکاسٹ کا نظریہ سامنے آنے تک کے ذور کے ہر اخبار، ہر رسالے ہر خبر کو چھان مارا ہے لیکن مجھے اتنی بڑی ہلاکتوں کی خبر جرمن دشمن اخبارات اور رسائل میں بھی نہیں ملی۔ آخر کیوں؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ ”ہالوکاسٹ“ کا انزاسم تو جرمنوں پر لگایا جاتا رہا ہے لیکن اس وقت کی یہودی قوم کی طرف سے دیاؤ ہیستلین اور قبلہ اڈل اور گولان کی پہاڑیوں کی طرف نقل مکانی کی صورت میں ہی کیوں نکالا گیا۔ میں جانتی ہوں کہ قبلہ اڈل ہر یہودی کے لیے اپنی زندگی سے زیادہ مقدس ہے لیکن کیا ضروری ہے کہ اس نقل مکانی کے لیے ہالوکاسٹ کے نظریے کا ہی سہارا لیا جاتا۔۔۔ کیا کوئی مجھے جرمنوں کے خلاف اٹھائے جانے والے کسی اقدام کے بارے میں بتائے گا۔۔۔ اصل مجرم تو یہودیوں کے نزدیک جرمن تھے۔۔۔ لیکن ان کے خلاف ایسا کچھ نہیں کیا گیا جس کا کوئی قابل ذکر نہیں بھی سنائی دیا ہو۔۔۔؟ آخر کیوں۔۔۔؟

پھر سارہ نے ان تمام تصنیفات کے نام پڑھے جن سے میں نے ہالوکاسٹ کے نظریے کے خلاف شواہد اکٹھے کیے تھے اور تمام اسٹوڈنٹس کو ان تصانیف کو ایک بار پڑھنے کا مشورہ بھی دیا۔ مجھے یقین ہے اگلے دنوں میں سارہ نے خود بھی ایسی ہر ایک تصنیف کو چھان مارا ہوگا جس کا حوالہ میں نے اپنے پرچے میں دے رکھا تھا۔ خرمیں سارہ بولی۔

”بحث نہیں ہے کہ ”ہالوکاسٹ“ مفروضہ ہے یا حقیقت۔ بحث تو اب یہ ہے کہ کچھ کو زمانے کے سامنے پیش کرنے سے اور بچ بولنے سے اس قدر خوف کیوں۔۔۔؟ میں اپنی فنی نسل کو اس بات کی دعوت دیتی ہوں کہ ہمیں خود آگے بڑھ کر کچھ کتاب کو آٹ دینا چاہیے۔ اگر ہمارے بزرگوں نے اس وقت کچھ مقاصد حاصل کرنے کے لیے غلط بیانی سے کام لیا تھا تو کیا ضروری ہے کہ ہم بھی انہی کے نقش قدم پر چلیں۔ کیوں نا ہم خود چل کر کچھ حقائق کریں حماد احمد رضا کا یہ فرم ہم پر تو صرف ایک ابتدا ہے۔ ہماری فنی نسل کو کچھ کی طرف بلاتے کی ابتدا۔ حماد نے اس پرچے میں کہیں بھی نہیں لکھا کہ ”ہالوکاسٹ“ سراسر جھوٹ ہے۔ لیکن اس نے اس کے مفروضے کے سچے ہونے پر انگلی اٹھائی ہے۔ اس نے اس بات پر اعتراض کیا ہے کہ ایک قوم کے مظالم اگر ثابت ہو چکی ہوں تب بھی جب بھی اس کا بدلہ کسی سازش کے ذریعے دوسری قوم سے لینا انصافی ہے۔ حماد کا یہ فرم ہمیں اسرائیل کی حدود میں تو کوئی رد و بدل نہیں کر سکتا کیونکہ جو وہ چکا آئے بدلتا اب کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ لیکن ہم یہ تو تسلیم کر سکتے ہیں کہ کسی نے کہا اس پر اور کتنی غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ میں بھر کہوں گی یہ ہم سے قتل نہیں پہلے کیے گئے لوگوں کے اچھے یا بُرے اعمال ہیں۔ تو پھر ہم آج کی نسل اس کی جواب دہی کیوں کرتے پھریں۔ یاد رکھئے۔۔۔ اس دنیا میں امن قائم کرتا ہے تو ہماری اس نسل کو ہی آگے آنا ہوگا۔ پھر چاہے وہ نسل یہودی ہو یا مسلمان، پورچیزین ہو یا امریکن یا افریقی۔۔۔ ہمیں اپنا امن کا نظریہ خود پیش کرنا ہوگا۔ جو ہو چکا سو ہو چکا۔۔۔ جس نسل جس قوم کے بھی بزرگوں نے جو کچھ بھی کیا چاہا اپنی دانست میں درست ہی کیوں نہ کیا ہو اور وقت نے اُسے غلط ثابت کر دیا ہو، چاہے کچھ بھی ہو۔ وہ سب اب ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔ ہمیں حال میں جینا ہے۔ ماضی کا حصہ بن کر اپنے بزرگوں کی غلطیوں پر پردہ ڈالنا، ان کے جرم سے کہیں زیادہ سنگین جرم ہوگا۔ کیونکہ شاید انہوں نے وہ کام غلطی یا جرم سمجھ کر نہ کیے ہوں۔۔۔۔

میں اپنی دور ہر قوم کی فنی نسل کو دعوت دیتی ہوں کہ وہ ”ہالوکاسٹ“ اور اس جیسے کسی بھی مفروضے کی حقیقت کو جاننے کے لیے خود تحقیق کریں۔ خود قدم آگے بڑھائیں۔ چاہے وہ مفروضہ کسی بھی قوم یا نسل سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو۔ اپنی دوستی اور دشمنی کی بنیاد اس نسل کو خود رکھنی ہوگی۔ ہم سے پہلے گزرے ہوئے ہمارے بڑوں کی دشمنیاں ہمیں ان کے ساتھ ہی دیکھنا ہوں گی۔“

سارہ نے میرے غم بھیجی کا آخری صفحہ بھی غم کر دیا۔ اور اسٹیج سے اترنے کے لیے آگے بڑھ گئی۔ ہال پر بہت دیر تک ایک سوت کا سا سکوت طاری رہا۔ اور پھر سب سے پہلے لندن کے مصنف اور مہمان خصوصی نے اٹھ کر سارہ کے لیے جلی بھائی۔ پھر اس کے بعد وہود کے بعد چار اور چھ لکھوں میں ہی ہال تالیوں، نعروں اور ترانے لکھاتے کے شور سے جیسے پھٹنے لگا۔ سارہ کے پیچھے اخباری فوٹو گرافر ڈکلیش مشین کی روشنی بھما کے کر رہی تھی۔ وہ اسٹیج سے اتر کر سیدی میرے پاس آئی اور نرم چہرے میری طرف بڑھا کر مسکرائی۔

”یہ لو اپنی ممانت۔۔۔۔ نہیں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اس یونیورسٹی کے ہر طالب علم کے پاس آج شام تک اس ٹرم بچہ کی ایک ایک نقش بنائی جائے گی۔ تم نے جج کے جس سفر کی دعوت دی ہے۔ وہ آج ہی یونیورسٹی کے اسٹیج سے نہیں نے شروع کر دیا ہے۔ اور تم دیکھنا کہ بہت جلد تمہارے قافلے میں لاکھوں نوجوان شامل ہوں گے۔“ ہمارے ارد گرد اسٹوڈنٹس، اخباری نمائندوں اور ہمارے ذاتی دوستوں کا ایک جھوم تھا۔ اخبار والے دھڑا دھڑ میری اور سارہ کی تصاویر بنا رہے تھے۔ رپورٹرز اپنے مائیک آگے کیے جانے اور کیا سوال کر رہے تھے۔ مجھے ان سب باتوں کا وحش ہی کہاں تھا۔۔۔۔ دفعتاً میرے سامنے کھڑی سارہ کی جگہ ایمان نے لے لی۔ نہیں نے چونک کر ایمان کو دیکھا، آہ پاس ہال کا شور ساکت ہو گیا اب لوگ ساکت ہو گئے۔ ایمان دھیرے سے مسکائی۔ ”میں نے کہا تھا نا۔۔۔۔۔ صحبت فاتح عالم۔۔۔۔۔“

دفعتاً ایمان کی جگہ پھر سارہ نے لے لی، ہم دونوں کے گرد بچا، جم، ڈیوڈ اور فیتانے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر گھیرا سا ڈالا وہاں تھا کہ دم بھوم کے دھکوں سے جج نکلیں۔ نہیں نے سامنے کھڑی سارہ کے ہال ہاتھ بڑھا کر کھیر دیے سارہ مسکرا دی، سارا ہلی مسکرا دیا۔ ساری دنیا مسکرا دی۔ ساری کائنات مسکرا دی۔



## من و سلویٰ

دور حاضر کی مقبول ترین مصنفہ **عصیرہ احمد** کا بہت خوبصورت اور طویل ناول، ”من و سلویٰ“ جس کا بنیادی موضوع رزق حلال ہے۔ من و سلویٰ جو بنی اسرائیل کے لیے آسمان سے اتارا گیا اور رزق حلال جو امت محمدیؐ کے لیے عطا کیا گیا، لیکن نہ بنی اسرائیل من و سلویٰ سے مطمئن تھی اور نہ ہم رزق حلال پر قانع۔ انہیں انواع و اقسام کے ذمینی کھانوں کی طلب تھی اور ہمیں کم وقت میں زیادہ کی۔۔۔ رزق حلال کے موضوع پر لکھا گیا یہ ناول کتاب گھر کے معاشرتی ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

## نوجوان انقلاب

رات یونیورسٹی کی تقریب سے عین بہت دیر بعد قاریغ ہو کر گھر پہنچا۔ ریکاتے تقریب کے بعد اپنے خاص دوستوں کو رات کے کھانے پر مدعو کر دکھاتا تھا۔ وہاں سے آتے آتے آدھی رات ہی ہو گئی تھی۔ میں آتے ہی بسز پر پڑے سو گیا تھا۔ بھرت ہانے کس وقت مجھے کامران کے شور نے جگا دیا۔ وہ میرے ہی کمرے میں چلا تا ہوا داخل ہو رہا تھا۔

”اوہ تو میرا شہزادہ پورے شہر میں آگ لگانے کے بعد یہاں پڑا سو رہا ہے۔“ میں نے چند عیبائی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔  
”تم آج ریسٹورنٹ نہیں گئے تھے۔“

”وہیں سے آرہا ہوں۔ وہاں بھی تمہارے ہی فدا بین کا ہجوم جمع ہے۔ جو تمہارے ویدار کے لیے ترس رہے ہیں۔ سارے شہر کے اخبارات میں کل یونیورسٹی ہال میں کی گئی اس یہودی حسینہ کی تقریر کے چرچے ہیں۔ تم دونوں کی تصویروں کی دھوم ہے۔ کچھ کہتا ہوں کہ آج اگر تم یہاں سے انکسٹن لائے گا اعلان کر دو تو بلا مقابلہ سبز کا استحباب جیت جاؤ گے۔ یہ گوری ٹی نسل جب کسی کو نر پر بضاتی ہے تو پھر اترے نہیں دیتی۔“  
کامران نے آج کے اخبارات کا مونہ سا پلندا امیری طرف پھینکا۔ ہر اخبار کے پہلے صفحے پر ساروہ کی تقریر کے دوران اور پھر میرے ساتھ کھڑے مجھے ٹرم پیپر واپس کرتے ہوئے کی تصویر اور ایسی کئی دیگر تصاویر چھپی ہوئی تھی۔ تقریباً ہر اخبار نے اس واقعے کو اور ساروہ کی تقریر کو ”نوجوان انقلاب“ سے تعبیر دے دی تھی۔ چند ایسے اخبارات نے جن کے مالکان یہودی تھے یا پھر یہودیوں کے زیر اثر تھے اور اشی کے چند سے سے چلنے تھے، ساروہ کی تقریر اور ہال کا سٹ پر میرے پرچے پر زبردست تنقید بھی کی تھی۔ اسے ایک جذباتی باتوں کا پلندا اقرار دیا تھا لیکن اس وقت ان کی تنقید بھی ہماری شہرت کو بڑھانے کی ایک وجہ بن گئی تھی۔ اس نازک لڑائی کی جرأت نے میری بات شہر کے ہر گلی کوچے میں پہنچا دی تھی اور کل تک انہی اخبارات کے ذریعے پورے یو۔ پی میں اور پھر امرائٹس کے ذریعے ساری دنیا میں پھیلنے والی تھی۔ لوگوں میں مایک بنی بحث کا آغاز ہو گیا تھا۔ نوجوان نسل نے سچ کی تلاش کے عنوان سے اپنے بڑے بزرگوں کو انہی اخبارات میں دعوت دی تھی کہ وہ ان کی مدد کریں، سچ جاننے میں اور سچ کو پھیلانے میں۔ ساروہ نے سچ ہی کہا تھا۔ یہ قافلہ سب چل پڑا تھا۔ اس قافلے کی سربراہی خود ساروہ ہی تو تھی۔

چند اخبارات نے جو یہودی اثر میں تھے۔ پیٹر کے ساتھ میرے فرضی، جھوٹے کو بنایا دیا کروانا سے بڑھا چڑھا کر بیان کر کے میری کردار کشی کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ ساروہ اور میرے تعلق پر بھی انگلیاں اٹھائی گئی تھیں۔ ان اخبارات نے خاص طور پر ساروہ کے ہال بکھراتے میرے بڑے ہاتھوں والی تصویر کو شائع کیا تھا۔ گویا جنگ چھڑ گئی تھی۔ کچھ اخبارات نے مجھے خاص قوم کا ایک خطرناک ایجنٹ بھی قرار دیا تھا۔ جو ایک خاص ایجنڈہ لے کر یونیورسٹی آیا۔ لیکن زیادہ تر اخبارات نے کچھڑا پھیلنے کی بجائے میرے پیغام کو اُس کے بڑھا دیا تھا۔ سوچنے کے پیغام کو، تحقیق کر کے سچ

کے ہاتھ کے پیغام کو، سارہ کی تو ہر اظہار نے زبردست تعریف کی تھی۔ اسے رولتوں سے ہٹ کر دھوپا کے سامنے کھڑی ہونے والی لڑکی قرار دیا تھا۔ اُسے نئی جمل کی آواز کہا تھا۔ میرا مقصد پورا ہوا نظر آ رہا تھا۔ بحث شروع ہو چکی تھی اور میں جانتا تھا یہ بحث اُس کے بل کر نئی نسل کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرنے والی تھی۔

لیکن اظہارات میں اکا دکا چند ایسے واقعات کی بھی نشان دہی کی گئی تھی جو میرے لیے کافی تشویش کا باعث تھے۔ لندن کے مصافحات میں اور چند یہودی آبادیوں کے ارد گرد دھوکے اکا دکا واقعات کا بھی ذکر تھا جو سارہ کی اس تقریر کے نتیجے میں پیش آئے تھے۔ مجھے بہت حیرت ہوئی۔ شدت پھندی اور اچھا پھندی کا اثر ہم تو ہم پر لگایا جا رہا ہے بیٹھ اور ایک سلسلے کے ساتھ، لیکن ان ہنگ نظر یہودیوں کی طرف کسی کا وہ بیان نہیں جاتا تھا جنہوں نے اپنی ہی نسل کی ایک مصحوم لڑکی کی ایک بچی پکار کر نسل تصب کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی تھی۔

مجھے دو بجے آج یو ندرٹلی جانا تھا لیکن کامران نے مجھے اسکیلے جانے نہیں دیا۔ اُسے ان اکا دکا واقعات کی وجہ سے کافی تشویش تھی جو لندن کی یہودی بستیوں کے مصافحات میں ہوئے تھے۔ وہ مجھے خود یو ندرٹلی سے گیت پر اپنی گاڑی سے اتار کر ہی واپس ریٹورنٹ گیا اور مجھے تاکید کر گیا کہ میں واپسی پر نکلنے سے پہلے بھی اُسے فون کر کے بلوالوں اور پیدل، تہا یو ندرٹلی سے نکلنے کی کوشش نہ کروں۔ وہ بچپن سے ایسا ہی تھا، اسکول اور کالج میں جب کبھی میرا کسی سے جھگڑا ہو جاتا تھا تو وہ یونہی میرے سامنے کی طرح میرے ساتھ چپکا رہتا تھا اور جب تک وہ خطرہ محسوس نہیں جاتا تھا مجھے کہیں اسکیلے نہیں جانے دیتا تھا۔ یوں کئی مرتبہ ہم دونوں نے اسکیلے اور بہت مرتبہ اُس نے میری جگہ اسکیلے اپنے جسم پر بہت سے زخم کھائے تھے۔ کبھی کبھی مجھے حیرت ہوتی تھی کہ ایسے دوستوں کو ماں باپ کے ساتھ کا وہ کہیں نہیں دیا جاتا؟

یو ندرٹلی کے گیت سے داخل ہوتے ہی چاروں طرف سے بولو، ہائے، اور مبارک باد کی آوازیں نے میرا استقبال کیا۔ حالانکہ آج یو ندرٹلی میں شل کی تقریب کی وجہ سے عام تعطیل کا اعلان کیا گیا تھا اس لیے یو ندرٹلی تقریباً خالی ہی تھی۔ صرف ہوٹل میں رہنے والے چند اسٹوڈنٹس موجود تھے لیکن مجھے اپنے خلاف ہونے والی انکوائری کے سلسلے میں آج بایا گیا تھا۔ ڈین آئزک کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بہت سے لوگوں نے کانہ سے تمکب کر، ہاتھ مار کر اور گلے لگا کر اپنے ہند پات کا اظہار کیا۔

ڈین آئزک کے کمرے میں تو پوری عدالت ہی لگی ہوئی تھی۔ جیوری کے ممبر، بیٹور اور اس کے دونوں گواہ موجود تھے۔ ایک دوسرے چرے بھی موجود تھے جنہیں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سر آئزک کی آنکھیں سو جھی ہوئی تھیں اور چہرہ اتر ا ہوا تھا۔ یقیناً رات کو دو بجے جب سارہ کو ریکالنے نہیں نے اور ہمارے ساتھ کی تمام ٹولی نے گھر چھوڑا تھا تب اُس کے بعد ان کی اور سارہ کی ایک طوفانی بحث یا جھگڑا ضرور ہوا ہوگا۔ میری آج سارہ سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی تھی اس لیے میں صرف اپنے طور پر خیالی گھوڑے ہی دوڑا سکتا تھا کہ کل رات سارہ کے گھر میں کیا ہوا ہوگا۔ جیوری نے اپنی کارروائی شروع کی۔ میرے خلاف الزامات کی فہرست پڑھ کر سنائی گئی جس میں اب یو ندرٹلی کی نفی شہرت کا سبب بننے کا الزام بھی شامل کیا جا چکا تھا۔ لیکن آج مجھے جیوری کسی جگہ میں دکھائی دے رہی تھی۔ میرا تھا تو اسی وقت ٹھکا تھا جب خصوصی طور پر آج مجھے جمنی والے ون ڈیش کے لیے بلایا گیا تھا۔

سنے آنے والے بھاری بھرکم اور موٹی تو نندہ والے صاحب کا نام پارکر تھا۔ وہ لندن کی خفیہ پولیس کے نکلشن انچارج تھے۔ ان کے ساتھ خفیہ ایجنسی ایم۔ آئی۔ کے دو ایڈکار بھی موجود تھے۔ پیٹر نے پھر سے اپنی رام کہانی سنائی۔ اس مرتبہ دونوں گماہوں نے بھی بیانات دیے۔ میرا بیان تو پہلے سے وہی تھا کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا لیکن جیوری نے میرا اعتراض رد کر دیا اور پلاٹ غریبہ سنا دیا کہ مجھے فوری طور پر یونیورسٹی کے اس ٹرم سسٹر سے فارغ کیا جاتا ہے اور پیٹر کو اختیار دیا گیا کہ اگر وہ جب عزت کا دعویٰ کرنا چاہے یا اگر اُسے مجھ سے کوئی خطرہ محسوس ہوتا تھا تو وہ پولیس سے بھی رابطہ کر سکتا تھا۔ شاید اسی لیے آج مجھے یہاں پولیس والے حضرات بھی نظر آ رہے تھے۔

پارکر اس تمام کارروائی کے دوران غور سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے سراسر نرک سے پوچھا کہ کیا مجھے اس فیصلے کے خلاف اپیل کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں۔ پھر انہوں نے مجھے بتایا کہ یونیورسٹی کی حد تک تو فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ البتہ میں چاہوں تو لندن کی کسی عدالت میں اس فیصلے کے خلاف جاسکتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے دے بے لفظوں میں یہ دھمکی بھی دی کہ انہوں نے پیٹر کو فی الحال پولیس میں میرے خلاف جانے سے اسی شرط پر روک رکھا ہے کہ میں اس فیصلے کے خلاف عدالت میں نہیں جاؤں گا۔

جیوری نے فیصلہ سنا دیا تھا سراسر نرک کا چہرہ فیصلہ سننے کے بعد بھی اُتر لایا رہا۔۔۔۔۔ شاید انہیں آنے والے حالات کا کچھ اندازہ تھا۔ وہ یونیورسٹی میں صرف میری کلاس کا اس عارضی طور پر ختم کرنے کا اہتمام دیکھ چکے تھے۔ وہ جیوری کے ساتھ فیصلہ سنانے کے بعد بھی بہت دیر تک سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔

ضمین کمرے سے نکل آیا۔ میرا دھیان کسی اور طرف تھا کہ پیچھے سے موٹی تو نندہ والے پارکر نے مجھے پکارا۔ میں نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔ وہ میرے قریب کھڑی چاکا تھا اُسے ہر لمحہ پیچہ گم چبانے کی عادت لگتی تھی۔ اُس نے غور سے مجھے دیکھا۔

”ہوں۔۔۔۔۔ تو تم ہوتا۔۔۔۔۔ جس نے آج پورے لندن میں آگ لگا رکھی ہے۔۔۔۔۔ بہت خوب۔۔۔۔۔ آگ لگانے کی قوت رکھتے ہو۔۔۔۔۔ میں جیوری کی تمام کارروائی کے دوران بہت غور سے تمہیں دیکھ رہا تھا۔ تمہارے چہرے پر ڈراما بھی پریشانی نہیں تھی۔“

”میں جانتا تھا کہ یونیورسٹی انتظامیہ یہی فیصلہ کرے گی۔ فیصلہ بہت پہلے ہو چکا تھا۔ آج صرف سنایا گیا ہے۔“

پارکر پیچہ گم چماتے ہوئے اپنی ڈمبلی جینٹ کے کیلس اوپر پکھنچتے ہوئے بولا۔

”بہت خوب۔۔۔۔۔ مجھے تمہارا اعتماد واقعی بہت پسند آیا۔۔۔۔۔ کہیں تم یہ تو نہیں سوچ رہے کہ یونیورسٹی کے باقی اسٹوڈنٹس کو شہر کی سڑکوں پر لاکر جیوری کو اپنا فیصلہ واپس لینے پر مجبور کر دو گے۔ اگر ایسا ہے تو میں تمہیں اطلاع دیتا چاہتا ہوں کہ انتظامیہ نے کل سے یونیورسٹی کو چند دن کے لیے بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تاکہ اسٹوڈنٹس کے کسی ممکنہ رسی اکٹیشن سے بچا جاسکے۔“

پارکر نے فرسٹا کر پھر باہر پولیس والوں کی طرح میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ حالانکہ وہ یہ سب نہایت غیر محسوس طریقے سے کر رہا تھا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”آپ بے فکر رہیے۔ اس یونیورسٹی کی اسی سال تاریخ میں پہلی مرتبہ اسٹوڈنٹس کو روک دینے کی چھٹی تاریخ کی اطلاع کے مل رہی ہے۔ وہ سب



اس چھٹی کو بہت خوشی سے پُر لطف انداز میں گزاریں گے۔“

”میں آگے بڑھنے لگا۔ پارکر نے جلدی سے پھر مجھے پکارا۔

”آگے کا کیا ارادہ ہے؟“

”ابھی کچھ سوچا نہیں۔ اپنے خلاف جیسے الزام کا سامنا کر دل گا۔“ میں پھر آگے بڑھنے لگا۔ پارکر پھر بولا۔

”میں جانتا ہوں کہ یہ الزام جھوٹا ہے۔“

میں رک گیا۔ میں تے حریت سے پارکر کی جانب دیکھا۔ وہ حسب معمول چورنگ چباتا رہا۔ ”آپ جانتے ہیں پھر بھی آپ میرے خلاف

ہوتی انکوائری کے دوران پُپ چاپ خاموش بیٹھے رہے۔۔۔ کیوں۔۔۔؟؟؟“

”کیونکہ تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا اور ان لوگوں کے پاس گواہ کے طور پر سارے ثبوت موجود تھے۔ تم نہیں جانتے تھے اور تمہاری

دوست سارہ نے اس وقت لندن کی تمام انتظامیہ اور سارے تھیلڈ پارٹنٹ کو بلا کر رکھ دیا ہے۔ ساری پولیس کو تکندہ کی ایکشن کی وجہ سے الٹ کر دیا

گیا ہے۔ اگر یونیورسٹی انتظامیہ میں طلبہ نہ کرتی تب بھی لندن انتظامیہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ معاملہ اب اپنے ہاتھوں میں لے لیا جائے۔“

”لیکن آپ یہ کیسے جانتے ہیں کہ ان کا الزام جھوٹا ہے۔“

”تین سال سے پولیس کے جھگے کی خاک چاٹ رہا ہوں پر خود دار۔۔۔ اس شبیٹ لائبریری میں کی گئی پریس کنفرنس کے وہ جھوٹ بول رہا

ہے۔ اور میرا اندازہ ہے کہ یہ سب یونیورسٹی کے ڈین کی شر پر ہو رہا ہے۔“

وہ واقعی پکا پولیس والا تھا۔ کچھ دیر میں ہی بات کی گہرائی تک پہنچ گیا تھا۔

”اس کے بعد کا دوسرا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے یہ ڈین میں ضرور کھنا کہ ان لوگوں نے اب تمہیں لندن سے ڈی پورٹ (علاقہ بدر)

کرنے کا پورا منصوبہ تیار کر رکھا ہے۔ جو بھی قدم اٹھانا بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا۔“

”آپ مجھے یہ بتا چکے کہ بیڑ کی شکایت پر میرے خلاف پولیس کا رد عمل کیا ہو گا۔“

پارکر نے چونک کر میری طرف دیکھا۔۔۔۔

”میری توقع سے کہیں زیادہ ذہن ہو۔ عام حالات میں پولیس اس کی تمہارے خلاف شکایت پر زیادہ سے زیادہ یہ عمل کرتی کہ تمہیں چند

مہینے کے لیے قریبی اسٹیشن بلا کر تم سے کوئی ذہنی یا تحریری حقائق لے لیتی اور تم دونوں کو مستقبل میں محتاط رہنے کی نصیحت کر کے جانے دیتی۔ کیونکہ

پولیس کے جھگے میں اور کسی یونیورسٹی کے قانون میں بہت فرق ہوتا ہے۔ پولیس بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے صرف گواہوں کی شہادت پر کسی کو ملزم یا مجرم نہیں

مان سکتی، اور گواہ بھی وہ خود الزام لگاتے والے کے ساتھ ملازم ہوں۔ لیکن اس دن کی تقریب اور تمہاری دوست کی اس تقریر کے بعد اب حالات بدل گئے ہیں

رہے۔ اب اس یونیورسٹی کا الزام ستر فیصد پہلے ہی درست مان لیا گیا ہے۔ لندن انتظامیہ بہت چڑکھا ہو گئی ہے۔ وہی یہی کسر تشدد کے ان اکاؤنٹات

نے پوری کر دی ہے۔ ایسے موقع پر چاہے پولیس تمہارے خلاف کوئی ایکشن لے یا نہ لے لیکن ساتھ وہ ہر حال میں تمہاری یونیورسٹی انتظامیہ کا ہی

دے کی۔ اس وقت تم یونیورسٹی اور پولیس دونوں کے لیے ایک سا خطرہ ہو۔“

پارک نے تفصیل سے مجھے تمام صورت حال کا جائزہ کر کے بتا دیا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں اپنے آئندہ کسی بھی اقدام کے سلسلے میں آگاہ رکھوں گا۔ پارک میرا کندھا تھپتھا کر آگے بڑھ گیا۔ سارہ، ربیکا، جم و غیرہ میں سے کسی کو میری آنچ یہاں سر آئزک کے سامنے غشی کا پتہ نہیں تھا۔ وہ سب کے سب اس وقت یہاں جمع ہوئے۔ میں نے دانستہ طور پر خود بھی انہیں اس اچانک کال کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ میں اس انگوٹری کے نتیجے سے پہلے ہی سے بخوبی واقف تھا۔ بلا خرم آئزک نے اپنا مقصد کسی نہ کسی طور حاصل کر لی لیا تھا۔ میرا وہن تیزی سے آگے آتے والے وقت اور حالات کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ کامران کو میں نے فون کر کے یونیورسٹی کے فیصلے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ آنچ ہی دوچار اچھے وکیلوں سے اس سلسلے میں بات کر لے گا۔ آج سر آئزک اور ان کے دو پروردہ بیویوں کے امرا طبع نے میرے خلاف باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا تھا مجھے میرے خیالات کی سزا دی جا رہی تھی۔ مجھے ان کی نئی نسل کو سوچ کے راستے پر ڈالنے کی سزا دی جا رہی تھی۔ یہ سزا دینے والے صرف سر آئزک ہی نہیں تھے، ان کا تو صرف ایک چہرہ تھا جو مجھے دکھائی دے رہا تھا یا ان کا نمک خوار پیڑ۔۔۔ جس کا کاندھا ان لوگوں نے استعمال کیا تھا۔ اصل میں تو اس سادش کے پیچھے لندن کا ہر رنگ تھرا اور کس بیوی شامل تھا جو وہاں ایک معمولی سے لڑکے کی جرأت پر ان سب کا تو خون ہی کھول اٹھا ہو گا جس نے وقت کے اس بہت سے بڑے سرمایہ دار طبقے سے ٹکر لینے کی جرأت کی تھی۔ وہ مجھے اب عبرت کی مثال بنا دینا چاہتے تھے۔ تاکہ ایسی جرأت پھر دوبارہ اور کوئی نہ کر سکے۔ لیکن مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ سارہ کی زبانی میرا پیغام لندن کے کئی کوچوں میں پھیل چکا تھا اور اب یہ بات چل نکلی تھی۔ مجھے اس لمحے سارہ بے حد دیا آیا۔ کیا ڈیٹا میں جگ کا دامن تھا جسے وہ ان ایسی متوالی لڑکی کو فنی اور دھکتی ہے۔۔۔؟

☆☆☆

## لحاف

**عصمت چغتائی** اردو زبان میں افسانہ نگاری کے حوالے سے ایک بڑا اور معتبر نام ہے۔۔۔، متشکی طرح عصمت کا قلم بھی معاشرے کے حساس موضوعات کی نشاندہی کرتا رہا اور اس پر بھی اکثر اوقات قس نگاری کا الزام لگتا رہا۔ لیکن اسکے باوجود عصمت چغتائی کے افسانے اور ناول اردو ادب کا لازمی جزو ہیں۔ **لحاف** عصمت کے 11 بہترین منتخب افسانوں کے مجموعہ کا نام ہے، اس میں جوانی، لحاف، جلی لڑکی، بانہی، ایک شوہر کی خاطر جی واپس، عورت، خریدہ لود، بہو بیٹیاں اور ڈاکٹرن افسانے شامل ہیں۔ افسانوں کا یہ مجموعہ بہت جلد کتاب گھر پر پیش کیا جائے گا، جسے افسانے نگار میں پڑھا جائے گا۔

حلتے حلتے

شام تک سب سے پہلے سرائزک کے ذریعے سارہ کو اور پھر سارہ کے ذریعے ربیکا، جم، ڈیوڈ، شینا اور جانے کس کس تک یہ بات پہنچی ہوگی مگر مجھے یونہی دھڑکی سے نکال دیا گیا ہے۔ وہ سب کے سب کامران کے قلیت پر جمع ہونا چاہ رہے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ یہاں کچھ ہی دیر میں وہ ملز ہاڑی ہوگی کہ جگہ کم پڑ جائے گی۔ اس لیے میں نے ربیکا کو کہا کہ وہ ان سب کو لے کر کامران کے ریسٹورنٹ پہنچی جائے۔ لیکن سارہ نے میری بات مانتے سے انکار کر دیا اور اس نے مجھے گھر سے لے کر کامران کے ریسٹورنٹ جانے کا فیصلہ بنا دیا۔ میں جانتا تھا کہ سارہ سے مزید بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مجھے اس کی واقعی حالت کا بھی اندازہ تھا۔ لہذا میں پچھلی ہی راہ میں اپنی سفید جین کے اوپر نیوی بلیوز سوتیلے سے نیچے کھینچ کر ہاتھ لگا کر سارہ کی گاڑی کا ہارن بجا اٹھا۔ جلدی سے جرتے چروں میں ڈالے اور نیچے پہنچا تو سارہ پر بیٹھان سی اپنی سفید جینل سیٹ موجود تھی۔ اس کی آنکھوں سے لگنا تھا کہ وہ روئی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے گہرے رنگ کا دھوپ کا چھترہ آنکھوں پر لگا لیا حالانکہ دھوپ تو اب ڈھل چکی تھی۔ میں نے پچھلے چپ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سڑک کے کونے پر ایک کشش گھنٹا رہ جانے والی لڑکی یعنی ابھی تک موجود تھی۔ اس نے مجھے شاید سارہ کی گاڑی میں بیٹھنے ہوئے دیکھ لیا تھا اس لیے گاڑی جیسے ہی اس کے قریب پہنچی وہ جلدی سے آگے بڑھ آئی۔ اس کے ہاتھ میں گلاب کی دو ٹوپیاں تھیں جو اس نے مجھے اور سارہ کو پیش کر دیں اور مسکرا کر بولی۔

<sup>66</sup> "قاری سنو" *Qari Sano*

میں نے مسکرا کر اس سے پھول لے لیا اور جیب سے اُسے چند روپے نکال کر دینے کے لیے آگے بڑھائے، لیکن اُس نے مسکرا کر میرا ہاتھ روک دیا اور اچھی ٹوٹی پھوٹی انگلیوں میں بولی۔

”نہیں۔۔۔ یہ میری طرف سے ہے۔۔۔ آپ کے لیے بھی۔۔۔ اور بادام کے لیے بھی۔۔۔“ سارا نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

”ہوں۔۔۔۔۔ تمہارے چاہتے والوں کی گفتی پوری نہیں ہو پاتی۔۔۔۔۔ جہاں جاتے ہو اپنا جادو کھیر دیتے ہو۔۔۔۔۔ اپنی گلی میں بھی کافی مقبول ہو۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔“

تمہیں سارو کی بات سن کر مسکرا دیا۔

”تم ساتھ ہونا۔۔۔ اس لیے لوگ خصوصی اہمیت دے رہے ہیں۔۔۔ یہ میرے نہیں۔۔۔ تمہارے جادو کا اثر ہے سارہ میڈم۔“

گاڑی کی شہر کی مصفا فاقی سڑک کے راستے پر ڈال دیا۔ یہ راستہ درمیان شہر کی گلیوں والے راستے سے بہت لمبا تھا لیکن اس وقت دفتروں سے چھٹی کی وجہ سے سڑکوں پر اس قدر گھم تھا کہ ہم اس شہر سے باہر والے راستے سے کہیں جلدی کرنا لگا اسکا اثر تک پہنچ جاتے جہاں سے تیسری سڑک کے بہت بڑے اور سڑک سے بھی چوڑے فٹ پاتھ کے کونے پر کامران کار میٹورنٹ موجود تھا۔ آپ ہماری گاڑی ٹیڑھ کر رہ کر پل سے گزر رہی تھی۔ دُور سورج کی آخری کرنیں پل کی بڑی بڑی برجیوں کی نوکلی چوٹیوں کو چوم کر اُلودا ج کہہ رہی تھیں۔ دریا میں پھلے سونے کی لمبی لمبی تاریں حیر رہی تھیں۔ کار اس طویل پل کو پار کر کے اب پل کے ساتھ دوڑتی، پل کھاتی، کالی لمبی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ سارہ نے کچھ دُور جا کر دریا کے کنارے گاڑی روک دی اور گاڑی سے نکل کر سڑک کی ڈھلان پر بنی ہوئے اس لمبی ہی پٹی کے قریب چاب کھڑی ہو گئی جو دریا کنارے سڑک کے ساتھ ساتھ دوڑ تک پل کھاتی چلی جا رہی تھی۔ سورج اب ڈوب چکا تھا لیکن شمع کی لالی اب آسمان پر تاریں رنگ سمجھ رہی تھی۔ یہ تاریں رنگ جب دریا کنارے بڑی برف کی پٹی پر پڑتا تو جیسے اپنے محلے میں آنے والے گولے لگنے والی کیا دے جاتی تھی۔ وہ بھی تو ایسے ہی سفید برف کا گولہ بنا کر اس کے اوپر شمع کی پتکوں میں بکھری ال، نیلی، پیلی اور تاریں رنگ کی شربت اظہیل کر گولہ ہمارے حوالے کر دیتا تھا اور پھر ہم سب بچے دریا تک مزے لے لے کر وہ برف کا گولہ پکڑتے رہتے تھے۔

سارہ کچھ دیر چپ چاپ کھڑی خاموش رہی یا کہہ جتے پانی کو دیکھتی رہی۔ اس نے اب بھی اپنی آنکھوں سے وہ گھرے رنگ کا کالا چشمہ نہیں اُتار تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اس چشمے کے نیچے اس کی کتنی پگھلیں اب بھی تنگی ہوئی تھیں۔ پھر ہانا خراس نے خود ہی یہ خاموشی توڑی۔

”پاپا نے اچھا نہیں کیا۔۔۔ میں انہیں اتنا کمزور نہیں سمجھتی تھی۔ انہوں نے میرا بھرم توڑ دیا ہے۔ وہ ایک کمزور شخص نکلے میڈی۔۔۔ میں۔۔۔ میں بالکل ٹوٹ گئی ہوں۔“

ہانا خراس کے مہر کا بند ٹوٹ گیا اور وہ جگہ جگہ کر دینے لگی۔ اس نے اپنے اندر بائیس سالوں سے جس باپ کا بند سب سے اُدھنی جگہ پر سہا کر رکھا ہوا تھا۔ شاید آج دھت پاش پاش ہو گیا تھا۔ میں نے سارہ کی آنکھوں سے اس کا چشمہ اُتار دیا۔۔۔ تاریں انگلیوں اور پتھلیوں سے اس کے ہتھے آنسو صاف کیے اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لیے۔

”تم دنیا کی سب سے مضبوط لڑکی ہو مس آؤزک۔۔۔ تمہارے یہ ہتھے آنسو تمہیں کمزور نہیں بنا سکتے۔ ابھی تمہیں زندگی میں ایسے اور بہت سے تجربے سے گزرنا ہوگا۔ اور اس وقت شاید میں تمہارے دوستوں میں سے بھی بہت سے تم سے اُور ہوں گے۔ اس لیے خود کو ابھی سے سنبھالو سارہ۔۔۔ میں تمہیں یوں کمزور پڑنے نہیں دیکھ سکتا۔

سارہ اب بھی سسک رہی تھی۔

”نہیں داد۔۔۔ میں اتنی طاقتور نہیں ہوں، مجھے اتنا بڑا مقام نہ دینی نظروں میں۔۔۔ اتنی ہماری ذمہ داری نہ ڈالو میرے کانڈھوں پر۔۔۔ میں تو بہت کمزور لڑکی ہوں۔۔۔ نہیں بھاپاؤں گی یہ سب کچھ۔۔۔ نہیں بھاپاؤں گی۔“

”تمہیں بھانا ہوگا۔۔۔ تم ہی بھاناؤ گی۔۔۔ یہ نہیں جانتا ہوں۔“



ریسٹورنٹ کے باہر فٹ پاتھ پر لگی کرسیوں پر ہی ٹپک گئے۔ اندھیرا ہو چکا تھا اور چند محسوس اسٹریٹ لائٹس پر کامران کا ریسٹورنٹ موجود تھا اب جگہ گانے لگی تھی۔ کافی کی خوشبو آس پاس بکھرنے لگی تھی۔ جہاں دیہ دیوڑھے سگار سلگائے کبھی نہ پہنچنے والے مسئلوں پر بات کرنے کے لیے فٹ پاتھ پر بیٹے ریسٹورنٹس میں لگی کرسیوں پر بیٹھ رہے تھے۔ چلتے سگاروں کی سبک سے سماں دھواں دھار ہونے لگا تھا۔

کبھی کبھی مینیں سوچتا ہوں کہ اگر دن کے چوتھے پہروں میں شام کا پہرہ ہوتا تو ہماری زندگی کتنی بے درد لگتی۔۔۔ ایک غلام سورت شام دوستوں کا ساتھ چھلتی خوشبو نہیں۔۔۔ یہ سب کتنی بڑی نعمت ہیں۔۔۔ ہماری زندگی میں کیسی کیسی نعمتیں ہیں جن کا ہم شکر تو دور کی بات ہے ٹپک گئے کسی احساس بھی نہیں کر پاتے۔۔۔ آج مجھے احساس ہو رہا تھا کہ شاعروں نے دیوان کے دیوان صرف اس ایک شام پر کیوں لکھ مارے ہیں۔

میرے تمام کلاس فیلوز بے حد ہجرے ہوئے تھے۔ جم کھل گئے تھے شہر کی مرکزی شاہراہوں پر مظاہرے کرنے کا شینڈل ملے کر رہ رہا تھا، ہر ایک ایک میز پر چڑھی تھری کر رہی تھی کہ جو نیورسٹی انتظامیہ نے مجھے بے دخل کرنے کے بعد جو نیورسٹی صرف اس لیے بند کر دی ہے تاکہ ان کے جھوٹ پر پردہ پڑا رہے۔ آس پاس کے کثرت پاتھ ریسٹورانوں کی میزوں پر بیٹھے بوڑھے بھی اب بیک کی تقریریں دیکھ رہے تھے اور عام اسٹوڈنٹس کے ساتھ گرجوٹی سے تالیاں بجا رہے تھے۔ تمام طالب علموں نے غیر معینہ مدت کے لیے جو نیورسٹی سے بائیکاٹ کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سارہ ان کو یہ سمجھانے میں لگی ہوئی تھی کہ انہیں جو بھی قدم اٹھانا ہے بہت سوچ سمجھ کر اور قانون کے دائرے میں رو کر اٹھانا ہوگا تاکہ جو نیورسٹی انتظامیہ کسی بات کا فائدہ نہ اٹھا سکے، لیکن اس وقت ان سب کے جذبات اس قدر بھرے ہوئے تھے کہ دوسرا وہ کی بات بمشکل ہی سمجھ پارہے تھے۔ ابھی یہ ہنگامہ جاری ہی تھا کہ مینیں نے نیلی جی چھت پر سہائے تین نیلی سفید کاروں کو چند روپوں لگی میں داخل ہوتے دیکھا۔ یقیناً یہ پولیس کی گاڑیاں تھیں جن کی آواز والے سائرن بند کیے گئے تھے۔ گاڑیاں ریسٹوران سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئیں۔ اگلی گاڑی میں سے پار کر اپنی جگہوں کے گلیس کھینچتے ہوئے باہر نکلا اور مجھے دیکھتے ہی ڈور سے ہی اس نے گرجوٹی سے ہاتھ ہلایا۔ دیگر لڑکے لڑکیوں نے کڑی نگاہوں سے ان سب سادہ ووردی والے پولیس آفیسرز کو گھورا اور لندن پولیس کے خلاف بھی نعرے بازی کی۔ مینیں نے ہاتھ کے اشارے سے ان سب کو روکا۔ پار کر چھوٹ چکا ہوا میرے قریب پہنچ گیا۔ اس نے مجھ سے اور سارہ سے ہاتھ ملایا ہم تینوں ایک کونے والی میز پر بیٹھ گئے۔ اسٹوڈنٹس پھر سے اپنے پڑانے میں بیٹھ گئے۔ پار کر نے غور سے تمام طلباء اور ان کے جوش اور جذبے کو دیکھا۔

”ایک ہی دن میں یہ ہماری دوسری ملاقات ہے۔ اور مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ دونوں مرتبہ تم نے اپنے بے حد مضبوط ہونے کا مجھے احساس دلا ہے۔ جس طرح سے تمہارے صرف ہاتھ کھڑے کرنے پر یہ سارا ہجوم ٹپ ہو گیا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وقت پڑنے پر یہ تمہارے کہنے پر کسی دریا میں بھی بخوشی چھلانگ لگا دیں گے۔“

اس سے میرا دم سب کے لیے کافی کے کپ میز پر رکھ گیا۔ ساتھ ہی کچھ ٹھیک ٹھیک اور جھڑپاں بھی تھیں۔ پار کر نے ایک جھڑپا اٹھا کر منہ میں رکھی۔ سارہ حیرت سے اس کی اور میری بے تکلفی کو دیکھ رہی تھی۔ مینیں نے سارہ کا انخاف کر دیا۔

”یہ میٹر پار کر ہیں۔ لندن کی خفیہ پولیس کے سیکشن انچارج۔۔۔ اور یہ سارہ آئزاک ہیں۔ میری ہم جماعت۔“

”میں ان سے واقف ہوں۔ بلکہ آج کی تاریخ میں لندن کی پولیس اور انتظامیہ میں شاید ہی کوئی بدقسمت ایسا ہو جس آنکھ سے واقف نہ ہو۔“

”آپ بے فکر ہیں مسٹر پارکر۔۔۔ میں اور سارہ اسی لیے یہاں آئے ہیں ان سب کو کسی بھی غلط قدم اٹھانے سے روک سکیں۔ لیکن آپ یہاں کیسے؟“

پارکر مسکرایا۔

”اب تو جہاں تم وہاں ہم۔۔۔ مجھے خصوصی طور پر تم پر نگاہ رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ تمہارے مداحوں کی تعداد دیکھ کر لگتا ہے کہ اوپر والوں کی پریشانی اپنی جگہ ٹھیک ہی ہے۔“

سارہ کے ہاتھ میں کافی کا کپ بہت دیر سے یونہی چھوا ہوا تھا۔ کافی کی اٹھتی جھاپ کے عقب سے اس کی دو دو گہری آنکھیں جانے کس سوچ میں ڈوبی نظر آ رہی تھیں۔ پارکر نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ کچھ پریشان نظر آ رہی ہیں مس آنکھ۔۔۔ شاید اپنے دوست کے لیے۔“

سارہ نے چونک کر پارکر کو دیکھا۔

”حماد بے قصور ہے۔۔۔ اُسے ناکردہ گناہ کی سزا دی جا رہی ہے۔“

پارکر نے دوسری میشری منہ میں ڈالی۔

”انتظامیہ کا سب سے بڑا گناہ، انقلاب کی ترغیب ہی ہوتا ہے۔ پچھلے زمانوں میں ایسے گناہ گاروں کو سولی پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ حاکم کے نزدیک لوگوں کی سوچ بدلنے سے بڑا گناہ بھلا اور کیا ہو سکتا ہے اور حماد بھی اسی جرم کا مجرم ہے۔“

”اگر حماد کا لڑم بچہ کسی انقلاب کی ترغیب تھا تو تمہیں بھی تو اس میں برابر کی شریک ہوں۔ تمہیں نے بھی وہی گناہ کیا ہے۔ پھر مجھے کیوں سزا نہیں دی جا رہی۔۔۔؟“

”مزا تو آپ کو بھی دی جا رہی ہے مس پارکر۔۔۔ آپ کے دوست کو آپ سے ڈور کر کے۔۔۔ آپ کے چہرے پر یہ بے چینی، یہ اداوی بلا ہے جو نہیں ہو سکتی نا۔“

جانے پارکر نے یہ بات دانستہ کی تھی یا نادانستہ طور پر اس کے منہ سے یہ سچ نکل گیا تھا۔ سارہ بھر دہاں بیٹھ نہیں پائی کیونکہ شاید وہ اپنی اندرونی حالت پارکر پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ معذرت کر کے دہاں سے اٹھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد پارکر نے میری جانب دیکھا۔

”تم بہت خوش قسمت ہو مسز حماد۔۔۔ تمہیں سارہ جیسی دوست کا ساتھ ملا ہے۔۔۔ ملاوٹ اور بے ایمانی کی اس دنیا میں ایسے سچے رشتے اور سچے بندے کم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ تمہیں تمہیں یہ ہانے آیا تھا کہ پیڑنے کا قاعدہ تحریری طور پر تمہارے خلاف درخواست جمع کروادی ہے۔ لیکن تمہیں نے چیف کو یقین دلایا ہے کہ سچ تم سے ملاقات کے بعد میرے تم سے متعلق تمام گھٹشات ڈور ہو گئے ہیں لہذا تمہیں قاعدہ بلوا کرتا

سے جواب لینے کی چھان ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ہماری اطلاع کے مطابق لندن کے معاملات میں اور قرب و جوار کی یہودی بیٹیوں میں بے چینی بڑھ رہی ہے۔ یہودی تمہاری یہاں موجودگی کو اپنی غی نسل کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ ان کے ایک خاص نمائندے آئزاک کی بیٹی بھی تمہارے ساتھ وفاداری کا بھرم رکھنے والوں میں سب سے آگے کھڑی ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے ایک بڑا چیلنج اور بڑی تھجیک کی بات ہے۔ فی الحال لندن انتظامیہ نے معاملات کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے لیکن مجھے شک ہے کہ یہودی طبقہ تشدد اور توڑ پھوڑ کا راستہ اختیار کر کے اس معاملے کو بگاڑنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ سارہ کے تمہارے ساتھ ہونے کی وجہ سے شاید وہ براہ راست تو تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔۔۔۔۔ لیکن مجھے آس پاس تمہاری نسل کے مزدور اور عام محنت کش طبقے کے نقصان کا بے حد خطرہ ہے۔ وہ ان غریب لوگوں پر اپنی بھڑاس اس رات کی طرح آسانی سے نکال سکتے ہیں۔“

مجھے پارک کی بات نے بے حد پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ میری وجہ سے کوئی دوسرا غریب مسلمان سزا کیوں نہ سکتے۔ پارک ٹیک کہہ رہا تھا۔ انہوں نے سارہ کی تقریر والی شام بھی اخبارات نکلنے کے بعد رات کو کا کا کا علاقوں میں وہاں کے درہنشی مسلمانوں کو ہراساں کرنے کی کوشش کی تھی اور چند جگہوں پر تشدد بھی کیا گیا تھا۔ یہ آگ دھیرے دھیرے مزید بھڑک بھی سکتی تھی۔ لندن انتظامیہ اور پولیس کی توثیش بے جا نہ تھی۔ میں نے پارک سے ہی سوال کیا۔

”آپ کے خیال میں ان کے اس غصے کا راستہ روکنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ میں اسی طرف آ رہا تھا۔ قانونی طور پر تمہاری پوزیشن بہت مضبوط ہے کیونکہ تم نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا جس کا یہاں نہ لے کر تم پر ہاتھ ڈالا جاسکے۔ بلکہ لندن پولیس کے لیے تم باہر رہ کر اتنے خطرناک نہیں ہو جتنا اندر جا کر ہو جاؤ گے۔ کوئی بھی اچھا وکیل گرفتاری سے قبل بھی تمہاری ضمانت منظور کروا سکتا ہے۔ اس لیے ہم ان خطوں پر سوچ ہی نہیں رہے۔ لیکن میں اس وقت لندن انتظامیہ کی طرف سے تمہارے پاس ایک رضا کارانہ اپیل لے کر آیا ہوں۔

”رضا کارانہ اپیل۔۔۔۔۔؟“ میں نے حیرت سے دہرایا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میں انتظامیہ کی طرف سے تم سے یہ اپیل کرنے آیا ہوں کہ اس سے پہلے کہ یہ چنگاری فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں بھڑک اٹھے۔۔۔۔۔ تم کچھ عرصے کے لیے لندن چھوڑ دو۔ خود اپنی مرضی سے۔“

میرے سر میں دھماکا سا ہوا۔

”لندن چھوڑ دوں۔۔۔۔۔ لیکن کیوں۔۔۔۔۔ اور اس سے فائدہ کیا ہوگا؟“

”بہت بڑا فائدہ ہوگا۔ بھڑکے ہوئے یہودیوں کو فساد کا کوئی بہانہ نہیں مل پائے گا۔ دوہم کوئی اصل خطرہ سمجھتے ہیں۔ تمہارے ہانے کے بعد ان کے اندر کا خوف اور دشمنی خشنی پڑ جائے گی۔۔۔۔۔ دینے بھی یوں خود کشی نے جنمیں فی الحال واپس واپس لے لی گئی ہے۔ تم اگر چاہو تو لندن سے باہر رہ کر بھی یوں خود کشی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکتے ہو۔ یہاں رہو گے تو تمہارے ساتھی طلباء دھیرے دھیرے بھڑک کر لندن کی سڑکوں پر آ جائیں گے اور اس کا نقصان دوسرے لوگوں کو ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا مقصد طلباء کی طاقت کو منفی انداز میں استعمال کرنا نہیں



ہے کیونکہ اگر تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ کب کی یوندر ٹٹی کی امانت سے امانت بھانپکا ہوتا۔ لیکن میرا یقین کرو۔۔۔ تمہاری امانت میں سوچو گی بہت سے بے گناہوں اور معصوم انسانوں کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتی ہے۔ میری بات پر غور کرنا۔۔۔ مجھے تمہارے جواب کا انتظار ہے گا۔“

پارکر مجھے گہری سوچ میں چھوڑ کر وہاں سے اٹھ گیا۔ سارہ بہت دیر سے ڈور ٹیٹی ہم دونوں کو بات کرتا دیکھ رہی تھی۔ پارکر کے جاتے ہی وہ اٹھ کر میرے پاس آئی اور پوچھنے لگی کہ کیا معاملہ تھا۔ میں نے پارکر کی تمام بات ”اٹھ“ سے لے کر ”ہی“ تک اسے سنادی۔ سارہ نے فحشی سے غلی میں سر ہلایا۔

”نہیں۔۔۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ جو بھی ہوگا ہم سب مل کر اس کا سامنا کریں گے۔ میں جانتا تھا اس وقت سارہ کو کچھ بھی سمجھنا بہت مشکل ہوگا۔ اس لیے میں چپ رہا، وہاں ریکا پار ہار ایک میز پر چڑھی میرا نام پکار رہی تھی کہ میں آ کر اپنے ”زیریں خیالات“ کا اظہار کروں، میں نے ان سب کے درمیان جا کر انہیں بڑی مشکل سے اس بات پر آمادہ کیا کہ فی الحال ہمارے پاس قانون اور عدالت کا راستہ موجود ہے اور نکلا ہے لہذا اس وقت احتجاج کو سو خر کر دینا ہی بہتر ہوگا۔ جب میں نے ان سب سے کہا کہ میرے لیے یوندر ٹٹی کی ڈگری سے کہیں زیادہ اہم ان سب کی دوستی ہے۔ محبت ہے جو مجھے آج حاصل ہے تو سب ہی افسروں ہو گئے۔ ریکا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے ہم کو تھوڑی سی طور پر علیحدہ کر کے

لے جا کر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تمام کر اس سے وعدہ لیا کہ وہ خود کو کبھی اور اپنے ساتھ تمام دوسروں کو کبھی قابو میں رکھے گا۔ ہم کو سمجھنا ناواقفی ایک مشکل کام تھا لیکن جب میں نے اسے پارکر کی بتائی ہوئی ساری باتیں کہیں اور اسے سمجھایا کہ ہمارے اس احتجاج اور میڈیا بیٹھنی کو ہماری مخالف پارٹی معصوم لوگوں پر تشدد کرتے کے خلاف استعمال کرے گی تو اس کا قصہ کچھ ٹھنڈا ہوا۔ گریب جذباتی نوجوان تھا یہ ہم بھی۔ اسے دیکھ کر اور اس سے مل کر مجھے جیسے عبادی یاد آ جاتی تھی۔ وہ بھی ایسا ہی تھا میرا سارا دوسروں کی خاطر سب کچھ اٹانے والا۔ جاتے ہوئے ہم نے بہت دیر تک مجھے

گلے لگائے رکھا، سب ہی فرماؤ راقدا مجھ سے رخصت ہوئے۔ ریکا نے چاہے ہوئے جانے سارہ کے کان میں مجھے دیکھ کر کیا کہا کہ سارہ ہنس پڑی۔ ریکا بھی ہم سے رخصت ہو گئی۔ جاتے جاتے اس نے اچانک میرا پیروا اپنے ہاتھوں میں تمام کر میرے ماتھے کو چوم لیا، اور ہم چلوں کے ساتھ وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ کسی انسان کی معراج اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ کوئی انسان اسے ٹوٹ کر چاہے۔ اپنے دن اور رات اس کے نام کر

وے۔۔۔ آج مجھے ایک لمحے میں ہی خدا کی کامطلب سمجھ میں آ گیا تھا۔۔۔ جب ایک انسان کا بچا آپ کو اس احساس سے دو چار کر سکتا ہے تو ازل سے لے کر اب تک آنے والوں انسانوں کی بندگی کا احساس کیا ہوتا ہوگا۔ آج میں نے جانتا تھا کہ خدا کو بندگی اس قدر پسند کیوں ہے۔

واپسی پر میں نے آتے ہوئے گاڑی میں سارہ سے پوچھا کہ ریکا نے اُسے چاہے ہوئے کان میں کیا کہا تھا۔ سارہ کے ہاتھوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”کبہ رہی تھی یہاں سے میدانے گھر ہی میڈی کو ڈراپ کرنا۔۔۔ کہیں گھر سے نہ نکل جانا۔“

مجھے بھی ہنسی آ گئی۔

”پھر تم نے کیا کہا۔“

”میں نے اس سے کہا کہ میں اتنی بے خوف نہیں ہوں کہ ایسا موقع ہاتھ سے جانے دوں۔“ ہم دونوں ہی ہنس پڑے۔ سارہ نے ہانپٹ

پارک سے دائیں کوڑھتے والی چوڑی سڑک پر گاڑی موڑ لی۔ ڈور پکاڑی سرکس کے بڑے بڑے جھولوں کی روشنیاں جھللاتی نظر آ رہی تھیں۔ نہیں نے سوالیہ نظروں سے سارہ کی طرف دیکھا۔

سارہ مسکرائی۔

”رات کے دس بجے ایک اچھی میز بان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہم سفر کو کھر چھوڑنے سے پہلے رات کے کھانے کا ضرور پوچھے۔ یہاں میری پسند کا ایک ریسٹوران ہے کیا تم میرے ساتھ وہاں ڈنر کرنا پسند کرو گے؟“

”ہاں۔۔۔ ضرور لیکن اس شرط پر کہ کل میں ادا کروں گا۔ واصل آتے ہوئے میں کامران کا بوجہ اٹھا کر لے آؤں گا۔ اسی طرح واپس کروں گا تو اس کے دل کو بہت نہیں لگے گی۔“

سارہ نہیں دی اور گاڑی ایک لمبا سا موڑ کاٹ کر جیسی روشنیوں والے اس ریسٹورانٹ کے باہر آ کر کھڑی ہو گئی۔ سارہ کی پسند بھی عام ہو نہیں سکتی تھی۔ مجھے ہال میں داخل ہوتے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ نہایت غناست سے ڈور ڈور کی ہوئی۔ ہم روشنیوں سے بھرگانی میزوں والے اس طویل و عریض ہال میں جس کے ایک جانب کلاڑی کا بہت بڑا سافرش (ڈانس فلور) اور باڑ بھی موجود تھا۔ عام لوگ نہیں آتے ہوں گے۔ سارہ کو وہاں کا اعلیٰ شاپا اچھی طرح جانتا تھا۔ جیسی انہوں نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اس کا ہتھکڑا استہلال کیا اور جیسی مس آؤٹ کر کے کہنے کہتے تھک نہیں رہے تھے۔ سارہ نے ہال کی ایک جانب گلی خوبصورت سی میز بیٹھنے کے لیے پسند کی۔ ہال میں بچے سروں میں میرے لڑکپن کا پسندیدہ گانا ”چھپکے کرکس میں نے تمہیں اپنا دل دے بیٹھا تھا“ کی دھن بج رہی تھی۔ چند جوڑے فلور پر ایک دوسرے کی پانیوں میں پانیوں ڈالے دینا دیا دینا سے بے خبر اپنے محبوب کے شانوں پر سر رکھ کر جھوم رہے تھے۔ مغربی موسیقی اگر بچے سروں میں ہو تو کبھی کبھی مشرقی موسیقی سے بھی زیادہ کانوں کو بھلی لگتی ہے۔ جانے کیوں مجھے چیتنے چنگھاڑنے کاغے اور موسیقی کبھی بھی نہیں بھائی تھی۔ ہماری میز پر رکھی دو جھمیں روشن کر دی گئی تھیں اور ان کی لوہیں سارہ کا کندھانہ رنگ مزید دیکھنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر بال بکھر کر سے جاتے تھیں وہ پھر سے سنار نے کی تنگ دود سے تھک سی گئی تھی۔ بے خیالی میں اس کی مجھ پر نظر پڑی تو اچھی اس معصوم سی حرکت پر خود ہی مسکرا دی۔ اس کی ستارہ آ نکھیں بار بار دم ہونے کی کوشش کرتی لیکن وہ بڑی صفائی سے اس فنی کاراستہ روک لی جیسی۔ بہت دیر تک ہم یونہی خاموش بیٹھے رہے۔ چارٹس نے ہی خاموشی کو توڑا۔

”ایک اچھی میز بان کا فرض صرف کھانا کھانا ہی نہیں ہوتا بلکہ اچھی اچھی باتیں کر کے اپنے ہم راہی کا دل بہلانا بھی ہوتا ہے مس سارہ آؤٹ۔“

”تم ہی کچھ بولنا۔۔۔ میں تم جیسی باتیں کہاں کر سکتی ہوں۔۔۔ مجھے تو صرف تمہیں منانا اچھا لگتا ہے۔ حصارے ہوتوں سے سنی ہوئی ہر بات نئی لگتی ہے، خوبصورت لگتی ہے۔“

”یہ میری باتوں کا نہیں۔۔۔ تمہاری خوبصورت سماعت کا احساس ہے جو تمہیں میری عام سی باتیں بھی شاعری میں دھلی لگتی ہیں۔“

”تم کبھی کسی بات کا بھی کر پٹ کیوں نہیں لینا چاہتے۔۔۔ اقرار کر لینا دل کو بہت سی فنی الجھنوں سے بچاتا ہے۔ کیا کبھی مشر

میڈی۔۔۔؟۔۔۔ مان لیتا اسی سکون کا باعث ہوتا ہے۔<sup>۱۴</sup>

آج سارہ کے لہجے میں کوئی نئی بات تھی۔۔۔۔۔ کچھ یابن تھا۔۔۔

”میں۔۔۔ نہیں اقرار ہے کچھ نہیں رہا۔۔۔ ذی کسی بات کا کریڈٹ لینے سے دامن بچا رہا ہوں۔ لیکن سچ بھی ہے کہ میرے اندر آج اگر حصے کوئی بھی خوبی نظر آئی ہے۔۔۔ میری ذات میری شخصیت۔۔۔ میری باتوں میں کوئی خوبصورتی نظر آتی ہے تو اس کی وجہ

میں نہیں۔۔۔ بلکہ ایمان ہے۔۔۔ اس کے بخشنے ہوئے پیار کا احساس ہے، پیار انسان کو پیارا بنا دیتا ہے سارہ۔۔۔ اس کے اندر سے تمام بُرائیاں نکال دیتا ہے۔۔۔ محبت انسان کے لہجہ کا زہر بکس لیتی ہے۔۔۔ اس کی باتوں میں معصی گھول دیتی ہے۔۔۔ آنکھوں سے شہد چکا دیتی ہے۔۔۔ محبت انسان کو انسان نہیں رہنے دیتی۔۔۔ مری فراو بنا دیتی ہے۔۔۔“

سارہ خود سے میری طرف دیکھتی رہی۔۔۔۔۔ میری ہاتھیں جیسے اپنی آنکھوں سے سُن رہی ہو۔۔۔۔۔ جذبہ گرد رہی ہو۔۔۔۔۔ دہلزن آتی ہو کی آواز میں پولی۔

”شاید میں بھی انسان نہیں رہی ہوا۔۔۔ شاید میں بھی پری ازاد ہوتی چارای ہوں۔“

میں نے چونک کر سارہ کو دیکھا، اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور چپوں کی شبنم گزر کر سارے ماحول پر آؤں گی بارش کرنے والی تھی۔

”ہاں حواد۔۔۔ میں نے خود پر بے حد قابو پانے کی کوشش کی۔۔۔ بہت روکا خود کو۔۔۔ بہت لڑی ہوں خود سے۔۔۔ لیکن پھر بھی خود کو روک نہیں پائی۔۔۔ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے حواد۔۔۔ میں نے نہ چاہے ہوئے بھی محبت کا یہ ٹھکانہ ہر جگہ لیا ہے حواد۔۔۔ پورا یہ عالم خلق

موتی گمرے اور میز پر رکھی کتاب کی ایک پگھلری پر پرہیز کرے۔ وہ بڑی ہمت کر کے پھر بولی۔ اس کی نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔

”منیں جانتی ہوں۔۔۔۔۔ تمہارے دل کے اندر صرف اک خوش نصیب کا ہی بسرا ہے۔ وہ جو تمہاری روح کی گہرائیوں تک تمہارے اندر رہی ہوئی ہے۔ تم نے کبھی کسی سے یہ راز نہیں چھپایا کہ ایمان کی محبت تمہارے خون کے ذرڈن میں شامل ہے۔ کتنی بچی ہے تمہاری محبت۔۔۔۔۔ لیکن اس کے باوجود میرا دل کیوں نہیں مانتا حماد۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔ کیوں نہیں اس دل کے ہاتھوں اس قدر بے بس ہو گئی ہوں کہ خود میرا مجھ پر، میرے دن رات پر، میری روح پر اختیار نہیں رہا۔۔۔۔۔ میرے لفظ میرے نہیں رہے۔ میری ساری شخصیت میری نہیں رہی۔۔۔۔۔ اس محبت نے مجھ سے میرا سب کچھ چین لیا ہے حماد۔۔۔۔۔ اس سے کہو مجھے میرا آپ وہاں اٹھا دے۔۔۔۔۔ میری سانسیں مجھے وہاں سوہنے دے۔“

میںیں سارہ کی حالت سمجھ سکتا تھا۔ لفظ اس کے ہونٹوں سے اپنے آپ ہی پھیلتے جا رہے تھے۔ یہ سارا نہیں۔۔۔ سارہ کے اندر کی لڑکی بول رہی تھی۔ سارہ تو بہت خاموش بہت کم کڑی تھی۔ یہ تو پھر اسی محبت کا ایک اور تازہ ثبوت تھا جو اب اس معصوم لڑکی کی روح کو کچھ کے لگا رہا تھا۔ مجھے

کچھ نہیں آ رہا تھا کہ محبت کے اس صحرائی پیاس کب بجھے گی اور کتنے بے بسوں کی ولا چادروں کی روح کو اپنی ریت میں جذب کرے گا یہ صحرا؟ ازل سے انسانوں کے دلوں کے ساتھ یہ کیل کیل رہی ہے محبت۔ جانے کتنے جوان دل اس کی پیاس کی بیھوش چڑھ چکے ہوں گے اب تک۔۔۔؟۔۔۔ لیکن اس کی حرص پھر بھی نہیں مٹی۔ اب بھی ہر لمحہ ہر گھڑی کوئی نہ کوئی کہیں نہ کہیں کسی کی محبت میں جتا ہوا رہا ہوتا ہے۔ بلی کی طرح تڑپ رہا ہوتا ہے اور محبت ڈور گھڑی ان روح نکلنے دلوں کی یہ تڑپ اور یہ بے بسی دیکھتی رہی ہے۔

میں سارہ سے کچھ نہ کہہ پایا۔ کہتا بھی تو کیا کہتا؟ بس میں نے اس کے ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں تمام لیے۔ وہ میز کی دوسری جانب بیٹھ کر سر جھکائے بیٹھی رہی۔ بلی کی میٹھی میٹھی کی روشنی میں اس کی بیٹھی آنکھیں جگمگاتی رہیں۔ ہال میں بیٹھے سارا مندوں نے اسٹیوڈنٹ کالغز چمیر "ہلو۔۔۔۔۔ کیا تم میری ہی راہدہ کیڑہ ہے۔"

میں تمہاری آنکھوں میں دیکھ سکتا ہوں

میں تمہاری مسکراہٹ میں بھونک سکتا ہوں

کہ تم تجھا ہو۔۔۔۔۔

اور کہیں کوئی تمہاری محبت میں جتا ہوا رہا ہے۔"

اس ننھے کی دھن پر قہر کرتے جھڑوں کے قدم دھیرے دھیرے متحرک رہے تھے۔ پورے ہال کی مدھم روشنی میں دل کچھو جانے والی محبت کا راج تھا۔ خوشبو جی، رنگ تھوڑا نور تھا۔ سارہ پچ چاپ بیٹھی میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اسی ایک ہل کوئی رہی تھی۔ سیٹ رہی تھی۔ اپنی عمر کی نقدی میں جع کر رہی تھی کہ زندگی گزارنے کے لیے عمر کی نقدی میں ایسا ایک ہل بھی بہت ہوتا ہے۔ تمام عمر خرچ کرتے رہو، عمر ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس ہل کی پوچھی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ میں نے دھیرے سے سارہ سے پوچھا۔

"مجھے بتاؤ۔۔۔ تمہارے اس درد کو ختم کرنے کے لیے میں کیا کر سکتا ہوں۔ میری زندگی، میری ساری عمر پر تمہارا حق ہے۔ تم جو چاہو کی دیا یہی ہوگا۔"

سارہ دھجھ سے مسکرائی۔

"کاش محبت کا ہونا نہ ہونا بھی ہمارے بس میں ہوتا۔ کاش میرے پاس وقت کو پھٹنے کی طاقت ہوتی تو میں تمہیں تمہاری پہلی محبت سے پہلے ملنے کی کوشش کرتی۔ کاش جو عظمت تمہارے دل میں مجھ سے پہلے ایمان کی ہے۔ اس کی سب سے پہلی حق دار میں ہوتی۔ کاش میری محبت میں یہ "کاش" نام کا کوئی لفظ ہی نہ ہوتا۔ لیکن اس محبت کا الیہ ہی یہی ہے کہ اس کی ابتدا ہی کاش سے ہوتی ہے۔ تم میرے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو۔ تم نے اپنی پوری زندگی پر مجھے اختیار دے دیا ہے۔ اس سے زیادہ بڑی نعمت اس سے زیادہ بڑی مہربانی اور انعام کیا ہوگا۔ میری اس ایک زندگی کے لیے تو تمہارا یہ اقرار ہی کافی ہے۔ بس ایک وعدہ کرو مجھ سے، میں جانتی ہوں ایمان کی یاد تمہارے دل سے نابہر نہیں مٹ پائے گی۔ لیکن جب کبھی تم کسی اور کو اپنی اس ابدی محبت کا حصہ دار بنانا چاہو گے، تو میرا حق سب سے پہلے ہوگا۔ وعدہ کرو مجھ سے حوا۔۔۔۔۔ مجھے میرے ہونے کا مجرم دے دو،

میرے وجود کی تھم جاتی کرو۔“

میں نے سارہ کی نازک انگلیاں اپنی آستین میں تھام لیں۔

”میں وعدہ کرتا ہوں۔“

سارہ نے میرے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔ انہیں اپنی بند آنکھوں کے پتھڑوں پر بہت دیر تک جوڑے رکھا، جیسے کسی مسیحا کی تاثیر کو اپنی بند آنکھوں سے اپنے پورے جسم میں، اپنی روح میں دھیرے دھیرے پکڑ رہی ہو، میرا ب کر رہی ہو۔

سازندوں نے جارج مانگیل کا لفظ جیڑا۔

”لا پرواہ ہو گئیاں

میری سب سے اچھی دوست ہیں۔۔۔“

سارہ نے جیسا اپنی آخری خواہش ظاہر کی۔

”میرے ساتھ ایک بار قرض کرو گے۔۔۔۔۔“

سارہ کے معصوم انداز پر میرے دونوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔ ہم دونوں اٹھ کر کھڑی کے گول فرش کی جانب بڑھ گئے۔ سارہ نے میرے کانہ میرے ہاتھ رکھا اور اس کا دوسرا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ پھر بھی ہم دونوں ایک دوسرے سے مناسب فاصلے پر کھڑے نفعے کی دھن پر اپنے قدم فرش پر رکھتے رہے۔ سازندوں کے سربراہ نے جو ایک لمبا ٹیگر دھاوا پناہیٹ آتا رہ کر مجھے سلام پیش کیا۔ اور مجھے اشارہ کیا کہ اب جواز دے اور اس کا گروپ ہل کر بھاگیں گے، صرف میرے اور سارہ کے لیے ہوگا۔ پھر لمبے ٹیگر نے اپنے ساتھیوں کو کچھ اشارہ کیا اور نفعے کی دھن بدل گئی۔

(بیک اسٹریٹ ہوائز) ایک مشہور بینڈ کا لفظ گونجا۔

”یہ صرف لفظ ہی تو ہیں

جو میرے پاس ہیں، صرف لفظ۔۔۔۔۔“

جن سے میں تمہارا دل

چرائے جا رہا ہوں۔“

ہم دونوں کو یہ ای نہیں چلا کہ کب ڈانس فلور پر گھومتی ہوئی گول روشنی صرف مجھ پر اور سارہ پر آ کر ڈک گئی تھی اور اس پاس کے سبھی قرض کرتے جوڑے کھڑی کے گول فرش کے دائرے میں کناروں پر کھڑے جانے کب سے صرف مجھے اور سارہ کو ہی دیکھ رہے تھے، سارہ کے قرض کا انداز بھی اسی کی طرح بدلتا رہا۔ اس کے قدم غلبت میں نہیں اٹھتے تھے جیسے بہت سوچ مجھ کو قدم رکھنے کی جگہ کا انتخاب کر رہی ہو۔ نفعے کی دھن ختم ہونے کے بعد جب آس پاس سے تالیوں کا شور اٹھا تو ہم نے دیکھا کہ پورا ہال ہماری طرف ہی متوجہ ہے اور صرف ہم ہی روشنی کے گول دائرے میں کھڑے ہیں۔ سارہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر بے اختیار غصہ دی۔ اس کی غصے سے لگا جیسے تیز بارش کے دوران کالی گٹا یک دم

چھٹ گئی ہو اور آسمان پر بادلوں کے درمیان سے اچانک سورج نکل آیا ہو۔ سب لوگ ہمیں دیکھ کر سسک رہے تھے۔ سارہ کے چہرے پر چھایا غماز بھی شفق کی جھلکی سرخی میں بدل چکا تھا۔ یہ محبت بھی پل پل میں کیسے کرشمے دکھاتی ہے، کیسے کیسے روپ بدلتی ہے۔

گھر والی بھی پرہم دونوں خاموش تھے۔ آج سارہ کو میری طرف سے اسی بھرم کی ضرورت تھی جو اس رات چرچ سے واقعی پر مجھے سارہ کی جانب سے درکار تھا۔

محبت اپنے اظہار کے پل جس قدر بے باک ہوتی ہے۔ وہ پل گزر جانے کے بعد اس سے کلی گناہ زیادہ شرمیلی ہو جاتی ہے۔ سارہ کا بھی اس وقت وہی حال تھا۔ ہماری گاڑی لندن کی سڑکوں سے ہوتی ہوئی کامران کے فلیٹ کی جانب بڑھ رہی تھی۔

سارہ کے گلے کا سکارف ہار ہار لہر رہا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ میں نے دانستہ اُسے گل نہیں کیا۔ کبھی کبھی ہمیں کسی کے ساتھ رہتے ہوئے بھی تنہائی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ گاڑی کامران کے پارکسٹ کے نیچے آ کر رک گئی۔ سارہ نے میری جانب دیکھے بغیر کہا۔

”آج کی رات میری زندگی کی سب سے حسین رات تھی جتنا۔۔۔ میں اسے کبھی نہیں بھولوں گی۔“ میں نے اسے نیچے آ کر آیا۔ ہوش سے نکلنے ہوئے ہال کے دروازے پر کھڑے درہان نے ہمیں کھڑکی کی ایک ایک جھلکی کی تھی جو ہوش کے خوبصورت منوگرام والے کپڑے کے چھوٹے سے دروازے میں لپٹی ہوئی تھیں۔ گاڑی سے اترتے ہوئے میری کلی وہیں اندر ڈیش بورڈ پر پڑی رہ گئی تھی۔ سارہ نے گاڑی میں اگلا قلم نکال کر اس دروازے پر دیوارِ آثار اور وقت لکھ کر اسے اپنے بیک میں ڈال لیا۔

”میں اُسے نشانی کے طور پر اپنے پاس رکھ رہی ہوں۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔“

”مگر پہنچ کر مجھے ایک فون ضرور کرو یا رات کا ٹی بیٹ بھی ہے اور شہر میں جھارے عداوتوں کی تعداد بھی کافی ہے۔“

سارہ نے سر ہلایا۔ میں نے گاڑی سے دو قدم پیچھے ہٹا کر دو گاڑی آگے بڑھا سکے۔ سارہ نے اپنے گلے سے لپٹا سکارف کھولا اور گاڑی سے نیچے اتر کر اسے میرے گلے میں باندھ دیا۔

”یہ تمہارے ساتھ رہے گا تو ہمیشہ میری یاد دلائے گا۔“

سارہ گاڑی میں بیٹھ گئی اور اس نے کار آگے بڑھا دی۔ میں اُسے گلی کے موڑ سے مڑتے وقت تک دیکھتا رہا۔ ٹھنڈی بچ خٹکے ہوؤں نے میرے وجود کو جھنجھٹا دیا اور میرے گلے میں بندھا سارہ کا سکارف لہراتا رہا۔ یہ صرف ایک سکارف ہی نہیں تھا۔ یہ سارہ کے وجود کی خوشبو تھی۔ جو میرے گلے سے سکارف کی صورت میں لپٹی ہوئی تھی اور تمام ماحول پر دھیرے دھیرے چھا رہی تھی۔ دُور کسی گھنٹہ گھرنے کے سنانے میں وہ پہنچے کا اعلان کیا۔ میں گھنٹہ قدموں سے پارکسٹ کی میزچیلوں کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆



”میں نے قانونی لڑائی سے ہاتھ کب روکے ہیں بار۔ وہ جنگ تو تم یہاں میری غیر موجودگی میں بھی ضرور لڑو گے۔ لیکن فی الحال میرا مصلحت سے ہٹ جانا ہی بہتر ہے۔ میری وجہ سے بہت سے معصوم لوگ مشکل میں پڑ گئے ہیں۔ ان کا میرا ہم مذہب ہونا ہی سب سے بڑا بھرم بن گیا ہے۔“

کامران کا خضرا پانی جبکہ بھاتھا اور پھر شام تک بی۔ وی اور اخبارات کے ذریعے میرے سبھی دوستوں کو بھی میرے اس فیصلے کی خبر ہو گئی۔ سب سے پہلے سارہ اور ربیکا ہنچیں۔ ربیکا نے تو آتے ہی آسان سر پر اٹھالیا۔

”یہ کیا بات ہوئی۔۔۔ تم نے اپنے طور پر یہ فیصلہ کیسے کر لیا۔ ہم تمہیں کہیں نہیں جانے دیں گے۔ اس روز تاخیر پورٹ جانے والے تمام راستوں کا گھیراؤ کریں گے۔ سڑکوں پر لیٹ جائیں گے۔“

”تم کوئی اچھی سی صاف سڑک کچھ کر لیتا۔۔۔ ورنہ صبح جو تم عین چار گھنٹے اپنے میک اپ پر لگاتی ہو وہ سب ضائع ہو جائیں گے۔“

ربیکا ہنچے میں بھی فحش پڑی۔ لیکن پھر وہ بارہ چلا کر ہوئی۔

”یہ مذاق کی بات نہیں ہے مسٹر میڈی۔۔۔ تم پر ہمارا بھی کچھ حق ہے اور میں اسی حق کا سہارا لے کر کہتی ہوں کہ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔“

سارہ ونچ جاپ کھڑی تھی کیونکہ اسے میرے فیصلے کی وجہ معلوم تھی۔ اس دن پادکر سے ہوئی تمام گفتگو اور پھر شہر کے واقعات پر شروع سے اس کی نظری۔ لیکن اس کے انداز سے بھی صاف ظاہر تھا کہ اسے میرے فیصلے سے سب جانتے ہوئے بھی بے حد دھچکا لگا ہے۔

ہم سب اس وقت کامران کے رہنے والوں کے بارہ والے لٹ پاتھ پر گئی میزوں پر بیٹھ کر ہنچے ہوئے تھے۔ کچھ سی دیر میں جم، ڈیوڈ اور بیٹا وغیرہ بھی آ گئے۔ میں نے ان سب کے جذبات کو بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا۔ انہیں اپنے لندن چھوڑنے کی وجہ بتائی اور یہ بھی کہا کہ میں ہمیشہ کے لیے واپس نہیں جا رہا۔ ان سب سے رشتہ میرے خون میں شامل ہو چکا ہے اور اب چاہے میں کسی کو نہ میں بھی رہوں۔ میرا دل ان سب کے ساتھ ہی دھڑکنے لگا۔

ربیکا کے آنسو بار بار چھٹک جاتے تھے۔ میں نے ماحول کو کچھ بدلنے کے لیے ربیکا پر چوٹ کی کہ کچھ لوگ دوستوں کو صرف غمگین آنسوؤں کے گھاس پر غیظاً کر دھت کرنا چاہتے ہیں۔ ان سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ میرے اعزاز میں کوئی اودھائی تقریب ہی منعقد کریں۔ ربیکا بیکلی آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی اور اس نے ہم سب کو اپنی پوری کلاس کو اگلے دن اپنے گھر کھانے پر مدعو کر لیا۔ ان کا دل رکھنے کے لیے میں نے وہیں سے ان کے سامنے ہی فون پر اپنے دکھاؤ چند ہدایات دیں کہ میرا کہیں کس طرح سے عدالت میں پیش کرنا ہوگا۔ سارہ اس تمام دوران بالکل گم سمی اور خاموش بیٹھی رہی۔ ہانے اس کے ذہن میں کیا کشمکش ہی چل رہی تھی۔

رات گئے وہ سب مجھ سے رخصت ہو گئے۔ سارہ بھی اپنی سفید قفل کی جانب بڑھ گئی۔ میں آج کامران کے ساتھ آیا تھا۔ اور اسی کے ساتھ وہ اپنی کار واردہ بھی تھا۔ سارہ کے قدموں کی چٹکیا ہٹ واضح تھی۔ کامران جو میرے ساتھ ہی میز پر بیٹھا تھا اس نے خود ہی سارہ کی مشکل آسان کر دی اور سارہ سے چٹا کر کہنے لگا۔

”میں آؤں۔۔۔ اگر آپ میرے حال پر رحم کریں اور میرے اس جذباتی دوست کو گھر چھوڑتی جائیں تو میں اپنا کچھ کام دھندل کر



لوں۔ اس کے باپ کے پاس تو اسے ورثے میں دینے کے لیے کافی دولت ہے جب کہ میرا باپ میرے لیے صرف دُعا کیں چھوڑ گیا ہے۔“ سارہ کامران کی بات سن کر مسکرا دی۔

”میرے لیے خوشی کی بات ہوگی۔“

کامران نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

”جاؤ بیٹے ملو۔۔۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔۔۔ کیسے جان و جگر قسم کے دوست سے پالا پڑا تھا۔ حالانکہ میں جانہ ہوں وہ گاڑی کے قریب

کھڑا میرا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن میں نے تمہیں یہ پاس بخش دیا ہے۔ جاؤ پیش کرو۔“

میں نے بھی اُٹھنے ہوئے کامران کے کان میں ہلکی سی سرگوشی کی۔

”مٹی کے خواب میں جھگڑے۔۔۔“

کامران کا منہ بن گیا میں آ کر سارہ کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سارہ میری لور کامران کی لوک جھونک ڈور سے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے گاڑی

آگے بڑھا دی۔

”تمہارا دوست کیا کہہ رہا تھا میڈی۔“

میں نے سارہ کو کامران کی بات بتائی۔ وہ سن کر مسکرا دی۔

”تمہارا دوست واقعی دوستی کے قابل ہے۔ میں واقعی اکیلے آتے ہوئے ہنگامہ چاہی تھی لیکن جانے کیوں حصیں ساتھ چلنے کا بھی نہیں کہہ

رہی تھی۔ کامران نے میری مشکل حل کر دی۔۔۔ تم نے اسے بہت سے اچھے لوگ اپنے آس پاس کیسے جمع کر رکھے ہیں؟ ہمیں تو صوفیہ نے سے

بھی ایک نہیں ملتا۔“

میں سارہ کا اشارہ سمجھ کر مسکرا دی۔

”جس کے گرد وہ سب لوگ جمع ہیں۔ وہ تو خود تمہارے ساتھ ہے۔ پھر یہ کد کیا؟“ سارہ بھی میرا جواب سن کر مسکرا دی۔ لیکن پھر اچانک

اس کے چہرے پر اُداسی کے وہ زلزلے پھیل گئے۔

”و تو تم چارہ ہو پاؤں۔۔۔ ہم سب کو تنہا چھوڑ کر۔“

”میں بیٹھ تمہارے ساتھ ہی تو ہوں۔ ہر لمحہ تمہاری دسرس میں۔“

سارہ ہلپ رہی۔ جیسے کوئی گہری موج اس کے اندر جگ بجھنے سے ہوئے ہو پھر اس نے غصہ سے بولے لہجے میں کہا۔

”میں بہت دنوں سے وہ جڈا صوفیہ کی کوشش کر رہی ہوں جس نے اسے بہت سے لوگوں کو تم سے غافل و غور کر رکھا ہے۔ لیکن ہر بار میری

سوچ غامی دیواروں سے ٹکرا کر پلٹ آتی ہے۔ میں نے تو ریت اور انجیل میں بھی کافی سرکھپایا لیکن تمہارے پیغام تک نہیں پہنچی پائی۔ وہ کیا بات ہے جو

تمہیں ہم سب میں ممتاز کرتی ہے۔ خصوصی خانی ہے۔ وہ کیا چیز ہے جو تمہارے اندر غرور اور غرور کا اس قدر مضبوط احساس جگاتی ہے کہ میرے پاس بھی

مضبوط اور بڑے قدر والے انسان بھی تمہارے آگے بڑے نظر آتے ہیں۔ ایسے سازشی بونے جو ایک دراز قدر شیواوے کو متکفلوں کی تعداد میں مل کر گرانے کی اور اس کی منکلیں کسنے کی فکر میں ہوں۔ لیکن ہر بار منہ کی کھار ہے ہوں۔ یلو۔۔۔ تم میں ایسا کیا ہے مڈی؟“

”جنگ کھوں تو مجھ میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے فکر کرنے کے لیے۔ ہاں اگر میرا مذہب ہی ان کی پریشانی کی وجہ ہے تو یہ مذہب تو میرے سب سے اہم مذہبوں کا فروغ ہے۔ نہیں نے تو آج تک اس مذہب کا ایک حق بھی ٹھیک طرح سے ادا نہیں کیا۔ کچھ پوچھتو نہیں اپنے مذہب کے نام پر خود ایک دھبہ ہوں۔ میرا کوئی بھی تو عمل اس سے مطابقت نہیں رکھتا اور ایک بات اور جو تم خود جانتی ہو کہ تیس تو ایمان کی وجہ سے ہمیشہ اس مذہب کو اپنا مخالف۔۔۔ اپنا دشمن سمجھتا رہا ہوں۔۔۔ میں یہاں آنے تک یہی سمجھتا رہا کہ اس مذہب نے ہی مولوی علیہم کی صورت میں میری ایمان کو مجھ سے جھین لیا تھا۔ یہ مذہب مجھے دوسروں میں اتنا ممتاز کر دے گا۔ میرا قدر اتنا بڑھا دے گا۔ دشمنوں اور میرے مخالفوں کو مجھ سے اتنا خوف زدہ کر دے گا۔ یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے تو کبھی اس مذہب کو اپنے لیے باعث افتخار نہیں سمجھا۔ ان سب لوگوں کی مخالفت نے اسے میرے لیے باعث افتخار بنا دیا۔“

”جنگ کہوں تو یہاں آنے سے پہلے نہیں“ ان کا کاسٹ“ کے نام سے بھی واقف نہیں تھا۔ نہ ہی میرے دل میں کبھی کسی فلسفی مسلمان کے لیے کوئی درد ہی جا کا تھا۔ اور شاید اگر میرے راستے میں یہاں اس قدر کانٹوں کے جال نہ بچھائے جاتے تو میں کبھی اس نرم بچے کی حقیقت میں نہ پڑتا۔ میں بھی عام لو جو ان کوئی طرح اسے ایک واقعہ سمجھتا رہتا جس کے کچھ یا سمجھو کہ وہاں نے کی دھم تو میں کبھی گوارا نہ کرتا، مجھے اس راہ پر ڈالنے والے بھی اصل میں سراسر آنکڑی ہیں۔ اگر میرے اندر کوئی ہند بے قابل فخر و قابل فروغ ہے تو اسے جگانے میں سب سے بڑا ہاتھ بھی انہی کا ہے۔ لیکن وہ حریہ کس جگہ سے خوف زدہ ہیں یہ تو میں بھی نہیں جان پاتا بھی تک۔“

”اسی جگہ اسی پیغام کی تو میں بھی حاشاں ہوں۔ کیا تم اس کو حق میں میری مدد نہیں کرو گے عمار۔۔۔“

میں فوراً سے سارہ کی بات سن رہا تھا۔ ایسی کیا بات ہو سکتی ہے۔۔۔؟ ایسا کون سا پیغام ہو سکتا ہے۔ اس وقت شام ڈھل رہی تھی۔ سورج کی اودائی کر نہیں اٹھی اور فوجی عمارتوں کی چوٹیوں اور گنبدوں پر سنہری قلعی پیمبر کر اویں پلٹنے کی فکر میں تھی۔ اچانک ایک اچھے لگند کو کچھ کر میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ ہم اس سنٹرل لندن کے علاقے سے گزر رہے تھے جہاں ایشیائی باشندوں کی بہت بڑی تعداد ہائش پڑ چکی تھی۔ میں نے سارہ کو گاڑی سڑک کے کنارے پر لگانے کا کہا۔ ہم دونوں گاڑی سے اتر آئے۔ سامنے ہی وہ عمارت موجود تھی جس کے لگند پر چھتی سنہری دھوپ نے میرے دماغ کی کڑکی بھی روشن کر دی تھی۔ یہ سنٹرل لندن کی سب سے بڑی مسجد تھی۔ سارہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”شاید میں تمہیں تمہیں اس پیغام کا کچھ حصہ بھی اسی وقت پڑھ کر سنا سکتا ہوں۔ لیکن اس کے لیے ہمیں اس عمارت میں جانا ہوگا اور اس عمارت میں داخلے کے کچھ آداب ہیں۔ اگر تم میرے ساتھ ان آداب کو دہرا سکتو۔۔۔؟“

سارہ نے چپ چاپ میرے پیچھے چل پڑی۔ مسجد کے گھن میں ہی بہت سے گرم شعلے پانی کے گلے ہوئے تھے۔ سارہ نے میری طرف دیکھ کر کچھ پانی اپنے ہاتھوں پر چہرے پر اور کپڑوں پر پھینکا اور وضو کر کے مسجد کے گھن میں ہی ایک جانب خاموشی سے بیٹھ گئی۔ میں اندر سے قرآن اٹھا لیا۔ شاید ہمارے مولوی صاحب نے جب تیرہ برس کی عمر میں مجھے ختم قرآن کی مبارک باور دی تھی اس کے بعد آج نہیں نے اس کتاب کو کھٹا

تھا۔ ہاں البتہ جب مولوی عظیم، نئی کو درس دینے کے لیے ہمارے گھر آتے تھے تو ہمیں اپنے مطلب کے لیے ان کے آس پاس بیٹھا رہتا تھا اور یوں میرے کانوں میں ان کے مخصوص، سچے اور متناظر گونج رہتا تھا۔

میں نے سو درجن کھولی اور سارہ کو چنہ چنہ کر اس کا ترجمہ سنانے لگا۔

”تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔۔۔۔۔“

میں پڑھتا گیا اور سارہ غور سے سنتی گئی۔ پھر جب میری نظریں انھیں تو میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ دلوں پر لگا رنگ آنسوؤں کی صورت میں زار و قطار بہ رہا تھا۔ میں خود بھی اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکا۔ ایک لمحے میں ہی جانے کتنے چہرے میری آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے۔ مولوی عظیم اور یو سے آئینوں پر ملنے والے صوفی رحمت اللہ علیہ اللہ اور جانے کون کون۔ جو اس دنیا میں اپنی آمد کا حق ہوا کر رہے تھے۔ اور میں۔۔۔۔۔ میں تو اپنے جینے کا تحمیک سے شکر بھی ادا نہیں کر پایا تھا کبھی۔ ہماری اس دنیا میں آمد کا مقصد کیا تھا۔۔۔ اور ہم اپنی زندگی کن مشاغل میں بسر کرتے رہتے ہیں۔ روز آک نیا دھبہ اپنے پسپے ہی سے بے تھا شا داغ دار دامن پر سجا لیتے ہیں۔ پھر بھی کتنے بے خبر کتنے خوش رہتے ہیں۔ دہائی پر سارہ راستہ اس کی آنکھیں پٹکیں چل رہی ہیں اور میں بھی خاموش رہا۔۔۔۔۔ رات کو جب سارہ نے مجھے کامران کے فلیٹ پر ڈراپ کیا تو وہ بے انتہا رونے کے بعد اب پڑ سکون تھی میں نہیں جانتا تھا کبھی کبھی الوداع کہنا کس قدر مشکل ثابت ہوتا ہے اس کا اندازہ مجھے اس رات سارہ سے گلجھرتے ہوئے ہوا۔ سارہ چلی گئی لیکن میں ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ ایک عجیب سی بے چینی میرے دل و دھڑکنے میں لگی تھی۔

☆☆☆

## عشق کا قاف

**عشق کا قاف** سرفراز دہانی کے حساس قلم کی تخلیق ہے۔ عشق۔ ازل سے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا یہ جذبہ جب اپنے رخ سے قاف سرکا تا ہے منہو نیاں جنم لیتی ہیں۔ مثالیس تخلیق ہوتی ہیں۔ داستان میں بنی ہیں۔ ”عشق“ کی اس کہانی میں بھی اسکے یہ ہیروں حرف دیکر رہے ہیں۔ ”عشق کا قاف“ میں آپ کو عشق کے صیغہ شین اور قاف سے آشنا کرانے کے لئے سرفراز دہانی نے اپنی راتوں کا دامن جن آنسوؤں سے بھگایا ہے۔ اپنے احساس کے جس لالہ میں پل پل جلتے ہیں ان انکار و لہجوں اور شبنم گہریوں کی داستان لکھنے کے لئے خون ہلکے میں موندے بیان کیسے ڈوبا ہے۔ آپ بھی اس سے واقف ہو جائیے کہ یہی عشق کے قاف کی سب سے بڑی دین ہے۔ **عشق کا قاف** کتاب گھر پر دستیاب ہے۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

## تجدید ایمان

اگلی شام ربیکا کی پارٹی پر اس کے گھر سبکی دوست موجود تھے۔ میری ساری کلاس موجود تھی، سوائے سارہ کے۔ ربیکا نے ہر وہ جگہ جہاں سارہ کے ہونے کا امکان ہو سکتا تھا، رابطہ کر کے دیکھ لیا تھا لیکن سارہ کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ اس کے سارے فون نمبر بھی آڑا لیے گئے لیکن سب بے سود رہا۔ ربیکا نے کئی مرتبہ سارہ کے گھر بھی فون کیا لیکن گھر پر کوئی تھا ہی نہیں۔ ایک پُرانے نوکر نے جو ربیکا کو اچھی طرح جانتا تھا صرف اتنا بتایا کہ سارہ میڈیم کا سر آؤٹ کر کے ساتھ آج صبح بہت جھگڑا ہوا اور پھرتہ جانے وہ کہاں چلی گئیں۔ نوکر نے یہ بھی بتایا کہ سارہ کی ماں بھی اُسی کی تلاش میں دن کو گھر سے نکل گئی تھیں اور ابھی تک واپس نہیں لوٹیں۔ سر آؤٹ کر کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ سر شام ہی اپنے دفتر چلے گئے تھے اور اب بھی پتہ نہ پڑی میں ہی موجود ہیں۔

ربیکا نے پریشانی سے یہ ساری اطلاعات مجھے پارٹی ہال کے ایک کونے میں لے جا کر بتائیں۔ واقعی بات تو فکری تھی۔ میں بھی پریشان ہو گیا۔ آخر سارہ اس طرح سب کو ہٹا جائے کہاں جا سکتی تھی۔ ہو سکتا ہے کچھ دیر میں وہ یہاں آ ہی جائے۔ میں اور ربیکا اسی امید پر گھڑیاں گنتے رہے۔ ہم دونوں ہی اس پارٹی کو چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتے تھے۔ ربیکا اس دعوت کی میرا ہن تھی اور میں نے وہ تھا جس کے اعزاز میں یہ سب لوگ یہاں جمع ہوئے تھے۔ لیکن ہم دونوں ہی کا اس معاملہ میں نہیں لگ رہا تھا۔ میری ساری کلاس میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے یہاں جمع ہوئی تھی۔ دوسرے سکسٹوز سے بھی بہت سے لڑکے لڑکیاں تھیں۔ ربیکا کی شہرت اور دوستی پوینڈر شی کے کونے میں بکھری ہوئی تھی۔ ہم دونوں درمیانی وقتوں میں بھی سارہ کی تلاش میں فہرہماتے رہے۔ کامران جو ریستوران میں تھا اور بعد میں یہاں پارٹی میں ہماری طرف آئے والا تھا اُسے میں نے فون کر کے خصوصاً تاکید کی کہ وہ یہاں آنے سے پہلے سارہ کے گھر سے ضرور دہن آئے۔ لیکن اُس نے بھی آکر یہی بتایا کہ سارہ کی کوئی خبر نہیں ہے۔

آخر خدا خدا کر کے مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ سب ہی نے مجھے فرودا فرودا جاتے ہوئے گئے لگا کر اپنی پوری حمایت اور سہارے کا یقین دلایا۔ جم، ڈیوڈ اور نیما تو دوی چڑے۔ کیسے عجیب رشتے تھے یہ۔ میں ان سب کا کچھ بھی نہیں تھا لیکن آج وہ سب میرے سب سے زیادہ اپنے تھے۔ میرے ساتھ طوفان میں جم کر کھڑے تھے۔ آنسوؤں کا ڈرٹھ موڑنے کی ہمت رکھتے تھے۔ آج مجھے احساس ہوا تھا کہ جنگیں جڑے سے جیتی جاتی ہیں، ایسے جان نثار ساتھ ہوں تو کسی کو کیا غم۔ سب نے مجھے یقین دلایا کہ میں بہت جلد پھر سے ان کے درمیان ہوں گا۔ سب ہی میرے لیے کوئی نہ کوئی تھوڑے کر آئے تھے۔ ان سب کے غلوں کو دیکھ کر جانے کیوں میری آنکھیں بھی بھرا نکیں۔ یہ دل کا پتہ نہ بھی کیسا عجیب ہوتا ہے۔ سارے جہاں کی نفرت سہ جاتا ہے لیکن چند انہوں کی محبت پا کر چمک اُٹھتا ہے۔ سب ہی لوگوں نے ربیکا کا اس شاندار پارٹی دینے پر شکر یہ ادا کیا۔ واقعی ربیکا نے کوئی کسر بھی تو نہیں چھوڑی تھی۔ اس کا مصلیٰ خدا کاں آج پوری طرح سے سہارا تھا۔ ہر طرف باوردی بہرے ہاتھوں میں مشروبات کی ٹرے

تھامے سر شام ہی ہال میں ادھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ کھانے پینے اور موسیقی کا ایسا شاندار انتظام انیس نے کم ہی کہیں دیکھا تھا۔ ربیکا نے ہال کے باہر موجود سوئچنگ پول کے کنارے پر باربی کیو اور سائمنڈس کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ سارا ہال اور باہر پول کی جانب روشنیوں کا سیلاب تھا۔ خوشبو میں تھیں۔ جیتھے تھے۔ لیکن سارہ کی غیر موجودگی نے سب ہی رنگ پھینکے کر دیے تھے۔ جم وغیرہ بھی ہاتھ دھت تک سارہ ہی کے بارے میں پوچھتے رہے۔

آخر کار ہال میں صرف میں ربیکا اور کامران رہ گئے۔ کامران انیس نے دوبارہ سارہ کی خبر لینے کے لیے بیچنے کا سوچا۔ آدھی رات بیت ہو چکی تھی۔ اب تک تو اُسے گھرواپس پہنچ جانا چاہیے تھا۔ ہم ابھی یہ بات کر رہے تھے کہ سارہ کے خاص نوکر نے جواس پارٹی کا چیف منسٹر بھی تھا، آکر ہمیں ہال میں خبر دی کہ کوئی مسٹر آنرک آئے ہیں اور ربیکا سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم سب کو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ مسٹر آنرک اور اس وقت آدھی رات کو دور ربیکا کے گھر کیا لینے آئے تھے۔ ربیکا نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھانے کا کہا۔ ہم انہیں نے تشویش سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی میری اور مسٹر آنرک کی نظریک دوسرے پر پڑی لیکن انہوں نے جلدی سے ربیکا سے پوچھا۔  
 ”اس وقت آنے کی مہذرت چاہتا ہوں۔ دراصل سارہ ابھی تک گھرواپس نہیں آئی۔ انیس نے سوچا شاید وہ یہاں ہو۔۔۔۔۔ اس کا فون بھی بندل رہا ہے۔“

ربیکا نے مسٹر آنرک کو بتایا کہ ہم خود سارہ کی وجہ سے بہت پریشان ہیں اور شام سے اس کی تلاش میں ہیں۔ اور اس وقت بھی وہ بارہا اس کی تلاش میں نکلنے کی تیاری کر رہے تھے کہ آپ آگئے۔

مسٹر آنرک نے ربیکا سے درخواست کی کہ اگر سارہ کے بارے میں کوئی خبر ملے تو انہیں ضرور دیکھ کرے۔ ربیکا نے سر ہلایا۔  
 مسٹر آنرک پھر وہاں نہیں رُکے۔ انہوں نے واپسی کے لیے قدم بڑھانے۔ راستے میں ہال سے نکلے ہوئے ان کی جھ سے چند لمحوں کی غم بھیز ہوئی۔ انہوں نے کڑی نظروں سے مجھے گھورا ان کی آنکھوں میں شدید غم نظر آتا تھا۔  
 ”نہیں تم کو اپنی بیٹی چھیننے نہیں دوں گا۔ آخری جیت میری ہی ہوگی۔“

”میرا مقصد کبھی آپ سے آپ کی بیٹی کو چھیننا نہیں تھا۔ آپ نے خود اپنے ہاتھوں سے اُسے کھو دیا ہے۔ البتہ ہم اُسے ڈھونڈ لیں گے۔ اور آخری جیت کا فیصلہ اگر ہم آخری جنگ پر ہی چھوڑ دیں تو بہتر ہوگا ورنہ لوگ کہیں گے کہ ایک شاگرد اپنے استاد کے راستے میں حائل ہو گیا۔“

مسٹر آنرک نے مجھ پر ایک آخری نگاہ ڈالی اور وہاں سے باہر نکل گئے۔ انیس نے کامران سے کہا کہ وہ مشرق کی جانب سارہ کو ٹھکانے جگہوں پر تلاش کرے جب کہ میں نے مغرب کی جانب ان جگہوں کو ٹھکانے کا ارادہ کیا جو سارہ آتے جاتے مجھے اپنی پسندیدہ جگہ بتاتی رہی تھی۔ میرے دل میں عجیب عجیب سے دوسرے غم لے رہے تھے۔ اس شہر میں اس وقت سارہ کے درپردہ دشمنوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ کامران چلا گیا۔ ربیکا نے گاڑی کی چابی میرے حوالے کر دی لیکن پھر اُس سے بھی نہیں رہا گیا۔ وہ سارہ کی بچپن کی دوست تھی اور بہت سی ایسی جگہوں سے واقف تھیں جن کے بارے میں میں بھی نہیں جانتا تھا۔ ہم دونوں گاڑی نکال کر لندن کی سٹان سڑکوں پر سارہ کو ڈھونڈنے نکل گئے۔ سب سے پہلے ربیکا نے سارہ کا اسکول اور پھر کالج کا رخ کیا لیکن دونوں جگہوں پر ہمیں پایا ہی ہوئی۔ اب میری بے چینی اور پریشانی اپنی حدوں کو چھوئے لگی تھی۔ انیس نے اپنے دل میں گڑبگڑا

کر خدا کو پکارا۔ ہاں۔۔۔ اسی خدا کو جسے نہیں ایمان کی موت کے بعد سے بالکل ہی بھول چکا تھا۔ وہی خدا جس سے نہیں دل میں ناراض تھا۔ جس کو نہیں ایمان کی موت کا ادمہ دار بھگتا تھا۔ اسی خدا سے میں نے گڑگڑا کر وعاما گئی کہ یا خدا اس معصوم لڑکی کی حفاظت کرنا۔ ہم سب زندگی میں چند مرتبہ ہی خدا کو سچے دل سے یاد کرتے ہیں اور پورے غلوں سے اس کے سامنے گڑگڑاتے ہیں۔ اس رات میری دعا کا وہ لمحہ بھی شاید انہی چند سچے لمحوں میں سے ایک تھا۔ ابھی میں تے دل ہی دل میں دعا ختم ہی کی تھی کہ میرا سوا ہل فون بٹا اٹھا۔ فون کی اسکرین پر سارہ کا نام بھگوار ہا تھا۔ نہیں نے جلدی سے فون آن کیا۔

”کہاں ہو تم۔۔۔ تمہیں کچھ احساس ہے کہ ہم سب کس قدر پریشان ہیں تمہارے لیے۔۔۔ آدھی رات کو نہیں اور رہا لندن کی سڑکوں پر تمہاری تلاش میں گاڑی دوڑا رہے ہیں۔ کوئی ایسا بھی کرتا ہے کیا۔۔۔؟“

میں نے چند لمحوں میں ہی اپنی ساری پریشانی فیصے کی صورت میں سارہ پر نکال دی۔ دوپٹ چاپ میری بات منی رہی۔  
”نہیں جانتی ہوں میرے اس رویے سے تمہیں اور باقی سب کو کس قدر تکلیف پہنچی ہوگی۔۔۔ لیکن نہیں مجبور تھی۔ زندگی بدلتے والے چند فیصلے ایسے ہوتے ہیں جنہیں کرنے کے لیے انسان کو تنہا ہی سب کچھ جھیلنا ہوتا ہے۔ بہر حال۔۔۔ نہیں جوچہ تمہیں بتا رہی ہوں۔ تم ربیکا کے ساتھ ابھی اسی وقت وہاں پہلے آؤ۔ نہیں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“

سارہ نے پتہ نہا کر فون کاٹ دیا۔ جو جگہ اس نے بتائی تھی وہاں ہم دونوں پہلے بھی جا چکے تھے لیکن اس وقت اس جگہ کا نام سنتے ہی میرا دل اتنی زور سے دھڑکا کہ جیسے چند لمحوں میں اچھل کر باہر نکل جائے گا۔ بڑی مشکل سے نہیں نے ظاہری طور پر اپنی کیفیت پر قابو پایا اور ربیکا کو گاڑی موڑ کر سارہ کی بتائی ہوئی چمکی کی طرف چلنے کو کہا۔ حیرت ربیکا کے چہرے سے بھی عیاں تھی لیکن میری حالت کے پیش نظر دوپٹ ہی رہی۔ کچھ ہی دیر میں ہم سنٹرل لندن کے علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ ہمیں سارہ کی سلیڈ ٹیبل ڈور ہی سے اندھ جری سڑک کے کنارے کھڑی نظر آ گئی۔ سارہ سڑک کے کنارے بنی ہوئی چھوٹی سی پلایا پر کھڑی تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا ”فرکوت“ پہن رکھا تھا جس کے کالر بس نے سردی سے بچنے کے لیے اوپر اٹھا رکھے تھے۔ دور سے ہمیں سارہ کے کوئی اور بھی کھڑا نظر آیا۔ ربیکا نے گاڑی سڑک کی دوسری جانب رکھ دی اور ہم دونوں آؤ کر تیزی سے سارہ کی طرف لپکے۔ سارہ کے ساتھ اس کی ماما کو کھڑے دیکھ کر ہمیں حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا لگا۔ ربیکا جاتے ہی سارہ سے لپٹ گئی۔ سارہ نے تھک چھک کر اسے قتل دی اور بولی۔

”نہیں اس طرح تم سب کو پریشان کرنے کی مقدرت چاہتی ہوں۔ ماما کو بھی نہیں نے آدھی رات کو ڈسٹرب کیا ہے لیکن میرے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔“

مسزآ نرک کی آنکھوں سے لگتا تھا کہ وہ بیٹی کے ساتھ مل کر بہت دیر تک مدافعت کر رہی ہیں اور جو بھی طوفان تھا وہ ہمارے آنے سے پہلے ہی گزر چکا تھا۔ اب ان دونوں کے چہروں پر سکون ہی سکون تھا۔ مسزآ نرک نے سارہ کے گالوں کو پیار سے تھپکا اور مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ نہیں کچھ حیران سا ان کی جانب بڑھ گیا اور انہوں نے پیار سے مجھے سینے سے لگا لیا۔ میرے بالوں میں اپنی انگلیوں سے سٹقلھی کر کے انہیں سنوارا اور بولیں۔

”تم ایک چے اور پیارے لڑکے ہو۔ مجھے خبر ہے کہ میری بیٹی نے ایک چے اور بہادر انسان سے دوستی کی ہے۔ میری دعائیں ہمیشہ سارہ کے اور تمہارے ساتھ ہیں۔“

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سارہ کی جانب دیکھا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے چار یا پونے پانچ بجے کا وقت ہوگا۔ اچانک فضا میں اک اور فضا سا بکھرا اور موزن کی اذان کو غنی ”اللہ بڑا ہے۔۔۔۔۔ اللہ بڑا ہے۔۔۔۔۔“

مجھے سارہ نے سنٹرل لندن کی وی بی بی جامع مسجد کے سامنے بلا یا تھا جہاں ایک دن پہلے نہیں اور سارہ آئے تھے اور ہم دونوں کے دلوں پر لگا کچھ رنگ و حلا تھا۔ سارہ میری حیرت دیکھ کر مسکرائی۔

”میں نے سچائی کا پیغام سن لیا ہے حماد۔۔۔۔۔ اب میرا راستہ بہت صاف ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ میں برزی اور احساس فخری کھوج میں ہوں۔ آج میری کھوج مکمل ہو گئی ہے۔ تمہاری بدولت مجھے اپنی وہ منزل نظر آ گئی ہے جو آگ کے دریا کے اس پار ہمیشہ سے موجود تھی لیکن میری نظروں سے اوچل رہی۔ اب میں نے اس آگ کے دریا کو پار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور میری عظیم ماں نے بھی مجھے اس کی اجازت دے دی ہے۔ میرے ساتھ کھڑے ہو کر میرا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ماما اپنی دقا اپنی مجبور یوں کی وجہ سے میرے ساتھ اس دریا کے پار نہیں چل سکتیں۔ لیکن میرے لیے ان کا تمہارا ریکا کا ساتھ ہی بہت ہے۔“

ریکا پکلی پکلی نظروں سے سارہ کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ اذان ختم ہو گئی تھی۔ سارہ نے میرا اور ریکا کا ہاتھ تھاما۔

”چلو۔۔۔۔۔ صبح کے راستے پر چلے میں دیکھیں۔۔۔۔۔؟“

ہم سب خواب کے سے عالم میں مسجد میں داخل ہو گئے۔ وہاں پیش امام جو شاید انگریزی نژاد ہی تھا اور جس کے چہرے کے گرد و رکاوٹ کا عجیب سا ہالہ تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ہم سب کا استقبال کیا۔ شاید سارہ پہلے ہی انہیں سب بتا چکی تھی۔ اُسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے مولوی عظیم الدین کی یاد آ گئی۔ کیا سبھی اللہ والوں کی فطرتیں ایک ہی ہوتی ہیں؟ انہوں نے ہم سب کو عزت کے ساتھ بڑے گنبد کے نیچے بٹھا دیا۔ پھر انہوں نے چند دعائیں پڑھیں اور پھر سارہ سے کہا کہ وہ ان کے پیچھے پیچھے پہلا کھڑا دھرائے۔

”میں کوئی مسجود سوائے اللہ کے۔۔۔۔۔“

کیبڑوں کی ایک ڈار جو غول کی صورت میں مچن میں داٹا چک رہی تھی۔ ایک تیز آواز کے ساتھ فضا میں اڑی جیسے انہوں نے سارہ کو سلامی پیش کی ہو۔ پھر فضا سا کسٹ ہو گئی۔ پھر دوسرا کھڑا۔ پھر تیسرا۔۔۔۔۔ چوتھا۔ پانچواں۔ چھٹا۔۔۔۔۔

مجھے وہ دن یاد آیا جب میں نے اپنے مطلب کے لیے اور مولوی عظیم کی قربت حاصل کرنے کے لیے یہ سارے چہ کے چہ کے یاد کیے تھے۔ مجھے لگا جیسے اس انگریزی نژاد گورے پیش امام کی جگہ مولوی عظیم ہمارے سامنے بیٹھ گئے ہوں۔ ساتھ ہی دیکھا تو عبد اللہ بھی بیٹھا سا رکھنا تھا۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر ریکا کی جانب دیکھا تو وہاں بھی صوفی رحمت اللہ جتے ہوئے نظر آئے جیسے کہہ رہے ہوں ”میاں۔۔۔۔۔ ہم تو مسجد کی کھڑکی سے صرف باہر جھانکتے ہی رہے۔ تم نے تو اسے کھڑکی سے اندر مسجد میں ہی بلا لیا۔“

سارہ نے ذرا غصہ کر کے چہرے پر ہاتھ پھیرے۔ اس کی دیکھا دیکھی ربیکا نے بھی گلے میں پڑا۔ اس کا رخ اپنے سر پہ ڈال لیا تھا اور مڑوب بیٹھی ہوئی تھی۔ امام صاحب نے سارہ کو اور ہم سب کو مبارک باد دی کہ اب سارہ حق کے راستے کی ایک مسافر تھی۔

سارہ کی ممانے آنسو ختم نہیں پارہے تھے۔ سارہ نے انہیں گلے لگا کر بے حد پیار کیا۔ ربیکا بھی ہنسی چلی گئی۔ اے انہیں تسکین دے رہی۔ میں نے مسز آنزک کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا کہ اس وقت انہیں تسلی دینے کا اس سے بہتر ذریعہ مجھے اور کچھ دوسرا خطرہ آیا۔

مسز آنزک۔۔۔ یعنی فرما آنزک۔۔۔ کتنی عظیم عورت تھی۔ کیسا عجیب رشتہ تھا ان دو ماں بیٹی کا، سسلیوں سے بھی بڑھ کر، بیٹے ایک جان دو قالب ہوں۔ دنیا کی کون سی ماں ہوگی جو اپنی آدمی رات کو اپنی بیٹی کو اپنا دل بہہ بدلتے وقت حوصلہ دینے کے لیے گھر سے چلی آئے۔ اپنے شوہر کی برسوں کی رفاقت اور اپنے گھر اور اپنے ازدواجی رشتے کو بھی خطرے میں ڈال کر وہ واقعی یہ سب بہت خاص لوگ تھے۔ سارہ، اس کی ممانے۔۔۔ ان کا دل بڑا کھلا تھا۔ ان کی مٹی جس سے یہ لوگ بنائے گئے تھے ضرور کچھ خاص رہی ہوگی۔

امام صاحب نے وہ ہنڈ باقی لئے گزر جانے کے بعد ہم سے پوچھا۔

”خاتون کا؟ مسارہ ہی ٹھیک ہے یا آپ کوئی دوسرا نام رکھنا چاہیں گے؟“

مسز آنزک نے سارہ کی جانب اور سارہ نے میری جانب دیکھا۔ میرے منہ سے جیسے خود بخود نکل گیا۔

”نہیں ہم سارہ کا نام بدل رہے ہیں۔“

”بہت بہتر۔ نیا نام بھی تجویز کرو بیٹھے سب کے سامنے۔“

”ایمان۔“

سارہ نے اور ربیکا نے ایک وقت چونک کر میری جانب دیکھا۔

”جی۔۔۔ سارہ کا نیا نام نہیں ”ایمان“ تجویز کرنا چاہتا ہوں۔ اگر کسی کو کوئی اعتراض نہ ہو۔“

سارہ نے خوشی سے لرزتی آواز کے ساتھ کہا۔

”میں اس نام کا اپنے لیے اعزاز سمجھتی ہوں۔“

امام صاحب نے ذرا غصہ کیا اور پُرانی سارہ اور نئی ایمان کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ ربیکا نے بھی جلدی سے اپنا سر اُگے کر دیا۔ امام کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ پھر اُس نے ربیکا اور میرے سر پر بھی ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ صبح کی سفیدی خود بخود چھٹی تھی۔ کالی رات کے سائے ڈھل چکے تھے۔ اور یہ صبح بھی کیسی عجیب صبح تھی۔ اتنا سفید آجائیں نے آج تک اپنی زندگی میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ دودھ یا سفید آجالا۔

ہم سب مسجد سے باہر نکل آئے۔ ایمان نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ ہم اپنی کازیموں کے قریب پہنچے۔ لندن کی مخصوص صبح کی دھند نے سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ محض ہمیں قریب کبھی سفید نظر آتی۔ ایمان نے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا اور مسکرائی۔

”میں نہیں جانتی کہ میں کبھی تمہاری محبت پاسکوں گی یا نہیں۔۔۔ لیکن دیکھو۔۔۔ میں نے تمہارے خدا کو پا لیا ہے۔“



میں نے اس کے چرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر اس کے ماتھے کا بوسہ لیا اور مسز آنرک کے ہاتھ میں ایمان کا نازک ہاتھ تھمایا۔  
 ”یہ میری زندگی کی سب سے قیمتی امانت ہے جسے میں آپ کے ہاتھوں میں سونپ رہا ہوں۔ اس کا خیال رکھیے گا۔“  
 مسز آنرک مسکرائیں۔

”بے فکر ہو لڑکے۔۔۔ تمہاری امانت محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ اُسے نقصان پہنچانے والی کسی بھی چیز کو پہلے میرے جسم اور میری روح کے پار ہونا پڑے گا۔“

ریکا نے آگے بڑھ کر ایمان کو اپنے گلے سے لگا لیا اور پھر وہ بھی اس کا ہاتھ چوم کر بولی۔ ”آج تم سب سے جیت گئی ہو۔ مجھے فخر ہے کہ میں تمہاری دوست ہوں۔“

میں جانتا تھا کہ ایمان کے راستے میں آگے کیسے کیسے پُر خار راستے، کبھی کیسی الجھنیں اور نکالیف اور کتنے انگارے بچھے ہوئے تھے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ ایک بہادر لڑکی ہے اور وہ ہر مشکل کے سامنے ڈٹ جاتا جانتی ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ میں نے مولوی علی محمد کو بچنے کے لیے بھی مذہب کا سہارا لیا تھا۔ مذہب کو ایمان کے گھر جانے کے لیے ایک بیڑی کے طور پر استعمال کیا تھا لیکن میرے اندر شائد کھوٹ تھا۔ لیکن اس بیڑی نے مذہب کو مجھ تک پہنچنے کا ایک ذریعہ یا میرے دل میں آترنے کی صرف ایک بیڑی نہیں سمجھا۔ بلکہ اس نے جو بھی کیا ہے دل سے کیا۔ اس کی کسی محبت میں کوئی منافقت نہیں تھی۔ نہ ہی میری محبت میں اور نہ ہی خدا کی محبت میں۔۔۔ وہ دونوں محبتوں میں جگہ تھی۔

ہم چاروں لوگ صبح کی شدید دھند میں ایک دوسرے سے وداع ہو کر اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ ایمان کی نظریں جاتے وقت تک میرا ہی طواف کرتی رہیں۔ وہ جانتی تھی کہ گلے دن میری داہنسی کی حفاظت ہے اور اب چند گھنٹوں ہی باقی رہ گئی ہیں جس کے بعد ہم خدا ہو جائیں گے اور کون جانے یہ خدا ہی پھر کتنی صدیوں پر محیط ہوگی۔۔۔۔

میں اور ریکا دیر تک ایمان کی سفید پٹیل کو لندن کی گہری دھند میں غائب ہوتا دیکھتے رہے۔ جیسے دھواں، دھواں میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ پھر ریکا نے بھی اپنی گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

## دل بھولوں کی بستی

خواتین کی مقبول معرکہ انگشت عبداللہ کا انتہائی خوبصورت اور طویل ناول، **دل بھولوں کی بستی**، جس نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے، کتاب گھر دستیاب ہے جسے **رومانی ناول** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

## کبھی الوداع نہ کہنا

جب ہمیں اور کامران لندن پتھر وائٹ پورٹ کے لیے نکلے تو اسی وقت یوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ ائیر پورٹ پر پہنچے پہنچے یہ یوندا باندی شدید بارش کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ ہمیں راستے بھر گاڑی میں اس دن کے اخبارات پڑھنا شروع ہو چکے تھے۔ سارے کے قول اسلام کی خبریں بڑی بڑی ٹرینوں کی صورت میں پھیلائی تھیں۔ یہودی ذمہ وار اخبارات نے اسے ایک جذباتی لڑکی کی اپنی محبت کے لیے مذہب کی قربانی سے تعبیر کیا تھا۔ نور پبلک کی سارا اور آج کی ایمان کے لیے بہت سخت الفاظ استعمال کیے تھے۔ محبت کے چند متوالے اخبارات نے اسے محبت کی جیت قرار دیا تھا اور سر آڑک کی تمام اخبارات میں شدید تنکی کے حوالے دیے گئے تھے سر آڑک نے ایمان کو اپنی دراخت اور جانکاد سے عاقی کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور ایک انٹرویو میں انہوں نے ایمان کو 30 دن کی مہلت دی تھی کہ اگر وہ اب بھی اپنی غلطی کا "اعتراف" کر کے تائب ہو جائے تو وہ اُسے دوبارہ اپنی دلہنیت اور دراخت کا حق بخشے کو تیار ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے انٹرویو میں مجھ پر اپنی بیٹی کو بھڑکانے اور اُسے "راہ راست" سے ہٹانے کا بھی الزام لگایا تھا۔ اخبارات میں میرے لندن چھوڑ کر جانے کی خبریں بھی موجود تھیں۔ ایمان کا تمام اخبارات میں صرف ایک ہی جملہ بطور بیان لگایا گیا تھا کیونکہ شاید اس نے اخباری نمائندوں اور میڈیا کے سامنے کچھ بولنے سے ہی انکار کر دیا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ "جگ کائٹوں سے بھرا اک بے حد دشوار راستہ ہے اور محبت ہمیں ان کائٹوں بھری راہ پر چلنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔"

جیسے ہی ہم ائیر پورٹ کی پارکنگ میں رُکے تو گاڑی سے اترتے ہی مجھے اپنے شاسا چروں کا بے پناہ ہجوم نظر آیا۔ سب سے پہلے ربیکا بارش میں بھیکتی دوڑ کر میری طرف آئی آتے ہی میرا ہاتھ تمام کر کچھنچت ہوئی مجھے بھیجے سے ذور لے گئی۔ بارش ہم دونوں کے وجود کو بھٹور رہی تھی۔

"چند لمے یہاں میرے پاس کھڑے رہو۔ میں تمہارے وجود کو اپنی آنکھوں کے ذریعے اپنے دل میں اتار کر اس کی حسیہ کو قید کر لینا چاہتی ہوں۔ تاکہ تمہاری میں جب کبھی نہیں اپنے دل میں جھانکوں تو بس تم ہی تم مجھے نظر آؤ۔"

ہمیں نے اس کی دیوانگی میں غل ہونا مناسب نہیں سمجھا حالانکہ دوسری طرف کھڑے جم، ڈیوڈ، ٹینا اور باقی لوگ ہمارے تھے۔ ربیکا چند لمے مجھے بوجھتی نظروں نظروں میں نہارتی رہی۔ مجھے اس کی بھٹکی آنکھیں دیکھ کر ہر سے چارلی چپلن کا مشہور قول یاد آ گیا۔

"مجھے بارشوں میں پلانا چھانگتا ہے، کیونکہ جب کوئی میرے ہتھ آ سونہیں دیکھ پاتا۔" میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی بھٹکی آنکھیں بکھر دیں۔

ربیکا آج مسکرائے کی کوشش میں مزید دہانسی ہو گئی۔ ہمیں نے اس سے ایمان کا پوچھا تب اسے ہوش آیا اور اس نے پریشانی سے ابھرا دھردیکھا۔

"جانے وہ کہاں رہ گئی ہے۔ اب تک تو اُسے آ جانا چاہیے تھا۔"

میتروائیر پورٹ کے کھلے احاطے میں بورڈنگ سے پہلے بنی ہوئی لمبی راہداریوں میں میرے کبھی دوست، میرے تمام کلاس فلوز ہارٹس سے بے نیاز مجھے الوداع کہنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ ایئر پورٹ کا عملہ حیرت سے ان کے گہرائے ہاتھوں اور ان میں پکڑے پھولوں کے خوبصورت گلدستوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ یہ کون سی اہم شخصیت، کون سی وی۔آئی۔پنی ہستی ہے جس کے جانے کی اطلاع انہیں پہلے سے نہیں کی گئی۔ وہ امدان یہ نہیں جانتے تھے کہ ”محبت“ میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ خود بخود آپ کو دنیا کی سب سے اہم ہستی، سب سے بڑا وی۔آئی۔پنی بنا دیتی ہے۔ میری نظریں ایمان کو تلاش کر رہی تھیں لیکن ابھی تک اس کا کچھ اثر پتہ نہ تھا۔ میں نے سب ہی دوستوں سے فروا فر دیا اور اگلے دن میں اچانک مجھے ڈور سے پار کر کی گاڑی آتی دکھائی دی۔ بورڈنگ کا اعلان ہو چکا تھا اور میں اندر دھکے کے دروازے سے ہال میں مسافروں کو قفلہ میں آگے بڑھاتا دیکھ سکتا تھا۔ پار کر کی گاڑی کے پیچھے پولیس کی دو اور نیلے حق والی گاڑیاں بھی تیزی سے ایئر پورٹ کے احاطے میں داخل ہو گئیں۔ پار کر اپنی گاڑی میں سے حسب معمول بیچوگم چباتے ہوئے برآمد ہوا۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ ایمان اور اس کی ماما بھی اس کی گاڑی میں سے اتریں۔ ایمان تیزی سے میری طرف بڑھی۔ اور قریب آ کر میرے ہاتھ تھام کر بولی۔

”ہمارے راستے میں بہت سی دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ لیکن دیکھو نہیں پھر بھی تمہیں الوداع کہنے یہاں تک پہنچ گئی ہوں۔“  
 ”میں جانتا تھا تم ضرور آؤ گی۔“  
 مسز آنرک نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ چوما اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ پار کر بھی ہنستے ہوئے آگے بڑھا اور مجھے گلے سے لگا کر بولا۔  
 ”بار ہے ہو باقی تو جوان۔۔۔ میں جانتا تھا۔۔۔ جاتے جاتے بھی آخری بازی تم اپنے نام ہی کر جاؤ گے۔“ ناٹا اس کا اشارہ ایمان کی طرف تھا۔

”آپ میری دوست کو ان مشکل حالات میں ابھی یہاں تک لے کر آئے۔ میں اس کے لیے ہمیشہ آپ کا شکر گزار رہوں گا۔“  
 ”اس میں شک ہے کہ کوئی بات نہیں دوست۔ مسز آنرک اور ان کے ساتھیوں نے شہر میں ہمارا ہر راستہ روکنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن آج پار کرنے بھی سوچ رکھا تھا کہ زندگی میں ایک کام تو ایسا ضرور کر جاؤں گا کہ جس کا حوالہ دے کر مجھے یاد کر کے میری گردن بھی فخر سے بلند ہو جائے۔“  
 پار کرنے دو بار مجھے زور سے گلے لگایا۔ اس سے مل کر میں ایمان کی طرف بڑھ گیا جو ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ لیے پچ پچاپ ایک طرف کھڑی تھی۔ میں نے مسکرا کر اس کے ہاتھ میں پکڑے پھولوں کو دیکھا۔  
 ”یہ پھول تم میرے لیے ہی لائی ہو یا دانا ہی پر مسٹر پار کر کو پیش کرنے کا راہ دے۔“  
 ایمان مسکرا دی۔

”نہیں۔۔۔ یہ پھول تمہارے ہی لیے ہیں۔۔۔ لیکن یہ نہیں سمجھیں آج نہیں دوں گی۔۔۔ یہ اس دن کے لیے ہیں جب میں اسی

اتیر پورسٹ پر اسی جگہ تمھاری دانگی پر تمھیں لینے آؤں گی۔ چاہے اس بلے کے آنے میں کتنی ہی صدیاں کیوں نہ بیت جائیں۔ نہیں اس بلے کا انتظار کروں گی۔ اور جب تم وہاں آؤ گے تو تب میں یہ گلدستہ تمھیں دوں گی۔۔۔۔ اور دیکھ لیتا۔۔۔۔ تب بھی یہ پھول میرے انتظار کی طرح تازہ ہوں گے۔۔۔۔ یہ کیاں کبھی نہیں مر جھانیں گی۔۔۔۔ کبھی نہیں۔“

ایمان کی آنکھیں بجلی لگیں۔ جدائی کا زہر پھر سے اپنا اثر دکھانے لگا تھا۔ شاید محبت کی تخلیق ہی جدائی کے لیے۔۔۔۔ جدائی کے باعث ہوئی ہوگی۔۔۔۔ جدائی نہ تو شادی ہی محبت بھی وجود میں نہ آتی۔۔۔۔ جیسے بندگی نہ وقی۔۔۔۔ تو بند بھی کبھی جنم نہ لیتا؟“

ایمان کا منہ جواب دے رہا تھا۔ اندر سے آپ باقاعدہ دیر ڈنک لپڑی میرا نام پکارنے لگی تھی۔ ایمان نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا۔  
”جار ہے ہو۔۔۔۔؟“

”اس کے اس انداز پر میرا دل جیسے ڈوب سا گیا۔“

”نہیں۔۔۔۔ نہیں بیٹھ تمھارے ساتھ ہوں۔۔۔۔ تمھارے بہت قریب۔۔۔۔“

میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہال بکھر دیے۔ ایمان ہلکے سے مسکرا دی۔ پھر میں نے پلٹ کر اس کی جانب نہیں دیکھا اور تیزی سے پور ڈنک لاؤنج میں داخل ہو گیا۔ گھر سے رنگ کا کالا چشما اس وقت بھی میرے بہت کام آیا۔ جسے میں نے گلت میں اپنی آنکھوں پر پہن لیا۔

”مجھے بارشوں میں چلنا چھانگتا ہے کیونکہ ایسے میں لوگ میرے آنسو۔۔۔۔“

میں نے دور جا کر پلٹ کر آخری مرتبہ دیکھا۔ سب سے آگے شیشے کی دیوار کے پاس ایمان، کامران پھر ریکا، مسز آنوک، پارکر، جم، ڈیوڈ، لینا اور پھر جانے کون کون کڑا میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتا ہوا تھا۔ میرے لیے یہاں جمع ہوئے تھے۔ کون کہتا ہے نہیں یہاں آ گیا تھا۔ کون کہتا ہے نہیں خالی ہاتھ لندن سے واپس جا رہا تھا۔ میں نے یہاں کا ایک ایک رشتہ دینا جہاں کی دولت سے مہنگا پایا تھا۔ آج تو میں خود کو دنیا کا سب سے امیر شخص محسوس کر رہا تھا۔

آخری مرتبہ پلٹنے سے پہلے میں نے ان سب کی جانب دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ ایمان کی آنکھوں سے چھپتے دوا آنسو میں یہاں سے بھی کڑے ہو کر اپنے دل کی زمین پر چھپتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ اور پھر میں پلٹا اور مسافروں کی بکس میں گم ہو گیا۔ جہاز نے جلد ہی ٹیک آف کر لیا۔ میں جہاز کی کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھا مجھے پچھلے نوے لندن کو دھند میں تھیلے ہوتے دیکھ رہا تھا۔ جہاز کی کھڑکی پر بارش کی بوندیں ٹپ ٹپ برس کر اس کی دھندلی اسکرین پر دھاتے سے بناتی ہوئی نیچے غلاؤں میں کہاں غائب ہو جاتی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ آج سے چھ مہینے قبل جب میں لندن پہنچا تھا اس دن بھی ایسی ہی بارش ہو رہی تھی اور آج جب میں نے اس شہر کو الو الوداع کہنا تھا تب بھی بارش میری ساتھی تھی۔

”یہ بارشیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ کبھی تو ساری عمر بھی موسلا دھار برسی رہیں۔ تب بھی انسان کا اندر بھگو نہیں پاتیں۔ اور کبھی ہر چلنے دھارے میں کوجل تھل کیے کرتی ہیں۔ لیکن باہر والوں کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔“

